

ہر ناس و مام بالخصوص سکول و کالج،
 دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
 معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرنے اور سمجھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
 اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دو انیمہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دینی تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن



الم ①

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! (فی اللہ عند) اگر تو صبح کو ایک آیت
 کلامِ پاک کی سمجھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سمجھ لے
 تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مترجم و تالیف: قاری محمد اکرام
 ملاحظہ: امدار سید فیض القرآن اور محضراں (سن پیدل)

ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
 دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
 معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سمجھنے کیلئے، بالخصوص افکار و افہام،
 اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن

الہ ①

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابو ذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت
 کلامِ پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے
 تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مترجم و تالیف: قاری محمد اکرام چغتائی

ملاحظہ! مدرسہ فیض القرآن اوڈھووال (ضلع چکوال)

تمام حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن

اللہ ① (جلد اول)

صفحہ: 354

ترتیب و تالیف: قاری محمد اکرام غفرلہ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

0300-5902896

ٹائٹل و کمپوزنگ: ظفر محمود ملک

النور مینجمنٹ چکوال 0334-8706701

ناشر: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تاریخ اشاعت: 11 ذوالحجہ 1447ھ بمطابق 28 مئی 2026

ویب سائٹ: www.umarlibrary.org

فہرست مضامین

عرض مرتب	11	صراطِ مستقیم/ انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟/ سورت فاتحہ
قرآن مجید سے غفلت اور بے اعتنائی باعث تباہی ہے۔	14	سے آغاز قرآن کی وجہ؟
تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم/ حمد اور شکر میں لغوی فرق	17	ہدایت کے کئی مفہوم
مکی اور مدنی سورتوں میں فرق	18	قَصْدُ السَّبِيلِ سے مراد
قرآن کریم حق تعالیٰ کی طرف زندگی گزارنے کا بہترین دستور	18	اللَّعَزَّ وَجَلَّ کے نزدیک پسندیدہ دین
ہے	18	انعام یافتہ گروہ/ گمراہ لوگ کون ہیں؟
تعوذ کا حکم	19	مَعْصُومٍ عَلَيْهِمُ كَامِصْدَاقٍ اور "الضَّالِّينَ" سے مراد
اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام	20	
سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت	20	سورہ فاتحہ کا خلاصہ
ہے	21	سورہ الفاتحہ سے قرآن اور نماز کا آغاز
اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے	22	سورہ اور آیت کا مفہوم و مطلب/ ریب کا لغوی مفہوم
"الرحمن" میں عام رحمت اور "الرحیم" میں خاص رحمت	22	متقین کے لیے ہدایت
	23	تعارف سورۃ الْبَقَرَةِ
عبادت اور استعانت کا مفہوم/ جبریہ اور قدریہ	25	ترتیب نزولی
دونوں فرقوں کا رد	25	ترتیب توفیقی یا ترتیب محضی
مَلِکٍ اور "مَلِکِ" دونوں قراءتیں متواتر رسول اللہ ﷺ سے	25	قرآن مجید کی سب سے طویل آیت
ثابت ہیں	25	لفظ سورہ اور آیت کا تعارف و تشریح
یَوْمَ الدِّينِ کے معنی	26	فضائل سورہ البقرۃ
شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ ایکلی آیت ہی	26	حُرُوفُ مُقَطَّعات اور اس کی اقسام
کافی ہے	27	کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض
إِنَّا لَنَعْبُدُ وَإِنَّا لَنَسْتَعِينُ فاتحہ کا خلاصہ	28	انسانی اضطراب اور غلبان کا علاج
ایک سوال اور اس کا جواب	29	تمام لوگوں کی ہدایت سے مراد
جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا رد	30	شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی
		متقین کے اوصاف/ آخرت کا مفہوم

- اور عقیدہ آخرت کی اہمیت 50
- الغیب سے مراد 50
- اقامت صلوٰۃ کا مطلب 51
- خرج کی مختلف مدات 52
- تقویٰ والوں کی تین صفتیں 53
- نازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لانا ضروری ہے 54
- دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی 55
- آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح 55
- آیت میں فلاح سے مراد 56
- کفر کی تعریف اور ازلی کافروں کو تبلیغ کرنے کا حکم دینے کی وجہ/ مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسانوں کے تین گروہ 58
- ہدایت اور گمراہی کے اعتبار سے تین گروہ 58
- ہمزہ تسویہ کسے کہتے ہیں؟ 59
- دو باتیں ذہن نشین رکھنے والی 60
- دلوں پر مہر کیسے لگتی ہے؟ 61
- دل پر سپاہ نقطے 63
- منافقین کا گروہ اور اس کی قسمیں/ انفاق دینی بیماری ہے 65
- منافقوں کا حال اور منافقین کی قسمیں 65
- ایمان میں منافقت اور عملی منافقت 67
- جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی 68
- 68
- انفاق کی بیماری سے پیشمار مزید نفسیاتی بیماریاں 68
- منافقین کے دو بڑے عیوب 70
- عقیدہ و عمل کے تمام بگاڑ کی جڑ 71
- اصل فساد 71
- صحابہ معیار حق/ صحابہ کرام اور علماء دین کا مذاق اڑانے کا 73
- حکم/ بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے 73
- الناس سے مراد 73
- جدید، قدیم منافقین کی تردید 74
- ایمان پر ثبات قدم رہو 75
- امت کے لیے نمونہ 75
- معیار حق سے مراد 76
- اسلام لانے کے ظاہری فوائد 76
- شیاطین سے مراد 77
- منافقانہ عمل کی سزا 78
- جَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِّثْلُهَا کی تشریح 79
- ہدایت کے بدلے گمراہی/ اعتقادی اور عملی منافق 81
- سراسر گھٹاؤ والی تجارت 81
- ابدی خسارے میں مبتلا لوگ 82
- تاریکی اور روشنی کی مثال 83
- بہرے، گونگے اور اندھے 84
- بارش سے مراد/ اندھیروں اور گرج سے مراد 85
- عملی منافق کی نشانیاں 86
- دوسری قسم کے منافقوں کی مثال 86
- دلائل توحید و ربوبیت تین بڑی اقسام میں/ قرآن کا چیلنج 88
- اور اس کی معجزانہ حیثیت 88
- چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ 88
- توحید اور وجود الہی پر دلائل 90
- زمین و آسمان کی تخلیق کے مقاصد 91
- ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں 92
- قرآن کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت 92
- جہنم کا ایندھن کون سی اشیاء ہوں گی؟ تقویٰ کا لغوی مفہوم 95
- مثال کے درست ہونے کی شرط 95
- جہنم کی آگ کی حرارت/ انسان اور پتھر اس کا ایندھن 95

- 117..... علم غلو توں اور تنہائوں کی عبادت سے افضل ہے
- 119..... عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی
- 120..... حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا ایک نمایاں مظہر
- 121..... سجدہ سے مراد اور اس کے احکام
- 122..... حد اولین گناہ
- 124..... شجر ممنوعہ/ حضرت آدم (علیہ السلام) کی توبہ کا مفہوم
- 124..... اور اس کے ارکان
- 124..... خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی
- 126..... شریعت میں سد ذرائع کا بنیادی مفہوم
- 127..... انبیاء معصوم ہوتے ہیں، یہی علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے
- 128..... میت کی تدفین کے بعد ایک منتخب عمل
- 129..... حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے
- 129..... خوف اور حزن سے مراد
- 130..... اللہ کی نازل کردہ کتابوں کو جھٹلانے کا انجام
- 131..... بنی اسرائیل پر انعامات/ بنی اسرائیل کا کتاب اللہ سے سلوک/ تبلیہ اور کتمان حق
- 131..... بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب
- 132..... مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟
- 133..... بنی اسرائیل کے اعمال بد
- 134..... فَأَرْهَبُونِ کا معنی
- 134..... قرآن پاک کو بحیثیت کلام الہی تسلیم کرلو
- 135..... تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے
- 136..... حق کو باطل کے ساتھ غلط ملکہ کرو
- 137..... آج کل دین کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟
- 96..... تقویٰ کا معنی: ڈرنا، بچنا اور پرہیز کرنا
- 97..... جہنم صرف کافروں کے لیے
- 97..... ایمان اور عمل صالح/ عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں
- 97..... دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے غالی نہیں
- 99..... کفار کا دوسرے طریقے سے معارضہ
- 101..... فسق کے تین درجے
- 101..... صلہ رحمی کی تاکید اور اقرباء سے حسن سلوک/
- 102..... زندگی اور موت کے چار مراحل
- 102..... فاسقوں کی تین صفات کا تذکرہ
- 102..... تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا
- 103.....
- 104..... فساد فی الارض کیا ہے؟
- 104..... انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات
- 106..... زمین کی تمام چیزیں انسانیت کے فائدے کیلئے
- 107..... زمین سے آسمان تک کی مسافت
- 109..... تخلیق آدم پر فرشتوں کا اعتراض/ تسبیح و تقدیس کا فرق
- 109..... حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت انبی
- 110..... قرآن پاک میں غلیفہ کے دو معانی
- 111..... غلیفہ اور اہل سنت والجماعت کا نظریہ
- 112..... اطاعت شعرا مخلوق کے ہوتے ہوئے انسانی تخلیق کیوں؟
- 112.....
- 113..... استخارہ واستشارہ کا حکم
- 115..... تسبیح و تقدیس کے معانی
- 116..... اسے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے
- 117..... خلافت کے لئے ضروری شرط/ علم کے فضائل
- 117..... سجدہ تطہیمی

- 169..... استحقاق حقیقت باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت اور فضائل / پریشانیوں
- 170..... معجزہ اور کرامت اور مصائب کا علاج 138.....
- 171..... ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان .. 138.....
- 173..... فساد فی الارض کیا ہے؟ مال سے محبت کی چار صورتیں 140.....
- طعام کی تبدیلی / ذلت اور مسکنت کا مفہوم / آیات الہی کا انکار 141..... حب مال جملہ امراض کی جڑ اور بنیاد ہے
- 174..... وعظ و نصیحت کرنے والوں کو تنبیہ 142.....
- 175..... غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر 143..... 'نماز' تعلق مع اللہ کا عنوان
- 175..... بنی اسرائیل کی ناشکری آخرت میں مؤمنین کیلئے دیدار الہی کی نعمت 144.....
- 176..... اعلیٰ چیز کے بدلے ادنیٰ اور کمتر چیز لینا چاہتے ہو؟ سفارش پر تلک یہ کرنا ہی بے وقوفی ہے /
- 177..... مسکنت و دناوت کا اصل معنی و مفہوم 146..... فرعون کی بنی اسرائیل کو تعذیب کی وجہ
- 178..... ایک اعتراض اور اس کا جواب 146..... اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم
- 179..... داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل و اہانت 148..... اسلامی تاریخ کی حفاظت
- مَنَہِیَّات سے باز رہا جائے اور مَأْمُورَات کو بجالایا 149..... اُمت محمدیہ خیر اُمت
- 179..... جائے شفاعت کن لوگوں کے حق میں مقبول ہوگی 150.....
- 181..... بنی اسرائیل کا عہد / دین میں جبر نہیں کا مطلب 153..... گو سالہ پرستوں کا قتل عام / مرتد کی سزا قتل کیوں ہے؟
- 181..... یہود، نصاریٰ اور صائبین 154..... فرعونوں کی غرقابی کا دن
- 183..... شریعت کے احکام میں اولین حکم 155..... طور سینین اور وادی مقدس
- 184..... ایک ہیبت ناک منظر 158..... شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا
- 185..... ایک شہ اور اس کا الزام منتخب سزا آدمیوں کی موت اور دوبارہ زندگی /
- 186..... پختہ عہد و پیمان کے باوجود روگردانی 160..... بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار
- اصحاب سبت کا انجام / جمعی کی فضیلت / تبدیلی اشکال کی توجیہ 161..... بقائمی جوش و حواس کلام الہی سننے کی فرمائش
- 188..... 162..... موت کی بعد کی زندگی اس پر اشکال
- 188..... ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کرنے والے 163..... من و ملوی کی حقیقت
- 189..... نابجا تزحیل سازی پر سخت سزا 165..... تحریف کلام الہی کی سزا
- 190..... یہود و نصاریٰ کے مقدس دن 166..... احکام الہی سے تسخر اور مذاق
- 190..... جمعہ اہل اسلام کیلئے سب سے عظیم دن بارہ چشموں کا پھوٹنا / استحقاق کی حقیقت /
- 191..... اہل علم کیلئے دعوت و تبلیغ ضروری ہے 167..... فساد فی الارض حقیقتاً ہے کیا چیز؟

- 124..... بے بنیاد اور غلط قسم کی آرزوئیں
غلط فہموں کی کمائی / باطل عقائد کی بنیاد
- 126..... مسلمانوں کے باطل عقائد
- 126..... تورات کے احکام رد و بدل کرنے والے
- 128..... یہود کا من گھڑت عقیدہ اور اس کے تین جواب
- 120..... شفاعت کا مسئلہ اور قرآن پاک کی وضاحت
- 120..... گناہ کا احاطہ کا مفہوم و مطلب
- 121..... مومنین کے ایمان کا عمل صالح پر بشارت
- دین میں عبادات کا مقام / عبادت کا ناقص تصور
- 123..... خون ناحق اور جلاوطنی
- 123..... اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے
- 124..... عبادت کی چار قسمیں
- 125..... عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل
- 125..... عبادت ایک جامع لفظ
- 126..... اسلام کی بنیادی پانچ چیزیں
- 127..... چند اعمال اور مر اسم عبودیت کا ہمارا تصور
- 127..... خون ناحق اور جلاوطنی
- 128..... ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت
- 130..... دور نبوی میں یہود کا انجام / مسلمانوں کی حالت زار
مدینہ میں یہود کے مشہور قبائل اور ان کے مذموم افعال
- 130.....
- 132..... یہود سے چار عہدان کا اس کے برعکس طرز عمل
- 133..... دنیا میں یہودی کا عبرتناک انجام
- یہودیوں کے جدوی ایمان کا نقشہ اور مسلمانوں کی موجودہ
- 134..... حالت
- بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی روانی سے بچنے کی دعا
- 135.....
- 192..... نیچری حضرات کی توجہ
- 192..... انسان اور جانور میں فرق
- 193..... اخلاق اور قانون میں فرق
- 194..... عذاب کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کیلئے
- گائے کو ذبح کرنے کے حکم پر بنی اسرائیل کی کٹ
- 195..... حجتیاں / گائے کی نشانیاں
- 197..... تعمیق کا معنی و مفہوم
- 198..... مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہئے
- اس واقعہ سے حاصل ہونے والا سبق
- 200..... اس واقعہ سے ملنے والی معلومات
- لاش کا زندہ ہو کر قاتل کا پتہ بتانا /
- 202..... دل سخت ہوتا کیوں ہے اور اس کا علاج
- 202..... اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے
- 203..... قاتل کی تین جرائم
- 204..... انسان کا دوبارہ زندہ قرآن کی مثالیں
- 205..... قاتل وراثت سے محروم، اور اس پر اہل علم کا اجماع
- 205..... وہ دل، جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت
- 206..... دلوں کی سختی افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کن
- 207..... قنوت قلبی کے اسباب، اور علاج نبوی ﷺ
- نبی آخر الزمان ﷺ سے متعلق آیات کو چھپانا اور ان میں
- 209..... تحریف / حق کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے
- 209..... تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف
- 210..... باطل پرست علماء کی تحریف
- 211..... یہودیوں کے دس بڑے عالم
- منافق یہودی جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ملتے
- 212.....
- 213..... ضرورت کے وقت علم حق کو چھپانا

- 258..... قرآنی پس منظر / بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاء/
- 258..... یہود کا قول کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں 237.....
- 259..... زندگی کی اصل قدر 237..... انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ قرآن کریم میں
- یہود کی جبریل دشمنی کی وجہ مقررین کا عنادی لعنتی ہے 238.....
- 260..... کتاب اللہ سے روگردانی 239..... حضرت علیؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات
- 260..... نزول وحی کی مختلف صورتیں 240..... احکام الہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینے والے
- 261..... ضد، حمد اور فرقہ سازی کا جنون 241..... انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کرنے والا گروہ
- 262..... فرشتہ رحمت اور فرشتہ عذاب 242..... دین سے دوری کا بہانہ قرآنی جواب اور حقیقت
- 263..... فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضب الہی کا سبب 245..... یہود اور نزول قرآن / نظریہ توسل کی حقیقت
- 263..... محبت اور تعظیم کا صحیح مطلب 245..... مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے
- 264..... معجزات اور واضح نشانیاں 246..... نظریہ توسل کی حقیقت
- 264..... فق کا اصلی مفہوم 246..... یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ
- 265..... یہودیوں کا تورات پر ایمان ہی نہیں 247.....
- 266..... کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینے والا گروہ 248..... حد کی تعریف اور اس کی مذمت
- جادو کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی ڈالنا / جادو کی حقیقت 249..... ایمان لانے میں بڑی رکاوٹ نسل و غاندانی تعصب
- 267..... قرآن و سنت کی روشنی میں اور اس کا علاج 250..... گستاخوں کو اچھا سمجھنے والا خود بھی گستاخ ہی ہے
- 267..... یہودیوں میں جادو ٹونا کرنے کی بیماری 251..... حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات
- 268..... شہر بابل کا جغرافیائی محل وقوع 251..... ایمانی قوت معلوم کرنے کا طریقہ / موت کی آرزو
- 269..... حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق 252..... یہود کی عینے کی ہوس
- 270..... میاں بیوی کے درمیان تفریق کرنا گناہ کبیرہ ہے 252..... کفر و انکار کی انتہا
- 270..... جادو ایک حقیقت ہے 253..... گزشتہ سالہ ہستی کے براہِ تئیم
- 272..... سرائیں دینا صرف اسلامی حکومت کا کام ہے 254..... قرآن مجید پر ایمان لانے کا مطلب
- 274..... از روئے شریعت جادو کرنا یا کرنا کفر ہے 254..... برائی کی لذت و طلاوت / ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی
- 275..... دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل 255.....
- مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت / تنبیہ آیات کی وجوہات 255..... موت کی محبت اور اللہ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ
- 276..... 255.....
- 276..... رَاْعِنَا کے بجائے "اَنْظُرْنَا" کہنے کا حکم 257..... دعوتِ مباہلہ / اور اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب

- یہودیوں کی ایک اور کینگی 277.....
- کلمہ کفر کہنے والوں کیلئے دردناک عذاب 278.....
- رحمت سے مراد نبوت 278.....
- ذَنَسَخ کا معنی وغُوم اور ذَنَسَخ کے منکر لوگ 279.....
- نَسَخ کے چند احکام 281.....
- مختلف شرائع میں بعض اختلافات 282.....
- کثرت سوالات کی ممانعت/حد بدترین بیماری ہے 283.....
- شرعی قانون میں بھی تبدیلی 283.....
- یہود کا اسلام سے منتفر کرنے کا اور طریقہ 284.....
- بے مقصد اور فضول سوالات سے بچو 285.....
- کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے سوال کرنے کی ممانعت نہیں... 286.....
- یہودیوں کا مسلمانوں کے کفر و ارتداد کی تمنا کرنا 287.....
- کفار کے نزدیک انسان فحاشی و بیجائی کے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتا 288.....
- نماز ادا کرنے کے آداب و احکام/یعنی کا بدلہ یعنی/ 289.....
- رجا اور اُھْنِیَّہ کی تحقیق و تفسیر 290.....
- نماز اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے... 290.....
- نماز کی لفظی و معنوی حقیقت 291.....
- زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن 292.....
- جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت و حماقت ہے 293.....
- آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اصول 295.....
- یہود و نصاریٰ آمنے سامنے/بڑا ظالم کون ہے؟/مسجد کے آداب 297.....
- تین گمراہ گن فرقتے 297.....
- اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کو ویران کرنے والے 299.....
- اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔ 301.....
- اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی 301.....
- سمت کا تعین، مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی 302.....
- اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے/سُجْدہ کی تحقیق و تفسیر 304.....
- اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث 304.....
- اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے 305.....
- زمین و آسمان کی ہر مخلوق خدا کی ملکوک 306.....
- تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں 306.....
- بے پناہ قدرت، لامحدود اختیار اور مطلق حاکمیت 307.....
- جاہل لوگوں کے مطالبات 308.....
- زمانہ قدیم کے گمراہ اور موجودہ دور کے گمراہوں میں فرق 309.....
- حسی معجزات معنی و مطلب 310.....
- علمی دلائل معنی و مطلب 310.....
- ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے/تلاوت قرآن کے 312.....
- ظاہری اور باطنی آداب 312.....
- کفار کی ایذا رسانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی لسی 312.....
- لفظ "ملت" کی وضاحت 313.....
- اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی کرنا ہے 314.....
- اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ 315.....
- کتاب اللہ کے حقوق 317.....
- تلاوت قرآن کے ظاہری آداب 318.....
- تلاوت قرآن کے باطنی آداب 318.....
- امتحان کی غرض و غایت/حضرت ابراہیم (علیہ السلام) 319.....
- امام الناس ہیں/مساجد کی ظاہری و باطنی صفائی 319.....

- جو حضور اکرم ﷺ کا ہو گیا، عزت پائی اور جو ان سے پھر گیا
ذلیل ہو گیا..... 319
- شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے..... 320
- ابتلاء آزمائش کا لغوی معنی اور قرآنی و شرعی مفہوم..... 321
- حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی قربانی ہی
قربانی تھی..... 322
- اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنتِ انبیاء ہے..... 323
- شیشہ کی گندہ نما عمارت..... 324
- ظاہری و باطنی صفاتی سنتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام.. 324
- تعمیر کعبہ کے مختلف ادوار / پُر امن شہر مکہ مکرمہ کی
فضیلت / مناسک حج کی تعلیم..... 326
- نبی کریم ﷺ کی قبولیت کی دعا کرنا سنتِ خلیل..... 326
- مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پُر امن شہر
..... 327
- مکہ مکرمہ کی فضیلت..... 328
- خانہ کعبہ کی تعمیر مختلف ادوار میں دس (10) بار ہوئی... 329
- لفظ مناسک کا لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم..... 330
- کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے
..... 331
- اسلام دینِ امن و سلامتی ہے / اولاد کو صحیح عقائد
اور نیک اعمال کی وصیت کرنی چاہئے..... 333
- یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید..... 333
- اسلام کے دینِ امن و سلامتی ہونے کی بڑی دلیل..... 334
- آلِ دین سے مراد یہاں اسلام ہے..... 335
- وَقَبِيلَتِی کا معنی و مفہوم مختلف مذاہب میں اس کا تصور
..... 337
- اَھَرُ کُنْتُمْ شُهَدَآءَ آیت کا شانِ نزول اور تفسیر..... 338
- لفظ حنیف کی تحقیق و تفسیر / راہِ ہدایت / صحابہ کرام معیار حق 340
- آخرت میں کام آنے والے صرف اپنے ہی اعمال ہوں گے
..... 340
- یہودیوں، عیسائیوں اور تمام مذاہب کا رد..... 341
- لفظ حنیف، معنی و مفہوم اور مختصر تشریح..... 342
- آلِ مَسْبُوط کا معنی مفہوم اور مختصر تشریح..... 343
- انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے متعلق چند باتیں یاد رکھیں
..... 345
- صحابہ کا ایمان بارگاہِ الہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال
..... 345
- جھوٹی نسبت مفید نہیں / استہمان شہادتِ ظلم ہے /
اہل اسلام کیلئے لمحہ فکریہ..... 347
- توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ... 347
- عیسائیوں کی مذہبی رسم ”پینٹسمنٹ“..... 348
- اللہ تعالیٰ کی رحمت لا محدود..... 349
- آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پیچیدگی کا اظہار
ہے..... 350
- یہودیت و عیسائیت کا معرض وجود..... 351
- توراة میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے متعلق واضح پیشین
گوئیاں..... 352
- اپنے اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی..... 352
- اہل اسلام کو تنبیہ..... 353

عرض مرتب

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَحْدَهُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ!

کچھ عرصہ قبل حافظ محمد نعیم عارف کی طرف سے اصرار تھا کہ تم پانچ دس منٹ کی مجھے ویڈیو بس کر دو تاکہ میں یوٹیوب پر اپ لوڈ کر دیا کروں، اور میں بار بار انکار کرتا رہا (اُس کے لئے انہوں نے باقاعدہ موبائل سٹینڈ، مائیک اور گرین کپڑا دیا جس سے اب تک ویڈیو بن رہی ہیں اور اپ لوڈ ہو رہی ہیں) کیونکہ میں اپنی عدم علمیت سے خوب واقف ہوں، اور میں اپنی جہالتوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہوں دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے کوسوں دور بھاگتا ہوں حالانکہ حافظ صاحب نے بڑا سمجھایا اور ان کا اصرار بڑھتا رہا اور فرمایا کہ جہاں آپ نے کچھ کہنا ہے وہاں بندہ ہو گا نہ بندے کی ذات صرف موبائل کا کیمرا ہو گا اور تم ہو گے، پھر دل کو کچھ ڈھارس ہوئی اور ہمت ہوئی پھر میرے دل میں یہ داعیہ شدت سے پیدا ہوا پھر کچھ دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اپنے اکابر کی تفاسیر سے استفادہ کر کے اللہ کا نام لے کر شروع کر دو، مگر جب اپنی علمی بساط پر نظر ڈالتا تو مجھے یہ خیال بھی مضحکہ خیز لگتا تھا کہاں تفسیر قرآن اور کہاں یہ سراپا جہل و عصیاں تھا، میں اس سچائی کا محض روایتی اور عاجز انہ نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ اعتراف کرتا ہوں کہ خدمت قرآن کی اب تک کی تاریخ میں مجھ سے کم علم آدمی کوئی نہیں گزرا ہو گا، بہر حال میں نے علمائے امت کی تفاسیر سے استفادے کے سوا کچھ نہیں کیا میرے اس جمع و ترتیب میں کوئی حسن و خوبی کا پہلو دکھائی دے تو وہ اللہ کے فضل و کرم کا نتیجہ جس نے مجھے یہ توفیق عنایت فرمائی اور متقدمین کی پُر غلو ششوں کا

شرہ ہے، کوتاہی اور کمزوری کو میری علم کی اور کوتاہی تصور کرتے ہوئے آگاہ کیا جائے تاکہ اس کی تصحیح کی جائے، چنانچہ کافی غور و خوض کے بعد بندہ نے حافظ صاحب اور دیگر دوست احباب کے کہنے پر یہ کام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تاکہ قیامت کے دن میرے جیسا گناہوں میں ڈوبا ہوا شخص بھی اللہ کے حضور کوئی نیک عمل پیش کر سکے۔ اور میرا اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے مضامین کو سادہ اور عام فہم انداز میں ناظرین، سامعین، قارئین تک پہنچا دیا جائے، میں نے کوشش کی کہ سادہ اور عام فہم لفظوں میں قرآن کریم کے مضمون کو اس طرح بیان کیا کہ لفظی ترجمہ اور عام فہم الفاظ میں اس کے مرکزی مفہوم کی مختصر تشریح بیان کی ہے۔ پھر قرآن کریم سے ملنے والی ہدایات اور عملی زندگی میں قرآن کریم کے پیغام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، یہ سلسلہ ایک دو تین آیات روزانہ کی بنیاد پر بیان کرتے کرتے آج یہ تحریر کرتے وقت ہمارا سبق سورہ یوسف تک پہنچ گیا ہے۔

بہر حال اب تک یہی دھڑکا اور ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ سلسلہ شروع کر کے غلطی تو نہیں کر دی اور وہ ثواب کے بجائے عذاب کا مستحق نہ بن جاؤں اس لیے بندہ کی کوشش ہے کہ کوئی بھی تحقیق طلب بات معتبر تفاسیر دیکھے بغیر نہ بیان کروں، دوسرے مرحلے پر تمام قارئین و ناظرین سے دست بستہ مؤدبانہ درخواست ہے کہ اگر کوئی بات اسلاف کے مسلک کے خلاف نظر آئے تو وہ اس کی نشاندہی کر کے ممنون فرمائیں! اے اللہ! مجھ پر حق کی حقانیت واضح کر اور مجھے اس کی اتباع عطا فرما۔“ اے اللہ! مجھ پر باطل کا بطلان واضح کر اور مجھے اس سے اجتناب عطا فرما۔ اے اللہ تو مجھے اس تفسیر قرآن کریم کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما دے، اے اللہ! میں اپنی گندی زبان اور گم صم زبان اور قلم سے تیرا شکر کیسے ادا کروں کہ تو نے ایک جاہل اور گناہ گار کو اپنی کتاب مقدس کی خدمت کی توفیق دے دی جس کے پاس نہ علم ہے نہ عمل، نہ ظاہری اوصاف ہیں نہ باطنی کمالات! اے علیم وغیرہ! میں اپنی جہالتوں، غلطیوں اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہوں دوسری جانب تیسری فیاضیوں، پردہ پوشیوں اور مادی اور معنوی نعمتوں سے بھی بے خبر نہیں۔ اے رؤف و رحیم! کوشش اور خواہش کے باوجود میں ان نزاکتوں، آداب، احتیاطوں اور تدبیروں کو ملحوظ نہ پس رکھ سکا جن کا لحاظ رکھنا اس عظیم کتاب کی خدمت کے لیے ضروری تھا۔ میری اس کوتاہی کو معاف فرما دے۔ اے رحمن و رحیم!

تو سچے دل سے توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے مگر یہ تو ایک نیکی ہے تیری کتاب کی خدمت سے بڑھ کر نیکی کیا ہو سکتی ہے تو اسے واقعی اور حقیقی نیکی بنا دے۔ اے حلیم و کریم! تجھے تیری مبارک کتاب کا واسطہ! مجھے ظاہری اور باطنی غلامتوں سے پاک فرما دے، میرے گناہوں کو معاف فرما دے، میرے عیوب پر پردہ ڈال دے، میری اس ناقص سی خدمت کو قبول فرما لے، اے میرے لیے، میرے والدین اور اہل و عیال کے لیے اور میرے تمام اساتذہ کے لیے ذخیرہ آخرت بنا دے۔ اور کتاب مقدس کی خدمت، میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنا دے۔

اللہ تعالیٰ ہماری یعنی حافظہ محمد نعیم عارف جنہوں نے ہمارے چینیل عمر گیلری کے سب سلسلے ویڈیو ایڈٹ سے لیکر ویڈیو اپ لوڈنگ تک کا سب کام سنبھالا ہوا ہے اور پارہ 9 کے نصف سے بھائی ظفر محمود ملک تفسیر کی ویڈیو ایڈیٹنگ میں شامل ہوئے، اور لفظی ترجمہ کی کمپوزنگ، ٹائٹل وغیرہ ان کی محنت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس محنت کو قبول فرمائیں، بعافیت اس کی تکمیل فرمائیں یہ ذخیرہ آخرت ثابت ہو، اور امت کو اس سے فائدہ پہنچے۔ آخر میں ایک دفعہ پھر انتہائی عجز و انکساری اور اپنی تمام تر لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے رب کریم کی بارگاہ عفو و کرم میں ہم دست بدعا ہیں کہ خدمت قرآن کے زمرہ میں ہماری یہ حقیر سی کوشش قبول فرمائے جو بلاشبہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انجام پذیر ہو سکی نیز! اللہ رب العزت ان تمام و معاونین کرام کو جزائے احسن فی الدارين عطا فرمائے جنہوں نے کسی بھی طرح ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہمیں نیک تمنائوں اور دعوات صالحہ سے نوازا۔ ہم قارئین ناظرین کرام سے یہ بھی التماس کرتے ہیں کہ ”قسم ان کریم کی اس تفسیر ذَخِيرَةُ الْبُؤْهَانِ فِي فَهْمِ الْقُرْآنِ کی اس کوشش و کاوش کو عقیدت و محبت سے دیکھ کر اور چوم کر بند کر کے نہ رکھ دینا، بلکہ اس کے ایک ایک صفحہ کا بغور مطالعہ فرمائیں، اپنے اعزہ و احباب کو تحفہً پیش کریں، ہو سکتا ہے کوئی اور بھی آپ کی وساطت سے عمل و کردار کی تڑپ، ابلاغ حق اور اشاعت حق کے جذبول سے سرشار ہو جائے۔ اللہ رب العزت ہمیں عمل کی توفیق دے۔ آمین یا رب العلمین۔

قاری محمد اکرام غفرلہ

11 ذوالحجہ 1447ھ بمطابق 28 مئی 2026

قرآن مجید سے غفلت اور بے اعتنائی باعث تباہی ہے

تَحْمَدُهُ وَنُصَلِّيْ وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَعَلَى اٰلِهِ
وَآزْوَاْجِهِ وَاصْحَابِهِ وَاتَّبَاعِهِ اَجْمَعِيْنَ۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے، جس نے اپنے کلام آخری کتاب کو حضور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کر کے قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے ہدایت کا پورا سامان مہیا کر دیا۔ تمام درود و سلام محبوب خدا، رسول امین شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جنہوں نے بیت اللہ، خانہ کعبہ کو بتوں کی آلودگی سے پاک کر کے دین توحید کا پھر پراہر دیا، جن کی احادیث میں وحی کی خوشبو ہے، جن کے اعمال کو اللہ نے اسوہ حسنہ قرار دیا جن کے اصحاب دین حق کی شمعیں لے کر نکلے تو ظلمت کدہ دہر توحید و سنت کے نور سے جگمگا اٹھا۔

قرآن کریم رب کائنات کا کلام اور ہمیشہ باقی رہنے والی کتاب لازوال و بے مثال ہے، یہ آخری ہدایت ہے جو دلوں میں خوف خدا اور آخرت پر یقین و ایمان رکھنے والوں کی رہبری کے لئے لوح محفوظ سے حضور رسالت مآب جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے قلب اطہر پر اتاری گئی، اس کی ہر آیت لاریب اور اس کی صداقت و سچائی ہر طرح کے شکوک و شبہات سے مبرا اور بلند و بالا ہے۔ چودہ سو برس پہلے جب دین ابراہیمی کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، انسانی شرف و محبتوں اور دیوتاؤں کے قدموں میں نچھاور کیا جا رہا تھا، انسانی عقل و دانش حب و نسب کے غرور اور سیارگان سماؤں کی چمک دمک میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی، (سیارگان سماؤں (فارسی اور عربی کا مرکب) کے لغوی معنی

”آسمان کے گھومنے والے تارے یا سیارے“ ہیں۔) انسان تھے مگر انسانیت ذلت و رسوائی کی دلدل میں غرقاب ہو رہی تھی، جانوروں اور درندوں کو کمزور و وضعیف غلاموں کی نسبت زیادہ عزت و آزادی حاصل تھی مظلوم اور ستم رسیدہ انسانوں کے بچے بھیڑوں، بکریوں، بلیوں اور کتوں کی راحت و عیش اور آزادی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، طاقتور لوگ کمزوروں پر خدا بن بیٹھے تھے ان کی پوجا اور پرستش کی جاتی تھی۔

نبی کریم ﷺ کے جیتے جاگتے معجزات میں سے قرآن کریم وہ زندہ و جاوید معجزہ ہے جو امت مسلمہ کی اصلاح اور دینی و دنیاوی ترقی کے لئے سب سے محکم پیغام خداوندی ہے جو ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کیلئے مصلح ہے اور اور زندگی کے تمام امور میں بھی مینارہ نور ہے اور قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے کتاب ہدایت ہے، اور اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اسے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو امام کائنات نے اپنی زبان صادقہ سے معاشرے کے بہترین لوگ قرار دیا ہے اور اس کی تلاوت کرنے پر اللہ تعالیٰ ایک ایک حرف پر ثواب عنایت کرتے ہیں۔ دورِ صحابہ سے لے کر دورِ حاضر تک بے شمار اہل علم نے اس کی تفہیم و تشریح اور ترجمہ و تفسیر کرنے کی خدمات سرانجام دی ہیں۔ امت مسلمہ کی ذلت و رسوائی کا ایک بڑا سبب حدیث پاک، قرآن حکیم سے منہ موڑنا ہے۔ اگر کچھ لوگ قرآن پڑھتے بھی ہیں تو اس کے معانی و مفہیم سے بے خبر ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر مسلمان خدا کی آخری کتاب کو سمجھنے کو سش کرے۔

قطب الاقطاب حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ نے فرمایا:

قرآن شریف پر عمل کرنے سے برکت ہوتی ہے، جس قوم پر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے فضل فرمانا چاہتے ہیں اس کے پاس اپنے کسی بندے کو بھیج دیتے ہیں اور اس کو کتاب عطا فرما دیتے ہیں تاکہ اس پر عمل کریں، اس میں محض نصیحت ہوتی ہے اور دین و دنیا کی کامیابی اور قرب خداوندی حاصل کرنے کے اصول بتائے گئے ہوتے ہیں۔ اس کا ادب یہی ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس امت کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا اور آپ

میں اللہ کے پر کتاب نازل فرمائی۔ جس قوم کی خوش بختی اور خوش نصیبی ہوتی ہے وہ اس پر عمل کرتی ہے اور فائز المرام ہوتی ہے اور جس قوم کی بد نصیبی ہوتی ہے وہ محض اس کو تبرک سمجھتی ہے۔ لوگ اسے چومتے چاٹتے ہیں۔ غلاف چڑھاتے ہیں اور محض برکت کے لئے گھر میں رکھتے ہیں۔ لیکن عمل اس کے خلاف کرتے ہیں، تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک یادگار تحریر فرماتے ہیں:

قرآن مجید ہر سچے مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا بہترین راہنما ہے۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن مجید ہماری اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں میں بہترین راہنما ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی ہدایات میں سچائی اور انصاف کو انتہائی حد تک محفوظ رکھا گیا ہے اس میں ارشاد ہے:

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا۔

اس اعلان کی بنا پر ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مکمل اور بہترین پروگرام فقط مسلمان کے پاس ہے۔ میرے اس دعویٰ کی تصدیق قائد اعظم کے خط کے وہ فقرے ہیں جو انہوں نے اگست ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری، تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر کے امور حیات تک روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک دنیوی زندگی جزا و سزا سے لے کر عقبی کی جزا و سزا تک ہر فعل و قول روزانہ اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔“

۱۹۵۴ء میں قائد اعظم نے عید کا پیغام دیتے ہوئے کہا:

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات و اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانون حیات ہے یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی تمدنی عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔“

تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم/ حمد اور شکر میں لغوی فرق

نُحَمِّدُهُ وَنُصَلِّيُّ وَنُسَلِّمُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ وَعَلَى آلِهِ
وَأَزْوَاجِهِ وَأَصْحَابِهِ وَأَتْبَاعِهِ أَجْمَعِينَ۔

سورہ فاتحہ کا تعارف

یہ سورت جمہور علماء کے مطابق مکی (یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی) ہے اور یہ سب سے پہلی سورت ہے جو ایک ہی وقت میں مکمل نازل ہوئی۔ البتہ بعض اہل علم کے مطابق سورہ فاتحہ کا نزول دو مرتبہ ہوا۔ پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جبکہ دوسری مرتبہ ہجرت مدینہ کے بعد جب بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا گیا، اس وقت یہ سورت دوبارہ نازل کی گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم! سورہ فاتحہ کے کلمات کی تعداد ستائیس، حروف کی تعداد ایک سو چالیس اور آیات کی تعداد بہ اتفاق علمائے کرام سات ہے، البتہ آیات کی تعیین میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم کے نزدیک تسمیہ جزو فاتحہ نہیں، اس لیے سات آیات یوں ہوں گی، کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ مستقل آیت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل علم، تسمیہ کو مستقل آیت قرار دے کر جزو فاتحہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان حضرات کے نزدیک اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ الگ آیت نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مطابق تسمیہ کو مستقل آیت قرار دیا گیا ہے۔

ترتیب نزولی میں سورت فاتحہ پانچویں جبکہ موجودہ قرآنی ترتیب میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس

میں ایک رکوع اور سات (۷) آیات ہیں۔

مکی اور مدنی سورتوں میں فرق

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، رائج قول کے مطابق ان میں فرق یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں (خواہ وہ کہیں بھی نازل ہوئی ہوں) وہ سورتیں ”مکی“ کہلاتی ہیں اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں (خواہ وہ بدر، احد، احزاب، حدیبیہ، یا فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ ہی میں کیوں نہ نازل ہوئی ہوں) وہ سب سورتیں مدنی کہلاتی ہیں۔ (منابہل العرفان، ج: ۱، ص: ۱۹۴)

قرآن کریم حق تعالیٰ کی طرف زندگی گزارنے کا بہترین دستور ہے

قرآن کریم حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی جانب آخری پیغام اور زندگی گزارنے کا بہترین دستور ہے، دنیا و آخرت کی جملہ فوز و فلاح اسی سے وابستہ ہیں۔ قرآن کریم ہی آئین و قانون، دستور و منشور، علم و عمل، موعظت و ہدایت، شفا اور سکون ہے۔ عقیدہ و فکر سے لے کر عمل و آداب اور حسن معاشرت تک سبھی کچھ قرآن کریم میں ہے۔ اس سے عبادات، معاملات، اخلاق و آداب، انفرادی، گھریلو اور اجتماعی زندگی وابستہ ہے۔ نظام مملکت، نظام عدل، نظام معیشت، و مستقبل، دنیا و نظام معاشرت، نظام اُسْرَہ (یعنی خاندانی نظام)، قوموں کا عروج و زوال تاریخی عالم انسانیت کا ماضی، حال اور مستقبل برزخ، آخرت، حیوانات، نباتات، جمادات، نوری، خاکی، ناری، جنت، جہنم، خوف خدا، تقویٰ، پرہیزگاری، انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات، صالحین و ابرار سلیمین و فجار، اسباب ترقی اور اسباب تنزلی وغیرہ کے تذکرے بھی اسی میں موجود ہیں۔ قرآن کریم وحی الہی بھی ہے اور کلام الہی بھی۔ یہ حق تعالیٰ کی شان جلال اور شان جمال کا مظہر ہے۔

بصورت قرآن، اللہ تعالیٰ بندوں سے ہم کلام بھی ہے اور تنبیہی کمال بھی۔ قرآن ذکر و فکر، لذت آشنائی، معرفت الہی، حقوق العباد، باعث رحم انسانیت اور اطمینان قلب ہے۔ تھی تو حق تعالیٰ نے جا بجا اس کتاب کو پڑھنے، سمجھنے، وابستہ ہونے عمل کرنے اور اس کتاب کو اپنانے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ

عزتوں اور علم و عمل کے نور کو وابستہ کیا، جبکہ اس سے انحراف کی صورت میں ذلتیں اور جہالت کے اندھیرے مقدر فرمائے۔ اسی سے علم کے موتی اور عمل کے سانچے نمودار ہوتے ہیں۔ اسی سے مفلوک الحال طبقات کی ڈھارس اور خوش حال لوگوں کی خوش حالی جوئی ہوئی ہے۔ اسی لیے اس کا حق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے، سمجھا جائے، اس کی گہرائیوں میں اترا جائے عمل کیا جائے، اپنایا جائے، اس وفادار کلام سے دوستی کر کے قبر حشر میں اس کی رفاقت حاصل کی جائے۔ اہل اسلام کو اپنی عظمت رفتہ کے حصول کے لیے پھر سے انفرادی و اجتماعی طور پر قرآن کریم کو اپنا ہونا ہوگا، اپنے انفرادی وجود سے لے کر اپنی ریاست تک کو قرآن کریم کی برکات سے آراستہ کرنا ہوگا۔ قرآن کریم سے صحیح معنوں میں استفادہ تہی ممکن ہے، جب اسے خوب سمجھا جائے، اس میں تدبیر کیا جائے، اس کے علوم و معارف تک رسائی حاصل کی جائے۔

تعوذ کا حکم

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○ مُلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ○

أَعُوذُ	میں پناہ مانگتا ہوں	بِاللَّهِ	اللہ کی
مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○		شیطان مردود سے	

نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے (أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ) پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سورہ فاتحہ قرآن کا حصہ ہے جس کے متعلق قطعی حکم سورہ نحل میں ہے فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ یہ قرآنی آیت (سورہ النحل، آیت 98) تلاوت قرآن سے قبل شیطان مردود کے وسوسوں سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ (تعوذ) مانگنے کا حکم دیتی ہے۔ اس کا مقصد قرآن پاک کے علمی و روحانی فیض کو شیطان کی مداخلت سے پاک رکھنا اور تلاوت کے دوران توجہ و خضوع برقرار رکھنا ہے۔ اور اس کے ساتھ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ پڑھنا سنت ہے چنانچہ امام اعوذ باللہ اور بسم اللہ دونوں آہستہ پڑھے گا۔ بہر حال قرآن کریم کی تلاوت کے

وقت، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، سے پہلے (أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِیْمِ) پڑھنا بھی ضروری ہے جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو اللہ کی جناب میں شیطان رجیم سے پناہ مانگو۔ قرآن مجید کی تلاوت، شروع کرنے قبل، تعوذ پڑھنا، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ دوران تلاوت، ذہن شیطانی خیالات اور وساوس سے محفوظ رہے، تاکہ شیطان قرآن مجید میں تدبیر کرنے اور اس پر عمل کرنے سے نہ روکے۔

اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام

بِسْمِ اللّٰهِ	اللہ کے نام سے (شروع)	الرَّحْمٰنِ	(جو) نہایت مہربان
الرَّحِیْمِ ○	بہت رحم کرنے والا		

بِسْمِ یعنی "شروع کرتا ہوں" اللہ یعنی "اللہ کے نام سے" الرَّحْمٰنِ یعنی "بہت زیادہ رحم کرنے والا"، اور الرَّحِیْمِ، یعنی "بار بار رحم کرنے والا"۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام آئے ہیں: "اللہ" وہ ذات جس کی عبادت کی جاتی ہے، جو سب کا خالق و مالک ہے۔ "الرحمن" اس کی رحمت تمام مخلوقات پر عام ہے، چاہے وہ مومن ہوں یا کافر۔ "الرحیم" اس کی خاص رحمت اہل ایمان کے لیے ہے، یعنی وہ بار بار رحم کرنے والا ہے۔ حضرت انس کی روایت میں آتا ہے (2 مسلم ص 172 ج 1) کہ میں نے اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی مگر کسی نے بھی بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھی اونچی آواز سے قرأت الحمد اللہ سے شروع کرتے تھے تاہم بسم اللہ کا پڑھنا ضروری (یعنی سنت ہے) اس کے بعد جب سورہ فاتحہ پڑھ کر دوسری سورہ ملانے لگے تو دونوں سورتوں کے درمیان بھی بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور پڑھنے والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ البتہ اگر دوسورتوں کے درمیان بسم اللہ نہ بھی پڑھی جائے تو نماز میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ احناف اسی بات کا فتویٰ دیتے ہیں ہر اہم کام کے شروع میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھنا سنت ہے، حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو بھی اہم کام "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ناقص اور بے برکت ہوتا ہے، یعنی جس کام کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ

لی جائے تو وہ کام بابرکت ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ آیت ہر کام کی ابتدا میں اللہ کی مدد اور برکت طلب کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے، اور اس میں اللہ کی عظمت اور اس کی رحمت کی وسعت بیان کی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے

اَلْحَمْدُ	ہر قسم کی تعریف	لِلّٰہِ	اللہ کے لئے
رَبِّ	(جو) رب ہے	اَلْعٰلَمِیْنَ ①	تمام جہانوں کا

سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت ہے جس کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے فاتحہ کے معنی آغاز اور ابتدا کے ہیں۔ اس لئے اسے الفاتحہ یعنی فاتحۃ الکتاب کہا جاتا ہے۔ اس کے اور بھی متعدد نام احادیث سے ثابت ہیں مثلاً صحیح احادیث میں اس کا نام ”فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، اَلصَّلَاةُ، سُورَةُ الْحَمْدِ، اَلسَّبْعُ الْمَثَانِ، اَلْقُرْآنُ الْعَظِيمُ، اُمُّ الْقُرْآنِ“ اور ”اُمُّ الْكِتَابِ“ آیا ہے، جیسا کہ فاتحہ کے فضائل کی احادیث میں آ رہا ہے۔ اسماء کی کثرت سورت کے معانی و مطالب کی کثرت کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ”ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اوپر زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو سراٹھایا اور فرمایا: ”یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھولا گیا۔“ تو اس سے ایک فرشتہ اتر ا، پھر فرمایا: ”یہ فرشتہ زمین پر اتر ا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں اتر ا۔“ اس فرشتے نے سلام کہا اور کہا: ”آپ کو دونوروں کی خوش خبری ہو، جو آپ کو دیے گئے ہیں، آپ ﷺ سے پہلے وہ کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے، فاتحۃ الکتاب اور سورہ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان دونوں میں سے جو بھی پڑھیں گے وہ چیز آپ کو ضرور عطا کر دی جائے گی۔“ [مسلم، صلاۃ المسافرین، باب فضل الفاتحہ۔۔ 806] جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مراتب میں فرق ہے، ان میں سے بعض بعض سے افضل ہیں، ہمارے نبی کریم ﷺ پوری اولاد آدم کے سردار ہیں، اسی طرح سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے، اگرچہ بہت سی

سورتیں آیات کے اعتبار سے اس سے لمبی ہیں، مگر عظمت میں یہ سب سے بڑھ کر ہے، جیسا کہ آیات میں آیت الکرسی سب سے عظیم آیت ہے، گو اس سے لمبی آیات بہت سی ہیں۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کی تفسیر کے بارے میں علماء نے بیان کیا ہے کہ ”الحمد“ سے مراد ہر قسم کی تعریف، شکر اور حمد ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ ”لِلَّهِ“ یعنی یہ تعریف اللہ کے لیے ہے، جو تمام کائنات کا رب ہے۔ ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“ میں ”رب“ سے مراد وہ ذات ہے جو پیدا کرنے والا، پالنے والا، سنوارنے والا اور ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے۔ ”العالمین“ سے مراد تمام جہان، یعنی انسان، جنات، فرشتے، حیوانات، نباتات، اور ہر وہ چیز جو موجود ہے۔ حمد کا معنی تعریف بھی ہو سکتا ہے اور شکر بھی۔ تعریف (حمد) عام ہے اور شکر خاص۔ حمد کا تعلق قابل تعریف کارناموں سے ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان، شمس و قمر اور ستاروں کی حرکت غرض تمام کائنات کا اس قدر مربوط اور منظم نظام بنادیا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس پر اس کی بنتی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اور شکر کا تعلق ان خاص انعامات سے ہوتا ہے جو کسی خاص ذات سے متعلق ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کو احسن تقویم پر پیدا کرنا کسی کو صحت اور رزق کی فراوانیوں سے مالا مال کرنا۔ ایسی نعمتوں کے اعتراف کو شکر کہا جاتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کی حمد اور شکر کا مستحق ہوا۔ علاوہ ازیں اگر مخلوق میں سے کوئی شخص کوئی قابل تعریف کارنامہ سرانجام دے اور اس پر اس کی تعریف کی جائے تو وہ بھی حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہوگی۔ کیونکہ قابل تعریف کام کرنے کی صلاحیت اور توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ گویا ہر طرح کی تعریف کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی قرار پاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا مطلب ہے: تمام تعریفیں اور شکر صرف اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا رب، مالک، پرورش کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔ اس آیت میں اللہ کی عظمت، اس کی نعمتوں اور اس کی ربوبیت کا اعتراف اور اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے

”الْعَالَمِينَ“ ”الْعَالَمِ“ کی جمع ہے، جہان۔ ”الْعَالَمِ“ جمع ہے جس کا واحد نہیں، جیسے

”قَوْمٌ، رَهْطٌ، نَاسٌ“ وغیرہ۔ الْعَالَمِیْنَ کو جمع اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے، مثلاً عالم انس، عالم جن، عالم نبات، عالم جماد، عالم ارض اور عالم سماء وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے کئی عالم ہیں، مثلاً انسانوں میں ہر جنس، ہر زبان اور ہر علاقے والوں کا الگ جہان ہے۔ غرض اتنے بے حساب جہاں ہیں جنہیں رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، فرمایا: (وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ) [المذثر: 31] ”اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ ایک جیوٹیوی کی ہزاروں قمیص ہیں، پرندوں کے بیشمار جہاں ہیں، سمندر کی مخلوقات کا شمار ہی نہیں، بیشمار کہکشائیں اور ان کے سیارے جن کے مقابلے میں سورج چاند وغیرہ ایک انگوٹھی کی طرح ہیں، ہر ایک الگ جہان ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے وحدہ لا شریک نہ ہونے کے علم کا ذریعہ ہے۔ رب العالمین ان میں سے ہر ایک کو پیدا کرنے والا، پھر ہر لمحہ اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا اور اسے کمال تک پہنچانے والا ہے۔ غرض سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ ”رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ ہے۔

”الرحمن“ میں عام رحمت اور ”الرحیم“ میں خاص رحمت

الرَّحْمَنُ	نہایت مہربان	الرَّحِيمُ ②	بہت رحم کرنے والا ہے
-------------	--------------	--------------	----------------------

”الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جو ”رحمت“ سے مشتق ہیں۔ ”الرحمن“ کا معنی ہے: وہ ذات جو اپنی رحمت سے تمام مخلوقات کو نوازتی ہے، چاہے وہ مؤمن ہوں یا کافر، مطیع ہوں یا عاصی۔ اس میں اللہ کی رحمت کی وسعت اور عمومیت بیان ہوتی ہے۔ ”الرحیم“ کا معنی ہے: وہ ذات جو خاص طور پر مومنین پر اپنی رحمت فرماتی ہے، یعنی آخرت میں خصوصی رحمت اور انعامات سے نوازتی ہے۔ اس طرح ”الرحمن“ عام رحمت اور ”الرحیم“ خاص رحمت کے معنی میں آتا ہے۔ لفظ ”الرحمن“ مبالغہ کے صیغے پر ہے، جو رحمت کی شدت اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ نام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ جبکہ ”الرحیم“ کا اطلاق مخلوق پر بھی ہو سکتا ہے، جیسے قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے لیے رُءُوفٌ رَحِيمٌ ”فرمایا گیا۔ ایک اور

وضاحت کے مطابق: ”الرحمن“ دنیا میں سب کے لیے رحمت ہے اور ”الرحیم“ آخرت میں مؤمنین کے لیے خاص رحمت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ”الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ میں رَوْفٌ ”اور“ رحیم ”اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جن کا مطلب بہت مہربان، شفقت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر، اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ شفقت کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت، دوام اور خصوصیت دونوں پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

عبادت اور استعانت کا مفہوم/ جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا رد

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝

مَلِكِ اور ”مَلِكِ“ دونوں قراءتیں متواتر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں

مَلِكِ	مالک ہے	يَوْمِ	دن کا	الدِّينِ ۝	بدلے کے
--------	---------	--------	-------	------------	---------

مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ”الدِّينِ“ ”كَانَ يَدِينُ“ کا مصدر ہے، بدلہ دینا، جزا دینا۔ رحمن و رحیم کے بعد جزا کے دن کا مالک ہونے کی صفت بیان فرمائی۔ ایک قراءت (مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ) ہے یعنی روز جزا کا مالک اور دوسری ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ ہے، یعنی روز جزا کا بادشاہ۔ قرآن مجید کے رسم الخط میں ”مَلِكِ“ لکھا ہے، اسے ”مَالِكِ“ اور ”مَلِكِ“ دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے اور دونوں قراءتیں متواتر طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ مالک وہ ہے جو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار رکھتا ہو، آپ پتھر کے مالک ہیں، تو آپ کو اختیار ہے کہ اس کو مسجد کے منبر میں لگائیں یا بیت الخلاء کے فرش میں، یعنی روز جزاء کا مطلب ہے وہ دن جب تمام بندوں کو ان کے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، یوں تو روز جزاء سے پہلے

بھی کائنات کی ہر چیز کا اصلی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے؛ لیکن یہاں خاص طور پر روز جزاء کے مالک ہونے کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو بہت سی چیزوں کا مالک بنایا ہوا ہے، یہ ملکیت اگرچہ ناقص اور عارضی ہے تاہم ظاہری صورت کے لحاظ سے ملکیت ہی ہے، لیکن قیامت کے دن جب جزاء و سزا کا مرحلہ آئے گا تو یہ ناقص اور عارضی ملکیتیں بھی ختم ہو جائیں گی، اس وقت ظاہری ملکیت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہ ہوگی۔ قیامت کے دن کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل مختار ہیں، جس کا قصور چاہیں تو معاف کر دیں اور جس کو چاہیں سزا دیں، اسلام سے پہلے بعض مذاہب کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ گنہگاروں کو گناہ کی سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، وہ گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، عیسائیوں کے ’عقیدہ کفارہ‘ کی بنیاد یہی ہے کہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ انسانیت کے گناہ کو معاف کرنا چاہتے تھے؛ مگر ایسا کرنا اس کے لئے روا نہیں تھا؛ اس لئے (نعوذ باللہ) مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں قسربانی کے لئے بھیجا؛ تاکہ وہ انسانیت کے گناہ کا کفارہ بن سکے، قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت اور بدلہ کے دن کا مکمل مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔ ”الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ“ کے ساتھ قیامت کے دن کے مالک اور بادشاہ ہونے کی مناسبت یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی بہت رحم کرنے والا ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا، اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی رحم نہیں کر سکتا، پھر کوئی شخص بہت سی ملکیت کا مالک ہوتا ہے مگر اس کا بادشاہ کوئی اور ہوتا ہے، وہ مالک ہوتے ہوئے بھی پورا اختیار نہیں رکھتا۔

يَوْمَ الدِّينِ کے معنی

”يَوْمَ الدِّينِ“ کے معنی یوم جزاء کے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مکافات یعنی اعمال کی جزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر اس جزا کا مکمل ظہور چونکہ قیامت کے دن ہوگا اس لیے قیامت کے دن کو خاص طور پر ”يَوْمَ الدِّينِ“ (بدلے کا دن) کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس دن کے ”مَمْلُوكٌ“ اور ”مَمْلُوكٌ“ (بادشاہ) ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس روز ظاہری طور پر بھی مالکیت اور ملکیت کا یہ سلسلہ ختم

ہو جائے گا، فرمایا: (يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ) [الانفطار: 19]
 [”جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کی مالک نہیں ہوگی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔“]
 اور فرمایا: (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ) [المومن: 16] [”آج بادشاہی کس کی
 ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، دبدبے والا ہے۔“ اس دن مالک بھی اللہ تعالیٰ ہوگا، بادشاہ بھی وہی ہوگا،
 صرف اسی کا حکم چلے گا۔ صفت رحمت اور بدلے کے دن کی ملکیت میں مناسبت اس حدیث سے
 واضح ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے پاس سورتیں ہیں، جن میں سے
 اس نے ایک رحمت جن و انس، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے درمیان نازل فرمائی ہے، اسی کے
 ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور
 اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فناویں رحمتیں مؤخر کر رکھی
 ہیں، جن کے ساتھ وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔“ [مسلم، بخاری]

شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ اکیلی آیت ہی کافی ہے

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ②

إِيَّاكَ	صرف تیری ہی	نَعْبُدُ	ہم عبادت کرتے ہیں
وَإِيَّاكَ	اور صرف تجھ ہی سے	نَسْتَعِينُ ②	ہم مدد مانگتے ہیں۔

اس آیت میں (نَعْبُدُ) اور (نَسْتَعِينُ) سے پہلے (إِيَّاكَ) کا لفظ لایا گیا ہے جو صراحتاً بھی
 فائدہ دے رہا ہے اور تاکید کا بھی اور اس کا معنی یوں بنتا ہے کہ ہم صرف اور صرف تیری ہی عبادت
 کرتے اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ تیرے سوا نہ کسی کی عبادت کرتے ہیں نہ کریں گے اور نہ ہی کسی
 سے مدد مانگتے ہیں اور نہ مانگیں گے۔ گویا شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ اکیلی آیت
 ہی کافی ہے۔ یہ لفظ تین معنوں میں آتا ہے۔ (1) پرستش (2) اطاعت و فرمانبرداری (3) ہمہ
 وقت کی بندگی اور غلامی۔ یہاں یہ لفظ اپنے تینوں معنوں میں مستعمل ہے۔ نیز اس آیت میں جمع متکلم
 کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ واحد متکلم کے نہیں ہوئے۔ کیونکہ اسلام نماز باجماعت کی بھی تاکید

کرتا ہے اور معاشرتی اجتماعی زندگی اور نظم و ضبط کی بھی۔ علاوہ ازیں (نَعْبُدُ) کے فوراً بعد (نَسْتَعِينُ) کا لفظ لایا گیا تاکہ انسان کو اپنی عبادت پر غرور نہ پیدا ہو جائے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اسے عبادت کی توفیق بھی اللہ ہی کی مدد کی بنا پر میسر آئی ہے۔ ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کو پہلے اور ”وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کو بعد میں ذکر کر کے دعا کا سلیقہ سکھایا گیا ہے کہ درخواست سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور تجحید کے بعد اپنی بندگی اور اپنے تعلق کا حوالہ پیش کرو، یعنی اپنے عمل کے وسیلے سے درخواست کرو۔ یہ وسیلہ حق ہے، جیسا کہ فرمایا: (رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِنْسَانِ أَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَكْبَرِ) [آل عمران: 193] ”اے ہمارے رب! بیشک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکیوں کے ساتھ فوت کر۔“

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ فاتحہ کا خلاصہ

”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کے بعد ”وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ لانے میں یہ سبق بھی ہے کہ آدمی یقین رکھے کہ وہ کوئی بھی نیکی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا اور مکمل طور پر اللہ کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہونے کا عقیدہ رکھے اور اس کا اظہار و اقرار بھی کرے۔ یعنی ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں اور اپنے تمام کاموں میں تیری ہی مدد مانگتے ہیں، تیری مدد کے بغیر نہ ہم تیری عبادت کر سکتے ہیں نہ کچھ اور۔ اس لفظ میں اللہ پر توکل اور اپنے تمام کام اس کے سپرد کرنے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی گئی ہے۔ بعض سلف نے فرمایا، فاتحہ قرآن کا خلاصہ ہے اور (إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ) فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ کیونکہ ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ“ کہنے سے انسان شرک سے بری ہو جاتا ہے اور ”وإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کہنے سے وہ اپنی قوت و طاقت اور اختیار سے خالی ہو کر صرف اللہ پر توکل و اعتماد کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔ اس استعانت سے مراد ان کاموں میں مدد طلب

کرنا ہے جن کا اختیار اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے کسی مخلوق کو ان کا اختیار نہیں دیا مثلاً معالج دوا دے سکتا ہے مگر شفا صرف اللہ کے پاس ہے۔ کوئی صاحب خیر کچھ روپے پیسے دے سکتا ہے مگر غنی یا فقیر کر دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ طیب علاج کر سکتا ہے مگر اولاد سے نوازنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، آدمیوں اور اسلحے سے ایک دوسرے کی مدد ہو سکتی ہے مگر فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غرض دنیا کے ظاہری اسباب و وسائل جو انسانوں کو عطا کیے گئے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے مدد مانگنا بھی جائز ہے اور ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی لازم ہے، جیسا کہ فرمایا (وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ [المائدة: 2]) ”نسیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔“ افسوس کہ بعض لوگ ان ہستیوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو سنتے ہی نہیں، نہ پاس موجود ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں کی مدد مانگتے ہیں جو اگر وہ زندہ ہوں یا سن رہے ہوں تب بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ”وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ (صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں) کا اقرار کرتے ہیں، پھر غیر اللہ سے مدد مانگتے ہیں، مثلاً ”يَا رَسُولَ اللَّهِ! آغِثْنِي“ (اے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے) یا اے مولا علی، اے شیر خدا! میری کشتی پار لگا دینا، یا اللہ دیا غوث اعظم، یا مدد کن یا معین الدین چشتی۔ غرض صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کے عہد و اقرار کے بعد غیروں کو رب تعالیٰ کا شریک بنا کر انھیں رب کے اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں اور ان سے استغاثہ و استعانت کرتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ہے کہ ”وَإِيَّاكَ نَعْبُدُ“ سے آخر فاتحہ تک دعا کرنے والا جمع کے صیغے سے دعا کرتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا ایک ہے، اس لیے واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، اگر جمع کا لفظ تعظیم کے لیے مانا جائے تو یہ دعا کے مناسب نہیں ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بندہ اپنی انتہائی تواضع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں اپنی درخواست اکیلا پیش کرنے کی جرات نہیں کرتا، بلکہ تمام عبادت کرنے والے جن و انس اور فرشتوں کے ساتھ مل کر پیش کرتا ہے کہ ہم سب (جن میں تیرا یہ

عاجز بندہ بھی ہے) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

بعض اہل علم نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ جمع کے صیغے میں ایک لطیف تواضع پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ واحد کے صیغے میں اپنی کچھ بڑائی کا اظہار ہوتا ہے جو جمع کے صیغے میں نہیں ہے۔ (ابن کثیر) بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی کہ ہر مومن دوسرے مومنوں کے ساتھ ایک جسم کی مانند ہے اور ہر مومن تمام مومنوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس لیے وہ اکیلا ہی تمام مسلمانوں کی طرف سے عرض کرتا ہے کہ ہم سب صرف تیری تعریف کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (”ایمان والے لوگ، ان کے خون آپس میں برابر ہوتے ہیں، ان کا سب سے معمولی آدمی بھی ان کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔“ [ابوداؤد، الدیات، باب ایتقاد المسلم من الکافر؟: 4530، وقال الألبانی حسن صحیح]

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبادت و استعانت کی بہترین صورت اجتماعی عبادت و استعانت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی جامع صورت نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا: (وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ) [البقرہ: 43] ”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔“ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس کام کے لیے مدد مانگتے ہیں، تاکہ وہ عام رہے، مقصد یہ ہے کہ ہر کام میں تیری مدد مانگتے ہیں۔

جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا رد

دنیا میں عموماً تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ جبریہ کہلاتے ہیں دوسرے وہ جو اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان جو کچھ چاہے کر سکتا ہے ایسے لوگ قدریہ کہلاتے ہیں۔ معتزلین بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جو نہ اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہیں اور نہ مجبور محض اور یہی لوگ دراصل حق پر ہیں۔ اس چھوٹی سی چار الفاظ کی آیت میں جبریہ اور قدریہ دونوں کا رد موجود

ہے۔ وہ یوں کہ جب ہم نَعْبُدُ کہتے ہیں یعنی ہم عبادت کرتے ہیں تو اختیار ثابت ہو گیا اور اس میں جبر یہ وارد ہے اور جب ہم مدد چاہتے ہیں۔ تو اس سے بندہ کا محتاج ہونا ثابت ہوا یعنی وہ مختار مطلق نہیں اور اس میں قدر یہ وارد موجود ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت میں وہ تمام باتیں داخل ہیں جو بندگی کا حصہ ہیں، یعنی: نماز، سجدہ، قربانی، قسم، نذر، کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے جائز ہیں، اللہ کے سوا کسی زندہ یا مردہ کے لئے جائز نہیں، اور دعاء صرف اللہ ہی سے کی جائے گی، اللہ کے ماسوا سے استمداد اور استعانت حرام ہے۔ بہر حال اس آیت میں بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی قسم کی عبادت کے لائق نہیں، نیز ہر کام میں حقیقی مدد اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے؛ کیونکہ صحیح معنی میں کار ساز اس کے سوا کوئی نہیں، دنیا کے بہت سے کاموں میں بعض اوقات کسی انسان سے جو مدد مانگی جاتی ہے، وہ اسے کار ساز سمجھ کر نہیں؛ بلکہ ایک ظاہری سبب سمجھ کر مانگی جاتی ہے۔

صراطِ مستقیم / انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟ / سورت فاتحہ سے آغاز قرآن کی وجہ؟

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝
إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

ہدایت کے کئی مفہوم

سیدھے راستے کی	الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝	ہدایت دے ہمیں	إِهْدِنَا
----------------	-----------------------------	---------------	-----------

ہدایت کے کئی مفہوم ہیں، راستے کی طرف رہنمائی کرنا، راستے پر چلا دینا، منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اسے عربی میں ارشاد توفیق، الہام اور دلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ہماری صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرما، اس پر چلنے کی توفیق اور اس پر استقامت نصیب فرما، تاکہ ہمیں تیسری رضا (منزل مقصود) حاصل ہو جائے۔ یہ صراطِ مستقیم محض عقل اور ذہانت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے دعا کی ابتداء ہو رہی ہے۔ اللہ کے بندے اس کے حضور عرض کرتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ دکھلا ہم کو سیدھا راستہ۔ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اس کی تشریح خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ اس راستے سے مراد اسلام دین اور توحید کا راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر اللہ

کے تمام انبیاء علیہم السلام گامزن رہے۔ سورۃ الحج میں جہاں ابلیس نے انسانوں کو اللہ کے راستے سے بہکانے کا چیلنج کیا ہے، وہاں اللہ نے فرمایا ہے هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ یہی سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے اس کے اصول و ضوابط قرآن پاک میں بتلا دیے گئے ہیں اور اس راستے پر چلنے والے مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہو سکے گا یہی راستہ ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے قرب کے مقام تک پہنچانے والا ہے، مفسرین نے اس آیت کے مختلف معنی بیان فرمائے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ”یہ راستہ اپنے اوپر چلنے والے کو سیدھا چلاتا ہے یہاں تک کہ اس پر چل کر وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ دلائل کے ساتھ لوگوں کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنا ہمارے ذمے ہے۔ (قرطبی، الکحج، تحت الآیۃ: ۴۱، ۵/ ۲۱، الجزء العاشر)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ”اس آیت کا ایک معنی یہ ہے کہ اخلاص مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ (تفسیر کبیر، الکحج، تحت الآیۃ: ۴۱، ۷/ ۱۲۵) علامہ اسماعیل حق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس آیت کا یہ معنی بیان فرمایا کہ ”چنے ہوئے بندوں کا ابلیس کے بہکاوے سے بچ جانا وہ راستہ ہے جو سیدھا اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ (روح البیان، الکحج، تحت الآیۃ: ۴۱، ۴/ ۳۶۹)

آگے سورہ نحل میں آتا ہے وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ اللَّهِ بِدِيلٍ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر سیدھے راستے کو بیان کرنا اپنے ذمہ کر لیا ہے، یہ اس کا فضل اور احسان ہے لہذا جو ہدایت حاصل کرے گا تو وہ اپنے فائدے کیلئے کرے گا اور جو گمراہ ہو گا تو گمراہی کا نقصان بھی اسی کو ہے۔ وَمِنْهَا جَائِرٌ اوز بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں جن پر چل کر کوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا یہ کفر و شرک کے شیطانی راستے ہیں، شیطان لوگوں کو ان راستوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے مگر اسلام دین حق اور توحید کا یہی صراطِ مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ یعنی ان راستوں میں سے کچھ راستے ایسے ہیں جو صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں اور ان پر چلنے والا منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ کفر اور گمراہی کی تمام راہیں جیسے یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت وغیرہ یونہی اپنی خواہشات

سے نئے نئے مسلک بنانے والے سب اس میں داخل ہیں۔

قَصْدُ السَّبِيلِ سے مراد

اس سے معلوم ہوا کہ ”قَصْدُ السَّبِيلِ“ سے مراد دین اسلام اور اہلسنت والجماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم، حسنِ اعتقاد اور اچھے اعمال پر استقامت عطا فرمائے اور کفر، گمراہی اور بدمذہبی سے ہماری حفاظت فرمائے۔ روح البیان، سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین برحق صرف اسلام ہے جو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کا راستہ ہے، تمام انبیاء ملائکہ اور نیک لوگ یہی راستہ اختیار کرتے آئے ہیں یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ہر نبی کا دین اسلام ہی تھا لہذا اسلام کے سوا کوئی اور دین بارگاہِ الہی عزَّ و جَلَّ میں مقبول نہیں لیکن اب اسلام سے مراد وہ دین ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم میں مقبول نہیں لیکن اب اسلام سے مراد وہ دین ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم لائے، چونکہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کیلئے رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو آخری نبی بنایا، تو اب اگر کوئی کسی دوسرے آسمانی دین کی پیروی کرتا بھی ہو لیکن چونکہ وہ اللہ عزَّ و جَلَّ کے اس قطعی اور حتمی دین اور نبی کو مکمل طور پر نہیں مان رہا لہذا اس کا آسمانی دین پر عمل بھی مردود ہے۔ یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار جو اپنے دین کو افضل و مقبول کہتے ہیں اس آیت میں ان کے دعویٰ کو باطل فرمایا گیا ہے۔

اللہ عزَّ و جَلَّ کے نزدیک پسندیدہ دین

اللہ نے واضح طور پر فرمادیا ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا: اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر قرآن پاک میں کئی جگہ فرمادیا کہ اللہ عزَّ و جَلَّ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اور اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس زمانے میں معتبر نہیں۔ اسلام کے علاوہ کوئی کسی دین کی اخلاقی باتوں پر جتنا چاہے عمل کر لے جب تک مکمل طور پر بطور عقیدہ اسلام کو اختیار نہیں کرے گا اس کا کوئی عمل بارگاہِ الہی میں مقبول نہیں اور اب اسلام سے مراد وہ دین ہے جسے حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم لے کر آئے۔ جو

آدمی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ اور ایسا شخص آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والا ہوگا۔ وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو کر جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا انسان کا فطری حق ہے جو شخص ان فطری تقاضوں کے مطابق چلے گا، فرائض کو ادا کرے گا، نواہی سے پرہیزگاری کرے گا وہی صراط مستقیم کا مسافر ہوگا، اور وہی راستہ ہے جس کی تعلیم و تلقین تمام انبیاء کرتے آئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وہ سیدھی راہ ہے جو بندے کو اللہ تک پہنچانے والی ہے۔ اور اس میں کوئی پیچ و خم یا فراط و تفریط نہیں اور یہ ایک ہی ہو سکتی ہے جبکہ باطل راہیں لاتعداد ہوتی ہیں۔ اسی راہ کو اللہ تعالیٰ نے جبل اللہ بھی فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي سے تعبیر فرمایا ہے اور صراط مستقیم کی دوسری تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حق کا وہ راستہ جو سیدنا آدم سے لے کر تاقیامت ایک ہی رہا اور رہے گا اور وہی راستہ توحید ہر نبی کو وحی کیا گیا ہے۔ لہذا یہ دعا ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ جب انسان سیدھے راستے کی دعا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ پروردگار! ہمیں صحیح راستہ دکھا، اس پر چلا اور اس پر استقامت عطا فرما۔

انعام یافتہ گروہ/گمراہ لوگ کون ہیں؟

صِرَاط	راستہ	الَّذِينَ	(ان لوگوں کا) جو	أَنعَمْتَ	تو نے انعام کیا
عَلَيْهِمْ	ان پر	غَيْرِ	نہ	الْمَغْضُوبِ	غضب کیا گیا
عَلَيْهِمْ	ان پر	وَلَا	اور نہ	الضَّالِّينَ	سب گمراہ ہوئے
آمین			قبول فرما		

انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟: وہ لوگ جنہیں مال و دولت یا حشمت و جہا کی فراوانیاں حاصل ہیں۔ اور آپ کے ارشاد کے مطابق (آیت مَغْضُوبٍ عَلَيْهِمْ) سے مراد تو یہود ہیں جو گناہ کے کاموں پر دلیر ہو گئے تھے اور ان پر اللہ کا عذاب اور پھنکار نازل ہوئی اور الضَّالِّينَ سے مراد عیسائی حضرات ہیں جو فلسفیانہ موشگافیوں میں پھنس کر تخلیق اور گمراہی کا شکار ہوئے

(۱) کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے؟ خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے کہ وہ چار ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین (النساء: ۶۹) گویا ان کی راہ پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا دین میں مطلوب ہے، معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں آباء و اجداد کی اتباع سے منع کیا ہے، اس سے وہ آباء و اجداد مراد ہیں، جو حق کے راستے سے ہٹے ہوئے تھے، جو لوگ راہ حق پر ثابت قدم تھے، ان کی راہ پر قائم رہنے کی تودعاء کرائی گئی ہے، اسی سے ائمہ مجتہدین کی تقلید کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ صالحین میں تھے۔ (۲) انسان کی گمراہی کا ہمیشہ دو میں سے ایک سبب ہوتا ہے، حق اور سچائی کی تلاش میں کوتاہی اور اس کی وجہ سے نادانستہ گمراہی کا ارتکاب الضَّالِّینَ سے یہ لوگ مراد ہیں، دوسرے: سچائی کو جاننے کے باوجود اس کا انکار، ایسے لوگ غضب شدید کے مستحق ہوتے ہیں، یہ ”مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ“ ہیں، قرآن مجید نے ان دونوں گروہوں کی غلطی سے سچانے کے لئے دُعاء سکھائی ہے۔

مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ کا مصداق، اور الضَّالِّینَ سے مراد

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ”مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ“ کا مصداق یہود اور ”الضَّالِّینَ“ سے مراد عیسائی ہیں، (مجمع الزوائد: ۶/۳۱۴، بحوالہ مسند احمد، نیز دیکھئے: صحیح ابن حبان: ۱۶/۱۸۴، عن عدی بن حاتم) اس کا مقصود یہ ہے کہ مغضوب گروہوں اور قوموں میں ایک یہود اور گمراہوں اور ضالین میں ایک عیسائی ہیں، نہ یہ کہ صرف یہی قومیں اس سے مراد ہیں، اور ایسا آپ نے اس لئے ارشاد فرمایا کہ عیسائیوں نے نبی برحق حضرت مسیح علیہ السلام کے سلسلے میں افراط سے کام لیا اور ان کو ”رسول اللہ“ سے ابن اللہ (خدا کا بیٹا) بنا دیا؛ اس لئے وہ گمراہ ہوئے الضَّالِّینَ کے زمرہ میں داخل ہوئے، یہودیوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ تفریط کی، ان کی ایذا رسانی اور اہانت کے درپے ہوئے؛ اس لئے بار بار اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، گویا امت کو دونوں باتوں سے منع فرمایا گیا، اس سے بھی کہ اللہ کے نیک بندوں کے معاملہ میں افراط اور مبالغہ سے کام لیا جائے، کہ یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے، اور اس سے بھی منع کیا گیا کہ ان کے بارے میں اہانت و تحقیر کا

رو یہ اختیار کیا جائے؛ کہ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ (۳) سورہ فاتحہ کے ختم پڑ ”آمین“ کہنا مسنون ہے، اس کے معنی ہیں: اے رب! قبول فرما لیجئے ابو میرہ سے مروی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سورہ فاتحہ پڑھائی، جب ”وَلَا الضَّالِّينَ“ پر پہنچے تو کہا کہ آپ ﷺ آمین کہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے آمین کہا، (مصنف ابن ابی شیبہ، باب ما ذکر فی آمین الخ، حدیث نمبر: ۸۰۴۴) اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے باہر بھی ”آمین“ کہنا مسنون ہے، نماز میں امام اور مقتدی دونوں آمین کہیں گے، حدیث میں آمین کا زور سے کہنا بھی منقول ہے اور آہستہ کہنا بھی؛ اس لئے دونوں طرح آمین کہنا درست ہے؛ البتہ آہستہ کہنا افضل ہے؛ کیوں کہ ”آمین“ بالاتفاق دعاء ہے اور قرآن مجید نے دعاء کا ادب یہی بتایا ہے کہ آہستہ کی جائے، ”وَادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً“۔ (اعراف: ۵۵) سورہ فاتحہ کو آپ قرآن کریم کا چھوٹا نسخہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ پورے قرآن کریم کے مضامین اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں جمع فرما دیے، یہ گھسی کی طرح ہے، گھسی کا اثر پورے درخت کے پتوں، شاخوں، ٹہنیوں اور پھلوں میں ہوتا ہے، سورہ فاتحہ کا اثر بھی قرآن پاک کی بقیہ ایک سوتیرہ سورتوں میں ہے، ایک سوتیرہ سورتوں کو سمیٹو تو سورت فاتحہ بنتی ہے۔ اور سورت فاتحہ کو کھولو تو قرآن کی ایک سوچوہ سورتیں ظاہر ہو جاتی ہیں، قرآن کے تیس پارے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کا خلاصہ

☆ انسان اپنی زندگی میں چند اہمیت کے حامل اصول اور قوانین کا محتاج ہوتا ہے جو اس سورت میں مذکور ہیں:

☆ نظام معاش: ”رَبِّ الْعَالَمِينَ“

☆ نظام عدالت: ”مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ“ ☆ نظام قانون کے سامنے انقیاد: ”إِيَّاكَ

نَعْبُدُ“

☆ قانون حیات: ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“

- ☆ قومی و ملی مدافعتی و دفاعی نظام: "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ"
- ☆ پوری سورت توحید، مبداء و معاد جیسے اہم مضامین پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو "اُمُّ الْكِتَاب" بھی کہتے ہیں۔

☆ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ساری آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہے، اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۃ فاتحہ ہے، اور سورۃ فاتحہ کا خلاصہ "إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" ہے۔

☆ شاید اس بنیاد پر حدیث میں سورۃ فاتحہ کو "أَعْظَمُ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ" کہا گیا ہے، جس طرح آیۃ الکرسی کو "أَعْظَمُ الْآيَاتِ" کہا گیا، اب کتابوں میں قرآن کریم "أَعْظَمُ الْكُتُبِ"، اور سورتوں میں فاتحہ "أَعْظَمُ السُّورِ"، اور آیتوں میں آیۃ الکرسی "أَعْظَمُ الْآيَاتِ" ہے۔

سورۃ الفاتحہ سے قرآن اور نماز کا آغاز

سورۃ الفاتحہ سے قرآن کا آغاز کیا گیا اور ہر نماز میں فاتحہ پڑھوائی گئی، اکیلے نماز پڑھ رہے ہو یا امام ہو تو ہر رکعت میں فاتحہ پڑھو، اور اگر مقتدی ہو تو من کان لہ إِمَامٌ فَقَرَأَهُ إِلَّا مِمَّا لَهُ قِرَاءَةٌ" (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۸۵۰) امام نے فاتحہ پڑھی تو اس نے تمہاری طرف سے بھی پڑھی لیکن فاتحہ بہر صورت پڑھی گئی، بعض لوگ غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حدیث کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے امام صاحب ان تمام احادیث پر عمل کرتے ہیں جن کی صحت کے متعلق آئمہ میں اتفاق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دونوں قسم کی روایات منقول ہیں۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فاتحہ امام کے قائل نہیں ہیں مگر بعض سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی قائل ہوں اگر قائل ہیں تو وہ بھی استحباب کے درجے میں فرض واجب نہیں سمجھتے۔ تینوں آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ فاتحہ غلت امام صرف سری نمازوں میں محتب ہے۔ جہری نماز میں قرات کرنا امام کے ساتھ جھگڑا کرنے کے مترادف ہے البتہ امام ابوحنیفہ امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری رحمۃ

اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام نہ سری نماز میں پڑھے اور نہ جہری میں خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص منفرد نماز پڑھتا ہے یا بطور امام نماز پڑھتا ہے تو وہ سورہ فاتحہ بھی پڑھیگا اور اس کے ساتھ دوسری سورہ بھی ملائے گا۔ اور اگر نمازی کسی امام کے پیچھے مقتدی ہے تو وہ خاموش رہے گا اور امام کی قرأت کو سنے گا کیونکہ اسکے لیے امام کی قرأت کفایت کر جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک احادیث کے مطابق ہے اور اس سے تمام احادیث پر عمل ہو جاتا ہے۔ روایت کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے حصے کو چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض نے تشدد کیا ہے تشدد کرنا ٹھیک نہیں بلکہ بات ہمیشہ دلیل کیساتھ ہونی چاہیے پھر دیکھیں کہ قوی دلائل کدھر ہیں چنانچہ قوی دلائل امام ابوحنیفہ کے مسلک کی حمایت میں ہیں الہذا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ بہر حال اگر صرف فرض نماز اور وتر دیکھیں تو ایک دن میں بیس مرتبہ ہم نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں، یہ کیا وجہ ہے کہ نماز میں فاتحہ، ہر رکعت میں فاتحہ، قرآن کے آغاز میں فاتحہ، یاد رکھیے! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ، قرآن کے تمام مضامین کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اگر فاتحہ سمجھ میں آئی تو قرآن سمجھ میں آگیا، اگر فاتحہ پر عمل ہوا تو نماز کا نور آپ کو نصیب ہو گیا، فاتحہ سے نماز کی بھی تکمیل ہو گئی، اور اگر فاتحہ نہ ہو تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نماز میں فاتحہ نہ ہو وہ نماز ناقص ہے۔ (صحیح مسلم، ج: ص: ۲۰۶، رحمانیہ)

بہر حال اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اس کی صفات کا ذکر ہوا اور اس کے بعد عبادت و استعانت کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے کا بیان تھا۔ پھر بندوں کی طرف سے درخواست کی گئی کہ مولا کریم! ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ انسانوں کی اولین ضرورت یہ ہے کہ ان کے سامنے صراط مستقیم واضح ہو جائے۔ اس کے بعد صراط مستقیم کے لیے نمونے کا ذکر کیا گیا کہ یا اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا۔ قرآن پاک نے انعام یافتہ چاروں گروہوں یعنی انبیاء صدیقین، شہید اور صالحین کی وضاحت

فرمادی کہ یہی وہ لوگ ہیں جن نمونے پر چلنے کی ضرورت ہے اور جن کا طریقہ اختیار کیے بغیر کوئی انسان فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ نیز اس سے ابتدا کرنے کی بظاہر یہ وجہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو، اسے سب سے پہلے اپنے خالق و مالک کی صفات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور حق کے ایک سچے طلب گار کی طرح اسی اللہ سے سیدھے رستے اور ہدایت کی دعا مانگنی چاہیے، اس لیے فاتحہ میں ”صراطِ مستقیم کی جو دعا سکھائی گئی ہے، آگے مکمل قرآن مجید اسی سیدھے رستے کی تشریح ہی ہے۔ (آسان ترجمہ قرآن)

سورۃ اور آیت کا مفہوم و مطلب / ریب کا لغوی مفہوم متقین کے لیے ہدایت

تعارف سورۃ البقرہ

یہ سورہ ترتیب قرآنی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اور ترتیب نزولی کے لحاظ سے ۸۷ ستاسی نمبر پر ہے یعنی مدنی سورتوں میں سب سے پہلی سورت ہے۔ مکہ میں چھپاسی (86) سورتیں نازل ہوئیں، اگرچہ اس سورہ کا بیشتر حصہ ابتدائی مدنی دور میں نازل ہوا تاہم اس کی کچھ آیات بہت مابعد کے دور میں نازل ہوئیں مثلاً حرمت سود کی آیات جو 10ھ کے اواخر میں نازل ہوئیں۔ سورۃ البقرہ بالاتفاق مدنی اور قرآن کریم کی سب سے لمبی سورت ہے، اس کی دو سو چھپاسی (۲۸۶) آیات اور چالیس (۴۰) رکوع ہیں۔ یاد رکھیے کہ قرآنی سورتوں کی دو طرح سے ترتیب بیان کی جاتی ہے: قرآن کریم کے مطالعہ اور تفسیر کے ضمن میں ترتیب نزولی اور ترتیب توفیقی (یا ترتیب مصحفی) دو بنیادی اصطلاحات ہیں۔ ان کا مطلب اور مفہوم درج ذیل ہے:

ترتیب نزولی

1 ترتیب نزولی: معنی و مطلب: اس سے مراد وہ ترتیب ہے جس کے مطابق قرآن کریم کی آیات اور سورتیں نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئیں۔ یعنی کوئی سورت اور آیت، کب کہاں اور کس ترتیب سے

نازل ہوئی۔ گویا جس ترتیب سے سورتیں نازل ہوئی ہیں، اس ترتیب کو ترتیب نزولی کہا جاتا ہے۔ اور ترتیب زمانی بھی کہا جاتا ہے مثال کے طور پر۔ سب سے پہلی وحی: سورہ العلق (آیت 1-5)۔ مکی سورتیں: جن میں عقائد، توحید، اور آخرت کا ذکر ہے (ابتدائی زمانہ)۔ مدنی سورتیں: جن میں احکام، قوانین، اور معاشرتی مسائل کا ذکر ہے (ہجرت کے بعد کا زمانہ)۔ مقصد: اس ترتیب کو جاننے کا مقصد قرآن کے تدریجی نزول، احکام کی بتدریج منسوخی اور نفاذ، اور تاریخ اسلام کو سمجھنا ہے۔

ترتیب توقیفی یا ترتیب مصحفی

2 ترتیب توقیفی یا ترتیب مصحفی: قرآن کریم نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی جو ترتیب صحابہ کرام کو سمجھائی کہ کسی آیت کو کس سورت میں رکھا جائے؟ اور آیات کو کیسے ترتیب دیا جائے، یعنی جس ترتیب کے مطابق قرآن مجید آج ہمارے پاس کتابی شکل (مصحف) میں موجود ہے۔ سورہ فاتحہ سے شروع ہو کر سورہ الناس پر ختم ہونے والی ترتیب ہے ترتیب توقیفی۔ یہ ترتیب نزول کے مطابق نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہے۔ آپ ﷺ نے وحی کے نزول کے وقت ہی کاتبین وحی کو بتا دیا تھا کہ یہ آیت یا سورت کس جگہ رکھی جائے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں اسی ترتیب کے مطابق قرآن کو ایک جگہ جمع کیا گیا، اس لیے اسے ترتیب عثمانی بھی کہتے ہیں۔ موجودہ زیر تلاوت قرآن مجید ترتیب نزول میں نہیں بلکہ اسے مصحفی قرآن کہا جاتا ہے۔ ترتیب مصحف (یعنی کتابی صورت) میں قرآن موجود ہے اس پر تمام مسلمانوں کا مکمل اتفاق ہے۔ آیات قرآنی جو اللہ کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وقتاً فوقتاً کیے بعد دیگرے نازل ہوتی گئیں اس تسلسل کو ترتیب نزول قرآن کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی سب سے طویل آیت

اسی سورت میں قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت، آیت دین یا آیت مہدیین (یعنی سورہ البقرہ، آیت 282) قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے، جو قرض کے لین دین، معاملات کو لکھ لینے اور گواہ بنانے کے احکام بیان کرتی ہے۔ 'مداینہ کے معنی قرض کے لین دین کے ہیں،

اور یہ آیت مالیاتی لین دین میں شفافیت، نا انصافی کے خاتمے، اور بھول چوک سے بچنے کے لیے تحریری دستاویز (دستاویز) کو لازم قرار دیتی ہے۔ نیز اس سورت میں آیت الکرسی بھی ہے، جو احسن و ثواب کے لحاظ سے تمام قرآنی آیات سے افضل آیت ہے، قرآن کریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت: **وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَلَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ** ﴿۸۰﴾ بھی اسی سورت میں ہے۔ اس سورت کا کمال یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، انسانوں کی جتنی اقسام ہیں، مومن، کافر، منافق، نیک و بد وغیرہ سب کا ذکر اللہ نے سورۃ البقرہ میں کیا ہے۔

لفظ سورہ اور آیت کا تعارف و تشریح

لفظ سورہ س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے "قِطْعَةً مِّنَ الْاَيَاتِ" کا مطلب ہے "آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ" گویا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو اسے سورہ کہا جاتا ہے۔ کسی سورہ کیلئے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ سورہ عصر، سورہ کوثر اور سورہ نصر تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورہ کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے جیسے **اللَّهُ** یا **اَحْم** اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے۔ جیسا ج، ق وغیرہ اور بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورہ مزمل کے دوسرے رکوع والی آیت ہے۔ آیت کے مختلف معانی: آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھول وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: **لَا يَتْلُوَنَّهَا لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ**۔ اس میں عقلمندوں کیلئے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔

فضائل سورہ البقرۃ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں سورہ البقرہ پڑھی جائے، شیطان اس گھر سے نکل جاتا ہے۔ (مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا، باب استحباب الصلوٰۃ النافلۃ فی بیتہ۔۔ الخ) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: دو جگہ گمانے والی سورتیں یعنی البقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ قیامت کے دن وہ اس حال میں آئیں گی جیسے وہ دو بادل یا دو سائبان یا پرندوں کے دو جھنڈ ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے (مغفرت کے لیے) جھگڑا کریں گی (لہذا) سورہ البقرہ پڑھا کرو۔ اسے حاصل کرنا برکت اور چھوڑ دینا حسرت ہے اور باطل قوتیں (جادو وغیرہ) اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ (مسلم، کتاب فضائل القرآن سورہ البقرۃ)

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
اللَّهُ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۙ فِیْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ

اللَّهُ ۝	الم
-----------	-----

حُرُوفِ مُقَطَّعَات اور اس کی اقسام

انہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے، یعنی علیحدہ علیحدہ پڑھے جانے والے حروف قرآن حکیم میں 114 سورتیں ہیں، جن میں سے 29 سورتوں کی شروعات مختلف مفرد حروف اور کلمات سے ہوتی ہے جیسا کہ اللہ، یس، طہ، ن وغیرہ، ان کو حُرُوفِ مُقَطَّعَات کہتے ہیں۔ حُرُوفِ مُقَطَّعَات کی اقسام: حروف مقطعات پانچ طرح کے ہیں: ایک حرفی: یہ تین سورتوں میں ہیں، جیسا کہ ن، ق اور ص۔ دو حرفی: یہ نو سورتوں میں ہیں جیسا کہ لحم، یس، طہ، طس وغیرہ۔ تین حرفی: یہ تیرہ سورتوں میں ہیں جیسا کہ اللہ، طسم، الر، عسق وغیرہ۔ چار حرفی: یہ دو سورتوں میں ہیں جیسا کہ البقرہ، البص۔ پانچ حرفی: یہ بھی دو سورتوں میں ہیں جیسا کہ گھیلعص، لحم عسق۔ ان کلمات کے معنی تک دماغوں کی رسائی نہیں اور ان کے معنی سمجھ ہی نہیں آتے ہیں۔ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: غالب گمان یہ ہے کہ حروف مقطعات پوشیدہ علم اور راز ہیں، جن سے علما ناواقف ہیں۔

اسی وجہ سے حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب کے راز ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے راز سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف میں ان کے معنی کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ہے۔ واللہ اَعْلَمُ بِمَعْرِادِہٖ۔ سلف صالحین کی عام طور پر یہ رائے ہے کہ اس کی صحیح مراد سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہیں، گویا ان حروف کے ذریعہ اصحاب عقل و دانش کا امتحان ہے، نادان کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ اس کو تحقیق و جستجو کا حکم دیا جائے اور دان کا امتحان یہ ہے کہ اس کے فکر و تدبر کے لئے سرحدیں مقرر کر دی جائیں کہ ان سے آگے قدم نہیں رکھنا ہے، انسانی عقل کہیں رکنا نہیں چاہتی، چاند پر قدم رکھ دیا تو مرتخ پر قدم ڈالنا چاہتی ہے، مرتخ زیر قدم آجائے تو سورج کو اپنا اسیر بنانا چاہتی ہے؛ چنانچہ ان حروف مقطعات کا مقصد عقل انسانی کا امتحان ہے کہ خدا کے منشاء کے مطابق وہ اس کی کھوج میں پڑنے سے باز رہے، پھر چوں کہ ان حروف کے معانی معلوم ہونے پر نہ دنیا کا کوئی حکم شرعی موقوف ہے اور نہ آخرت میں نجات یا عذاب؛ اس لئے انسان کے اس سے ناواقف ہونے میں کچھ حرج نہیں۔

کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض

ذٰلِكَ	وہ	الْكِتٰبِ	کتاب
لَا رَيْبَ	کوئی شک نہیں	فِيْهِ	اس میں

یعنی اس کتاب قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے، اس کے نبی ﷺ کے دل پر اترنے اور نبی کے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینے میں کسی مقام پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں طے پا رہے ہیں۔ ریب دراصل ایسے شک کو کہتے ہیں جس میں اضطراب اور خجائان کا عنصر بھی شامل ہو۔ کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض تھے۔ ایک یہ کہ محمد ﷺ خود ہی اس کو تصنیف کر کے ہمیں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ کلام منزل من اللہ ہے اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ یہ قرآن دوسرے عالموں سے سیکھ کر ہمیں سنادیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ منزل من اللہ ہے۔ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو خجائان اور اضطراب کا کوئی عنصر اس میں شامل نہیں ہوتا

تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ قرآن جو دعوت پیش کر رہا تھا اس میں سب سے زیادہ زور ہی عقیدہ آخرت اور اخروی باز پرس پر دیا جا رہا تھا جب کہ کفار مکہ بعث بعد الموت کے کلی طور پر منکر تھے اور انہیں اضطراب اور بے چینی اس بات پر تھی کہ اگر بالفرض قرآن کی دعوت سچی ہے تو پھر انسان کی خیر نہیں۔ بعث بعد الموت کا مطلب ہے مرنے کے بعد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے اٹھانا۔ یہ عقیدہ اجزائے ایمان میں سے ہے، جس کا مقصد نیکو کاروں کو جزا اور گناہ گاروں کو سزا دینا ہے، تاکہ دنیا میں ہونے والے اعمال کا حساب کتاب لیا جاسکے۔

انسانی اضطراب اور غلبان کا علاج

ان کے اسی اضطراب اور غلبان کو دور کرنے کے لیے اس سورہ کے تمہیدی الفاظ میں ہی یہ واضح کر دیا گیا کہ اس کتاب کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول اور اس کے مضامین سب کچھ قطعی اور یقینی ہیں اور اس پر ایمان لانے والوں کو کسی قسم کا شک اضطراب اور غلبان باقی نہیں رہتا۔ لہذا تمہارے اضطراب اور غلبان کا بھی یہی علاج ہے۔ کہ تم اسے تسلیم کر کے اس پر ایمان لے آؤ۔ قرآن کو 'کتاب' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں ایک موصوف اور کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکا تھا، جس کا ایک ایک حرف آج تک محفوظ ہے، یہ محض متفرق یادداشتوں کا مجموعہ نہیں، جسے پیغمبر اسے ان کے مختلف اصحاب نے موقع بہ موقع سنا ہو، پھر سیدنا بہ سیدنا ان کی روایت ہوئی ہو اور بعد کو یہ یادداشتیں الفاظ و معانی کی نوع بہ نوع تبدیلیوں کے ساتھ نقل اور جمع کی گئی ہوں، دنیا میں اسلام کے سوا دوسرے اہل مذاہب کے پاس جو مذہبی صحیفے موجود ہیں، ان کا یہی حال ہے؛ اسی لئے وہ صحائف نہ لفظی تبدیلیوں سے محفوظ رہے، نہ معنوی تحریفات سے۔ یعنی قرآن مجید کے اللہ کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، نیز قرآن مجید میں جتنے حقائق و واقعات بیان کئے گئے ہیں، گذشتہ اقوام کے قصص و واقعات ہوں، مستقبل کی خبریں ہوں یا کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کا ذکر ہو، خواہ ان کا تعلق فلکیات سے ہو، طبیعیات سے ہو یا حیاتیات سے، یہ سب حقیقت پر مبنی ہیں، ان کے بارے میں شک و شبہ کا کوئی کاٹنا دل میں نہیں چھننا چاہئے، اگر کسی بات میں شبہ

ہو تو یہ انسان کی عقل کو تباہ اور فہم نارسا کا قصور ہے، نہ یہ کہ قرآن مجید کا بیان غلط ہے؛ چنانچہ آج تک نت نئی سائنسی تحقیقات حرف بہ حرف قرآن مجید کی تصدیق کرتی جاتی ہیں۔

تمام لوگوں کی ہدایت سے مراد

ہُدًى	ہدایت ہے	لِّلْمُتَّقِينَ ○	تمام متقین کے لئے
-------	----------	-------------------	-------------------

ہُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہدایت کا ایک معنی راستہ دکھانا ہے، اس لحاظ سے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ (ہُدًى لِّلْمُتَّقِينَ) [آل عمران: 4] ”تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔“ دوسرا معنی منزل تک پہنچا دینا ہے۔ اس لحاظ سے یہ صرف متقین کے لیے ہدایت ہے، کیونکہ منزل پر وہی پہنچتا ہے جو رہبر کے کہنے پر چلتا ہے، شفا اسی مریض کو ہوتی ہے جو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ شرع میں متقی وہ ہے جو ہر ایسی چیز سے اپنے آپ کو باز رکھے، جس کے کرنے یا چھوڑنے سے خطرہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ہو سکتا ہے۔ (کشاف) جیسے سورج کی روشنی ہر شخص تک پہنچتی ہے؛ لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جس کو دیکھنے والی آنکھ بھی میسر ہو، جو آنکھ ہی سے محروم ہو، اس کے لئے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں برابر ہے، بادل ہر زمین پر برتا ہے؛ لیکن سیراب وہی زمینیں ہوتی ہیں، جن میں پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہو، چٹیل اور سنگلاخ زمین کو بارش سے کچھ نفع نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن مجید کے مخاطب تو تمام انسان ہیں؛ لیکن قرآن مجید کی دعوت ہدایت سے فائدہ انھیں لوگوں کو حاصل ہوگا، جو ہدایت کے طلب گار بھی ہوں، اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دل میں خدا کا خوف ہو، گناہ اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی خواہش ہو اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ ہو، ایسے ہی لوگوں کو ”متقین“ کہا گیا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی

تقویٰ کا معنی ہے: ”نفس کو خوف کی چیز سے بچانا۔“ اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ نفس کو ہر اس کام سے بچانا جسے کرنے یا نہ کرنے سے کوئی شخص

عذاب کا مستحق ہو جیسے کفر و شرک، کبیرہ گناہوں، بے حیائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا، حرام چیزوں کو چھوڑ دینا اور فرائض کو ادا کرنا وغیرہ اور بزرگانِ دین نے یوں بھی فرمایا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ تیرا خدا تجھے وہاں نہ پائے جہاں اس نے منع فرمایا ہے۔ (مدارک، البقرة، تحت الآیۃ: ۲،)

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یعنی قرآن مجید اہل تقویٰ کے لیے ہدایت ہے۔ "هُدًى" سے مراد ہے: رہنمائی، رشد و ہدایت، اور واضح راستہ دکھانا۔ یعنی یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ تقویٰ کا مطلب ہے: اللہ کے احکام کی پیروی کرنا، اس کی نافرمانی سے بچنا، اور اپنے آپ کو گناہوں اور برائیوں سے بچنا۔ تفسیر البغوی میں ہے: "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" یعنی یہ قرآن اہل تقویٰ کے لیے رشد و ہدایت اور بیان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق متقی وہ ہے جو شرک، کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچتا ہے۔ لفظ "تقویٰ" کا اصل معنی ہے: دو چیزوں کے درمیان رکاوٹ بنانا، یعنی انسان اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اس کی اطاعت اور گناہوں سے اجتناب کو اپنی ڈھال بناتا ہے۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ "هُدًى" سے مراد ہے: وہ رہنمائی جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچادے۔ اور اس ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص اس لیے کیا گیا کہ وہی اس سے حقیقی فائدہ اٹھاتے ہیں، اگرچہ قرآن کی رہنمائی سب کے لیے عام ہے۔ متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو آخرت کے نقصان سے بچاتا ہے، کم از کم شرک سے، اس کے بعد کبیرہ گناہوں سے، اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز سے بچے جو اسے اللہ کی یاد سے غافل کرے۔ خلاصہ یہ کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کا مطلب ہے: قرآن مجید ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ یہی لوگ اس ہدایت سے حقیقی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہر حال ہدی المتقین کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے

کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ ”هُدًى لِّلْعَالَمِينَ“ بھی آیا ہے۔ (تمام جہانوں کے لیے ہدایت) قرآن مجید کی ایک جامع اور اہم صفت ہے، جو سورہ آل عمران کی آیت 96 میں خانہ کعبہ اور بالواسطہ قرآن و اسلام کی عالمگیر نوعیت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ ”هُدًى لِّلْعَالَمِينَ“ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور دین اسلام دنیا کے ہر کوئی کے لیے رہنے والے ہر انسان کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں، جو کسی ایک گروہ تک محدود نہیں۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں متقی اور پرہیزگار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

متقین کے اوصاف / آخرت کا مفہوم اور عقیدہ آخرت کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِمَّا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۝ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝
اُولٰٓئِكَ عَلَىٰ هٰدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۝ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

الغیب سے مراد

الَّذِيْنَ	(وہ لوگ جو)	يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے ہیں	بِالْغَيْبِ	غیب پر
------------	-------------	--------------	-------------------	-------------	--------

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ) 'الغیب' سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے حواس اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ لغوی معنی: عربی زبان میں غیب کا مطلب ہے "پوشیدہ"، "چھپا ہوا" یا "نظروں سے اوجھل"۔ شرعی اصطلاح (مطلق غیب): وہ حقائق جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، جیسے قیامت کا دن، ماں کے پیٹ میں بچے کی مکمل تفصیلات، اور کل کیا ہوگا۔ الغیب" سے مراد وہ چھپی ہوئی اور پوشیدہ چیزیں ہیں جو انسانی حواس (آنکھ، کان وغیرہ) اور مشاہدے سے دور ہوں۔ اسلامی نظریے میں، مطلق علم غیب صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، جو مستقبل، جنت/جہنم، اور روح جیسے حقائق کا

مکمل علم رکھتا ہے۔ تاہم، اللہ نے اپنے نبیوں کو بھی غیب کی بعض خبریں عطا فرمائی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بن دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ چھ چیزیں ہیں جن پر بن دیکھے ایمان لانا ضروری ہے: اللہ پر، اللہ کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، اخروی زندگی پر اور اس بات پر کہ ہر طرح کی بھلائی اور برائی اللہ ہی کی طرف سے مقدر ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی چیز پر بھی ایمان نہ ہونے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ سِرًّا ۖ كَرِهُوا أَلْفُحْلُوحُونَ ۖ تَكِ ۖ 3 آیات مخلص مومنین کے بارے میں ہیں جو ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے ایمان والے ہیں، اس کے بعد دو آیتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے کافر ہیں اور اس کے بعد 13 آیتیں منافقین کے بارے میں ہیں جو کہ باطن میں کافر ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کا مطلب

وَيُقِيمُونَ	اور وہ قائم کرتے	الصَّلَاةَ	نماز
--------------	------------------	------------	------

(وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ) اور وہ نماز قائم کرتے ہیں" ہے۔ یہ متقین اور سچے مومنین کی دوسری بڑی صفت ہے۔ نماز قائم کرنے کا مطلب (اقامت صلاۃ): صرف نماز" پڑھنا" (ادا کرنا) اور بات ہے، لیکن نماز" قائم کرنا" (اقامت) کا مطلب ہے: نماز کو اس کے تمام ظاہری و باطنی آداب، شرائط، ارکان (رکوع، سجدہ) اور خشوع و خضوع کے ساتھ وقت پر ادا کرنا۔ نماز کو صرف ایک رسم کے طور پر نہیں، بلکہ اللہ کے حضور حاضری کے شعور کے ساتھ پڑھنا۔ نماز میں باقاعدگی اور استقامت اختیار کرنا، یعنی ہر حال میں نماز کو قائم رکھنا۔ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے غیب پر ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت بھی ضروری ہے، اس کی پہلی اور دائمی علامت بلا ناہ نماز ہے، پانچ وقت اذان سن کر نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، پھر جو شخص اطاعت پر تیار ہی نہ ہو اسے ہدایت کیسے ہو؟ اس کی کم از کم حد دن بھر میں پانچ فرض نمازوں کی بروقت اور باجماعت ادائیگی ہے۔ الا یہ کہ جماعت میں شامل نہ ہونے کے لیے کوئی شرعی عذر

موجود ہو۔ یہ دوسری شرط ہوئی۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ متقین (ڈرنے والے) غیب پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عملی طور پر اللہ کی عبادت کے پابند ہوتے ہیں اور نماز کو اپنے دل اور جسم سے قائم کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ «وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ» کا مطلب نماز کو پوری ذمہ داری اور آداب کے ساتھ قائم کرنا ہے، جو ایمان کے بعد سب سے اہم عملی رکن ہے۔

خرچ کی مختلف مدات

وَحَيًا	(اس میں) سے جو	رَزَقْنَاهُمْ	ہم نے رزق دیا انہیں
يُنْفِقُونَ	وہ سب خرچ کرتے ہیں۔		

وَحَيًا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ: ”جو کچھ ہم نے انہیں دیا“ اس سے مراد ہر نعمت ہے، مثلاً مال و اولاد، علم و عقل، قوت و صحت، عزت و وقار وغیرہ۔ ”ہر نعمت میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں۔“ ساری نعمت خرچ کرنے کا مطالبہ ہی نہیں۔ یعنی رزق سے مراد صرف مال و دولت ہی نہیں بلکہ ہر وہ نعمت ہے جو جسم یا روح کی پرورش میں مددگار ثابت ہو۔ اگر اللہ نے کسی کو علم و ہنر دیا ہے تو وہ دوسروں کو بھی سکھائے۔ جوانی اور صحت دی تو اسے جہاد میں یا ضعیفوں کی مدد کرنے میں خرچ کرے اور مال و دولت ہے تو اسے فقراء، یتیموں، مسکینوں وغیرہ پر خرچ کرے اور اس خرچ کی کم از کم حد فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ ادا کرنا ہے اور بلند تر درجہ یہ ہے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے یہ تیسری شرط ہے۔ وَحَيًا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف مدات میں سے پہلے نمبر پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطریہ سیرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائلین، محتاجوں، مہمانوں، کمزوروں، یتیموں اور بیوگان کی حاجت روائی ہے۔ اس کے بعد وقف کی مد آتی ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اس کو آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ آپ

میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کو وقت کر دو، چنانچہ وہ وقت کر دی گئی۔ اسی طرح مسجد میں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا اور دینی مدارس کا قیام بھی جِسَّارَ زَقْنُهُمْ یُنْفِقُونَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں یا نل گوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب مددات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے۔ اور باعث اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لئے جو مال خرچ کیا جائے۔ اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، نوکر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، یہ سب اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور جِسَّارَ زَقْنُهُمْ یُنْفِقُونَ کا مصداق بنتا ہے۔

تقویٰ والوں کی تین صفتیں

یعنی اس آیت میں تقویٰ والوں کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں، اول: ایمان ولیقین، دوسرے: جسمانی افعال کا صالح ہونا، تیسرے: مالی معاملات کا درست اور منشاء ربانی کے مطابق ہونا۔ ایمان سے مراد غیب پر ایمان ہے، یعنی اُن اُن دیکھی حقیقتوں پر یقین کرنا، جو نگاہ اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں، ورنہ آنکھوں دیکھی بات پر کون یقین نہیں کرتا؟ اللہ تعالیٰ کا وجود، اللہ تعالیٰ کی صفات، نبوت، وحی، فرشتوں کا وجود، قرآن مجید اور پہلی آسمانی کتابیں، آخرت کا قائم ہونا، پھر اس میں حساب و کتاب اور ثواب و عذاب، یہ سب 'غیب' کی باتیں ہیں، جو توهمات نہیں ہیں؛ بلکہ ان ساری حقیقتوں کا علم اللہ اور اس کے رسولوں کے ذریعہ ہوا ہے، جس سے زیادہ قابل الطمینان اور لائق اعتبار کوئی اور ذریعہ علم نہیں، ظاہر ہے کہ جو نظام غیبی پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ قرآن پر ایمان نہیں لاسکتا اور جو قرآن ہی پر ایمان سے محروم ہو، وہ قرآن سے فائدہ کیوں کراٹھا سکتا ہے؟ تقویٰ کی دوسری علامت اور قرآن سے فیضیاب ہونے کی دوسری شرط 'اقامت صلوٰۃ'، یعنی تمام آداب و حقوق کی

رعايت کے ساتھ نمازوں کا ادا کرنا ہے، نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس میں انسان کا پورا وجود خدا کے سامنے بچھ جاتا ہے، نگاہ کا دائرہ، زبان کے بول، اعضاء کی نقل و حرکت، غرض کہ ہر عضو حکم خداوندی اور سنت نبوی کا پابند ہے؛ پس گویا نماز ان تمام اعمالِ صالحہ کا عنوان ہے، جن کو جسم کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے، روزہ ہو، حج ہو، خلق اللہ کی خدمت ہو، جہاد ہو، دل و نگاہ اور جسم کے ایک ایک عضو کی گناہ سے حفاظت ہو، اقامتِ صلوٰۃ، گویا بدن سے انجام دیئے جانے والے ان تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔ تقویٰ کی تیسری پہچان اور قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے تیسرا ضروری وصف ”انفاق“ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، اس میں زکوٰۃ و صدقات واجب بھی شامل ہیں، صدقاتِ نافلہ بھی داخل ہیں اور ماں باپ، بیوی، بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور مہمانوں غرض خدا کے تمام ہی بندوں کے ساتھ حسن سلوک بھی، جو شخص دوسروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہ نہ ہو، وہ حرام طریقہ پر دوسرے بھائی کا مال کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ وہ یقیناً سود، جو اور کمائی کے حرام طریقوں سے بھی اپنے مال کی حفاظت کرے گا، پس گویا ”انفاق“ کے لفظ میں ’مال‘ سے متعلق شریعت کی تمام ہدایات کی طرف اشارہ ہے۔

نازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لانا ضروری ہے

وَالَّذِينَ	(اور وہ لوگ) جو	يُؤْمِنُونَ	وہ ایمان لاتے ہیں
يَمَّا	(اس) پر جو	أُنزِلَ	نازل کیا گیا
وَمَّا	اور جو	أُنزِلَ	نازل کیا گیا
		إِلَيْكَ	آپ کی طرف
		مِنْ قَبْلِكَ ۚ	آپ سے پہلے

یعنی وہ وحی الہی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ کسی پیغمبر پر اتری ہو۔ جو لوگ کسی پیغمبر پر وحی کا اثرنا ہی نہیں مانتے ان کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں۔ البتہ اب عمل اسی پر ہو گا جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ [الحجر: 9] جبکہ پہلی کتابیں اصل حالت میں موجود ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نازل شدہ سے مراد صرف قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کا بیان (توضیح و تشریح) بھی ہے جو قرآن میں موجود نہیں مثلاً نماز ادا کرنے کی ترکیب، محل زکوٰۃ اشیاء،

نصابِ زکوٰۃ اور شرحِ زکوٰۃ کی تعیین وغیرہ لاتعداد ایسے احکام و ہدایات جو قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری تھے۔ نیز وہ سابقہ انبیاء پر نازل شدہ وحی پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر نازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لانا ضروری ہے اور سابقہ انبیاء کی وحی پر اجمالاً کیونکہ قرآنی تصریحات کی رو سے ان کی کتابوں میں تحریف و تبدل ہو چکا ہے۔ یہ چوتھی شرط ہے۔

دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی

وَبِالْآخِرَةِ	اور آخرت پر	هُمْ	وہ سب	يُوقِنُونَ ○	یقین رکھتے ہیں
----------------	-------------	------	-------	--------------	----------------

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ: آخرت کا لفظ ”اول“ کے مقابلہ میں ”آخر“ کے ساتھ تاء لگانے سے بنا ہے۔ دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی، اس کا یقین ہی انسان کو نیک اعمال کرنے اور برے اعمال سے بچنے پر آمادہ کر سکتا ہے، اس لیے یہ ایمان کا بنیادی جز ہے۔ ”هُمْ“ ضمیر کے ساتھ حصر پیدا ہوتا ہے، یعنی آخرت پر صحیح یقین رکھنے والے اہل اسلام ہی ہیں۔ یہ گویا غیب پر ایمان ہی کی مزید تشریح و توضیح ہے، قرآن مجید پر تو تفصیلی ایمان مطلوب ہے، یعنی قرآن نے گزشتہ یا آئندہ کی جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کا یقین کرنا، جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، ان کو حلال اور جن کو حرام قرار دیا ہے، ان کو حرام سمجھنا بھی مومن ہونے کے لئے ضروری ہے، قرآن مجید کے کسی متحب حکم کا انکار بھی باعث کفر ہے؛ لیکن پہلی آسمانی کتابوں پر ”اجمالی ایمان“ کافی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء پر یہ کتابیں نازل فرمائی تھیں، اس کا یقین کرے؛ البتہ موجودہ حالات میں یہ کتائیں جن مضامین پر مشتمل ہیں؛ چوں کہ ان میں بہت کچھ تبدیلی اور ملاوٹ ہو چکی ہے؛ اس لئے تنہا ان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح

آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح ہے جس میں کئی طرح کے عقائد شامل ہیں مثلاً (1) مرنے پر انسان کی زندگی کا کلیتہاً خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے

گا۔ پھر اس سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا، لہذا وہ اس دنیا میں ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنے تمام اعمال کے لیے اللہ کے ہاں جواب دہ ہے (2) موجودہ نظام کائنات ابدی نہیں بلکہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم پیدا فرمائے گا جس میں تمام فوت شدہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اکٹھا کر دے گا اور فرداً فرداً ہر ایک سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔ (3) اس فیصلہ کے مطابق جو لوگ کامیاب قرار دیئے جائیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور نافرمان، کافر، مشرک وغیرہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

یوم آخرت کی تفصیلات بشمار ہیں۔ جنہیں یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ ایمان بالآخرۃ، ایمان بالغیب کا اتنا اہم جزو ہے جو انسان کو زندگی کا دھار ابد لے اور صراطِ مستقیم کی طرف آنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا ایمان بالغیب کے بعد علیحدہ طور پر بھی ذکر کر دیا گیا۔ یہ ایمان بالآخرت ہدایت قبول کرنے کے لیے پانچویں شرط ہوئی۔

آیت میں فلاح سے مراد

أُولَئِكَ	وہ (لوگ)	عَلَىٰ هُدًى	ہدایت پر ہیں
مِّن رَّبِّهِمْ	اپنے رب (کی طرف) سے	وَأُولَئِكَ	اور وہ (لوگ)
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○		ہی سب کامیاب ہونے والے (ہیں)	

فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ یعنی جن لوگوں میں بیان کی گئی صفات پائی جاتی ہیں وہ اپنے رب عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے عطائی گئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ جہنم سے نجات پا کر اور جنت میں داخل ہو کر کامل کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ (خازن) یاد رہے کہ اس آیت میں فلاح سے مراد ”کامل فلاح“ ہے یعنی کامل کامیابی متقین ہی کو حاصل ہے ہاں اصل فلاح ہر مسلمان کو حاصل

ہے اگرچہ وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو کیونکہ ایمان بذاتِ خود بہت بڑی کامیابی ہے جس کی برکت سے بہر حال جنت کا داخلہ ضرور حاصل ہوگا اگرچہ عذابِ نار کے بعد ہو۔ تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پروگرام کو لوگ نماز میں ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی آسودہ حال ہو جائے۔ پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان، اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی عذاب سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں بھی ذکر کردہ صفات کے حاملین لوگوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

کفر کی تعریف اور ازیلی کافروں کو تبلیغ کرنے کا حکم دینے
کی وجہ/مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسانوں کے تین گروہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ②

ہدایت اور گمراہی کے اعتبار سے تین گروہ

اِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
سَوَآءٌ	برابر ہے	عَلَيْهِمْ	ان پر	ءَاَنْذَرْتَهُمْ	خواہ آپ ڈرائیں انہیں
اَمْ لَمْ		یا نہ		تُنْذِرْهُمْ	آپ ڈرائیں انہیں
لَا يُؤْمِنُوْنَ (6)	نہیں وہ ایمان لائیں گے				

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا گروہ مومنین کا
ہے جو ہدایت کو ظاہر اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اسے اپناتے ہیں۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورہ
بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا

گروہ وہ ہے، جو ہدایت الہی کا ظاہر ابھی انکار کرتے ہیں اور باطن ابھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، لہذا کافر کہلاتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیسرہ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پراڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لئے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں۔ تشبیہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ بڑا خطرناک گروہ ہے۔ لَا يُؤْمِنُونَ اس سے مراد تمام کفار تو ہوں نہیں سکتے، کیونکہ بیشمار کافر دعوت کے نتیجے میں ایمان لائے اور لارہے ہیں۔ اس لیے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو کچھ کلی آیات میں مذکور چھ چیزوں کا ایمان میں سے بعض کا انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اگر یہ حق بھی ہو تو ہم اسے نہیں مانیں گے، جیسے بعض یہود مدینہ (بقرہ: 146) اور ابو جہل اور اس کے ساتھی وغیرہ (انفال: 32)۔ جب کوئی طے کر لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں تو اسے ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ سوئے ہوئے کو جگایا جاتا ہے، جاگتے ہوئے مدہوش کو کون جگا سکتا ہے؟ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈرانا بالکل فضول ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر شخص تک پہنچانا فرض ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کے علم میں کون ایمان لانے والا ہے اور کس کی قسمت میں کفر پر اصرار ہے، ہمیں ہر حال میں ڈرانے پر ثواب ملے گا اور نہ ڈرانے پر باز پرس ہوگی۔

ہمزہ تسویہ کسے کہتے ہیں؟

اس لیے فرمایا کہ ڈرانا نہ ڈرانا ان پر برابر ہے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ پر برابر ہے، یہاں ہمزہ کا معنی کیا، نہیں ہوگا، بلکہ یہ برابری کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اسے ہمزہ تسویہ کہتے ہیں۔ ہمزہ تسویہ (ء) عربی گرامر میں وہ ہمزہ ہے جو دو باتوں یا کاموں کے درمیان برابری (تساوی) پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ عموماً "نَبَوَاءٌ" کے لفظ کے ساتھ آتا ہے،

جیسے ”سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ“ (ان کے لیے برابر ہے، خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ یہ ڈرانا اور نہ ڈرانا ان کے حق میں برابر تھا، نہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے حق میں، کہ آپ ﷺ کو تو بہر حال تبلیغ دین کا اجر حاصل ہوتا، معلوم ہوا کہ دعوتِ حق رد کر دی جائے، تو یہ ان لوگوں کی محرومی ہے، جو اس دعوت کو قبول نہ کریں، داعی بہر حال اجر و ثواب کا حقدار ہوگا۔ اس لئے فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ يُنذِرُكَ أَمْ لَا يُنذِرُكَ، بیشک وہ لوگ جن کی قسمت میں کفر ہے ان کے لئے برابر ہے چونکہ ٹھنڈک کی پہچان گرمی سے، دن کی پہچان رات سے اور اچھائی کی پہچان برائی سے ہوتی ہے اسی لئے اہل ایمان کے بعد کافروں اور منافقوں کے افعال اور ان کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان کی پہچان بھی واضح ہو جائے اور آدمی کے سامنے تمام راہیں نمایاں ہو جائیں۔

دو باتیں ذہن نشین رکھنے والی

یہاں دو باتیں ذہن نشین رکھیں: (1)..... ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار یا تحقیر و استہزاء کرنا کفر ہے اور ضروریاتِ دین، اسلام کے وہ احکام ہیں، جن کو ہر خاص و عام جانتے ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نبوت، نماز، روزے، حج، جنت، دوزخ، قیامت میں اٹھایا جانا وغیرہ۔ عوام سے مراد وہ مسلمان ہیں جو علماء کے طبقہ میں شمار نہ کئے جاتے ہوں مگر علماء کی صحبت میں بیٹھنے والے ہوں اور علمی مسائل کا ذوق رکھتے ہوں، اس سے وہ لوگ مراد نہیں جو دور دراز جنگلوں پہاڑوں میں رہنے والے ہوں جنہیں صحیح کلمہ پڑھنا بھی نہ آتا ہو کہ ایسے لوگوں کا ضروریاتِ دین سے ناواقف ہونا اس دینی ضروری کو غیر ضروری نہ کر دے گا، البتہ ایسے لوگوں کے مسلمان ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ضروریاتِ دین کا انکار کرنے والے نہ ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ اسلام میں جو کچھ ہے حق ہے اور ان سب پر اجمالاً ایمان لائے ہوں۔

(2)..... ایمان سے محروم کفار کے بارے میں معلوم ہونے کے باوجود انہیں تسلیع کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا تاکہ ان پر حجت پوری ہو جائے اور قیامت کے دن ان کے لئے کوئی عذر باقی

دلوں پر مہر کیسے لگتی ہے؟

مہر کیسے کافروں کو لگتی ہے؟ اللہ تعالیٰ مہر صرف ان کافروں کے دلوں پر لگاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو خوب سمجھ لینے کے بعد محض اپنی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: آیت وَبِحُذُوٰیہَا وَاسْتَيْقَنَتْہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلُمًا

وَعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ اور ان لوگوں نے ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر (ان حقائق کا) انکار کر دیا جن پر ان کے دل یقین کر چکے تھے اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا : آیت (كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ جس بات کو پہلے ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ ان کے کفر اور اعمال بد کے نتیجے میں ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور قبول حق کی استعداد جو فطرتاً ہر شخص میں رکھی گئی ہے، ان سے چھن چکی ہے۔ یہ مہر اگرچہ اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے، مگر اس کا باعث ان کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد رکھی ہے؛ لیکن جب آدمی عناد کے جذبہ سے کسی بات کے نہ ماننے پر بہ ضد ہو جاتا ہے تو اس کی یہ استعداد آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے، اب دل میں حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، کان موجود ہیں؛ لیکن کان سے دلوں کا فاصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سنی آن سنی ہو جاتی ہے، آنکھیں موجود ہیں؛ لیکن وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر خدا تک پہنچنے سے قاصر ہیں، اسی کیفیت کا اس آیت میں ذکر ہے، ایسا نہیں ہے کہ خدا کے مہر لگانے کی وجہ سے وہ کفر پر بہ ضد ہیں؛ بلکہ جانتے بوجھتے ان کے انکار و عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے اور ان کو بے توفیق اور محروم کر دیا ہے، گویا ان کا انکار و عناد سبب ہے اور بے توفیقی اس کا نتیجہ۔ دل کا کام بات کو سمجھنا اور کان کا کام سننا ہے اور یہ دونوں اعضاء کسی مخصوص جانب کے پابند نہیں۔ لیکن آنکھ صرف سامنے سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ لہذا دلوں اور کانوں پر تو مہر کا ذکر کیا گیا اور آنکھ پر صرف پردے کا۔ ایسے لوگ حقائق کو سمجھنے کے لیے کیا تیار ہوں گے جنہیں ان کا سننا اور دیکھنا بھی گوارا نہ ہو۔ کیونکہ کان اور آنکھ ہی تو دل کے دو بڑے دروازے ہیں جن سے دل کو ہر طرح کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے آنکھیں، کان اور دل اس لیے نہیں دیئے تھے کہ وہ ان اعضاء سے صرف اتنا ہی کام لے جتنا دوسرے جیوان لیتے ہیں اور جانوروں کی طرح صرف اپنے کھانے پینے اور دنیاوی مفادات پر ہی نظر رکھے۔ کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فہم و دانش کی دوسرے جانوروں سے بہت زیادہ قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں جو انسان کی توجہ کو کائنات میں ہر سو

اللہ تعالیٰ کی بکھری ہوئی نشانیوں کی طرف مبذول کرتی ہیں۔ تاکہ انسان ان سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔ پھر اگر انسان کانوں سے قرآن کی آیات کو سننا تک گوارا نہ کرے اور کائنات میں بکھری ہوئی آیات کو آنکھوں سے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرے تو اس کی ہدایت کی کوئی صورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اس سے بھی بدتر صورت حال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی آیات سن بھی لیتے ہیں اور ان کے دل انہیں سمجھ بھی لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی چودھرا ہٹوں یا بعض دوسرے دنیوی مفادات کی خاطر حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، بلکہ الٹا مخالفت اور تعصب پر اتر آتے ہیں تو ایسے لوگوں کی آئندہ ہدایت پانے کی بھی کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے سے تعبیر فرمایا ہے اور اسی بات کی تائید درج ذیل مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

دل پر سیاہ نقطے

سیدنا ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ گناہ چھوڑ دے اور استغفار کرے اور توبہ کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ کرے تو نقطہ بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ دل پر چھا جاتا ہے اور یہی وہ زنگ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آیت کَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ مہر لگانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں؟ رہی یہ بات کہ اگر کافروں کے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے لگتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے کہ جن اعضاء یا جن قویٰ سے انسان کام لینا چھوڑ دیتا ہے یا ان کی فراہم کردہ معلومات کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو ان اعضاء اور قویٰ کی استعداد از خود زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً انسان اگر اپنے بازو سے کچھ مدت کوئی کام نہ لے اور اسے حرکت تک نہ دے تو وہ از خود شل ہو جائے گا، اس میں حرکت کرنے کی استعداد باقی ہی نہیں رہے گی اور یہ قانون بھی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا بنایا ہوا ہے۔ لہذا اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست ہوئی۔ اگرچہ یہ انسان کے اپنے ہی

شامت اعمال کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں قرآن کی عظمت اور اس کی ہدایت کو بیان کیا ہے۔ پھر متقین کی صفات بیان کی گئیں: وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ وہ ان سب کتباوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے نبی اکرم ﷺ پر اور پچھلے انبیاء پر نازل کیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس رکوع میں بنیادی طور پر ایمان، نماز، انفاق، اور آخرت پر یقین کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ حقیقی کامیابی انہی صفات کے حامل لوگوں کے لیے ہے ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دوسرے گروہ یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متقین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دوسرے گروہ کا بیان ہے اور تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہر اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں۔ اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ اللہ تبارک ہمیں ہدایت یافتہ گروہ میں شامل فرمائے۔ آمین

منافقین کا گروہ اور اس کی قسمیں / نفاق دینی بیماری ہے

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝
يُحَدِّثُونَ لِلّٰهِ وَاللَّذِينَ آمَنُوا ۖ وَمَا يُحَدِّثُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝
فَلَوْ بِهِمْ مَّرْضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ لِّمَا كَانُوا
يَكْذِبُونَ ۝
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُونَ ۝
أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝

منافقوں کا حال اور منافقین کی قسمیں

وَمِنَ النَّاسِ	اور لوگوں میں سے	مَنْ يَقُولُ	جو وہ کہتا ہے
آمَنَّا	ہم ایمان لائے	بِاللّٰهِ	اللہ پر
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	اور آخرت کے دن پر	وَمَا هُمْ	حالانکہ نہیں وہ سب
بِمُؤْمِنِينَ (8)		ایمان لانے والے۔	

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ: اور کچھ لوگ کہتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں نخلص ایمان والوں کا ذکر کیا گیا جن کا ظاہر و باطن درست اور سلامت تھا، پھر ان کافروں کا ذکر کیا گیا جو سرکشی اور عناد پر قائم تھے اور اب یہاں سے لے کر آیت نمبر 20 تک منافقوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو کہ

اندرون خانہ کافر تھے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی زبانوں سے اس طرح کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں کیونکہ ان کا ظاہر ان کے باطن کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ منافق ہیں۔ (روح البیان، البقرة تحت الآية: ۸، ۵۱/۱)

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں: (۱)..... جب تک دل میں تصدیق نہ ہو اس وقت تک ظاہری اعمال مؤمن ہونے کے لیے کافی نہیں۔ (۲)..... جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور کفر کا اعتقاد رکھتے ہیں سب منافقین ہیں۔ (۳)..... یہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے کھلے کافروں سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ منافق کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متذبذب ہوتا ہے۔ وہ ظاہر اور باطننا شک میں ہوتا ہے ایسا منافق مُذَبِّذٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَلِکَ درمیان میں ڈگمگارہے ہیں۔ یعنی منافقین کفر اور ایمان کے درمیان ڈگمگارہے ہیں کیونکہ نہ تو یہ حقیقی طور پر مؤمن اور مخلص ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور نہ واضح طور پر کافر اور صریح شرک کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم، آپ ان منافقین کے راہِ راست پر آنے کی امید نہ رکھیں کیونکہ جسے ہدایت و توفیق کی لیاقت نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لئے کوئی ایسا راستہ نہ پائیں گے جس پر چل کر وہ حق تک پہنچ سکے۔ (غازن) ایسا منافق مُذَبِّذٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَلِکَ کا مصداق ہوتا ہے ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کے اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے۔ وہ یہی اعتقادی منافق ہیں۔ جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔ تیسری قسم کا منافق وہ ہے جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں

صرف منافقین کے نام پر ہیں۔ مثلاً سورہ منافقون۔ اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورہ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

ایمان میں منافقت اور عملی منافقت

يُخٰدِعُونَ	وہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں	اللّٰه	اللّٰه	وَالَّذِينَ	اور جو (لوگ)
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَمَا يَخْدَعُوْنَ	حالانکہ وہ نہیں دھوکہ دیتے	اِلَّا	مگر
اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ کو	وَمَا يَشْعُرُوْنَ (9)	اور نہیں وہ سب شعور رکھتے۔		

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر وہ اللہ اور مومنوں سے دغا بازی کرنا چاہیں بھی تو ایسا کر نہیں سکتے۔ کیونکہ اللہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے اور ان ارادوں اور حرکات سے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعے مطلع کر دیتا ہے۔ اس طرح ان کی دغا بازی کا وبال انہیں پر پڑے گا اور وہی ذلیل و رسوا ہوں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظاہر و باطن کا تضاد بہت بڑا عیب ہے۔ یہ منافقت ایمان کے اندر ہو تو سب سے بدتر ہے اور اگر عمل میں ہو تو ایمان میں منافقت سے تو کم تر ہے لیکن فی نفسہ سخت خبیث ہے، جس آدمی کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں تضاد ہو گا تو لوگوں کی نظر میں وہ سخت قابل نفرت ہو گا۔ ایمان میں منافقت مخصوص لوگوں میں پائی جاتی ہے جبکہ عملی منافقت ہر سطح کے لوگوں میں پائی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا يُخٰدِعُونَ اللّٰه: وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ دھوکا تو وہاں دیا جاسکتا ہے۔ جہاں کوئی حالات سے ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے اسے دھوکا کیسے دیا جاسکتا ہے۔ اس اشکال کے متعلق امام بیضاوی (رحمہ اللہ) اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زبان سے کہتے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کے پیروکار اور فدائی ہیں، مگر قلب کفر سے بھر پور ہے۔ ایمان کی مقدار ایک رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اور ویسے محاورے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو اہل اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ وہ گویا خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں مقصد یہ کہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال موجود ہے ”إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ“ یعنی اے

پیغمبر! جو لوگ آپ کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔
اسی طرح فرمایا

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور اس کی رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا۔ {آیت مبارکہ کا شان نزول کچھ اس طرح ہے کہ سرور کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ایک مرتبہ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اُس نے اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے محبت کی، اس پر آج کل کے گستاخ بددینوں کی طرح اُس زمانہ کے بعض منافقوں نے کہا کہ محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یہ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں رب مان لیں جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم عَلَیْہِ السَّلَام کو رب مانا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے رد میں یہ آیت نازل فرما کر اپنے نبی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے کلام کی تصدیق فرمادی کہ بے شک رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ (بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۸۰، ۱/۳۶۲)

تو جس نے ان کی اطاعت سے اعراض کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لئے نہیں بھیجا کہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بہر صورت انہیں جہنم سے بچائیں بلکہ صرف تبلیغ کیلئے بھیجا ہے۔

نفاق کی بیماری سے بیشمار مرزید نفسیاتی بیماریاں

فِي قُلُوبِهِمْ	ان کے دلوں میں	مَرَضٌ	بیماری (ہے)
فَزَادَهُمْ	پس زیادہ کر دیا انہیں	اللَّهُ	اللہ نے

مَرَضًا	بیماری میں	وَلَهُمْ	اور ان کیلئے
عَذَابٌ	عذاب ہے	إِلَيْهِمْ	دردناک
یَمَّا	اس وجہ سے جو	كَانُوا	سب تھے
		يَكْذِبُونَ (10)	وہ جھوٹ بولتے۔

مرض سے مراد نفاق، دین اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے حد اور عناد ہے۔ پھر جوں جوں اسلام اور اہل اسلام کی شوکت بڑھتی گئی، ان کی بیماری میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس بیماری سے بیشمار نفسیاتی بیماریاں مزید پیدا ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، بد عہدی، بدزبانی جنہیں رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اسی طرح فساد، خود پسندی، بے وقوفی، دورخی جن کا ذکر آئندہ آیات میں ہے اور بہت سی دیگر بیماریاں مثلاً بزدلی، طمع، بخل، جہاد سے فرار وغیرہ جن کا ذکر سورہ توبہ اور دیگر سورتوں میں ہے۔ نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں بلکہ دین کی بیماری ہے۔ جس طرح اجسام کی بیماریاں ہوتی ہیں، اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے کی بیماری ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے۔ وہ بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے مختلف عناصر اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان کی صحت درست رہتی ہے۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ عقیدے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر بدعقیدگی، حسد، کینہ، اور گناہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے اسی لئے عربی زبان میں مرض کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کینے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اچھائی کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ ”فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ“ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خون صفر اور غصیرہ کی

ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور الحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

منافقین کے دو بڑے عیوب

وَإِذَا	اور جب	قِيلَ	کہا جائے	لَهُمْ	ان سے
لَا تُفْسِدُوا	مت تم فساد کرو	فِي الْأَرْضِ	زمین میں	در حقیقت ہم	مُصْلِحُونَ (11)
قَالُوا	وہ کہتے ہیں	إِنَّمَا نَحْنُ	اصلاح کرنے والے ہیں۔		

یہاں منافقین کے دو عیوب بیان ہوئے ہیں، فساد یعنی زمین میں بگاڑ پیدا کرنا۔ اس میں اللہ کی ہر نافرمانی شامل ہے، کیونکہ اس سے زمین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، فرمایا: **ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي الدَّائِسِ** [الروم: 41] ”خسکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔“ دوسرا عیب بگاڑ پیدا کرنے کو عین اصلاح قرار دینا۔ یہ لوگ دل میں کفر رکھنے کی وجہ سے کفار سے دوستی رکھتے تھے، مسلمانوں کے راز انھیں بتاتے اور اسلام کے عقائد و احکام پر اعتراض کرتے تھے اور منع کرنے پر اپنے اس عمل بد کو اصلاح کا نام دیتے تھے۔ **لَا يَشْعُرُونَ** دل بیمار ہو تو اچھے برے کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر آدمی اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، فرمایا: **أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا** [فاطر: 8] ”تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا بر عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟)“

ان کا فساد یہ تھا کہ ان کی دلی ہمدردیاں تو کافروں سے تھیں اور مسلمانوں میں شامل رہ کر ان کے حالات سے انہیں باخبر رکھتے اور ان کے لیے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ نئے اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو حیلوں بہانوں سے برگشتہ کرتے تھے اور جنگ کی صورت میں مسلمانوں

کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے تھے۔ فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں۔ اعتدال کی حالت کو اصلاح اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں۔ لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا۔ ان کے رازوں کا افشاء گناہوں کا اظہار، دین کی اہانت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں ان لوگوں کے نزدیک فلاح اور اصلاح ہے یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں۔ عبادت الہی کی بجائے کفر و شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی فساد ہے۔

عقیدہ و عمل کے تمام بگاڑ کی جڑ

عقیدہ و عمل کے تمام بگاڑ کی جڑ کفر و شرک ہے اور یہ کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں نت نئی سازشیں مرتب کرتے رہتے تھے، اسی کو زمین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنا فرمایا گیا ہے، ہر زمانہ میں مفسدین کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ فساد پیدا کرتے ہیں اور اس کو نام اصلاح کا دیتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی عقیدہ و عمل کے بگاڑ کی جتنی تحریکیں اٹھیں، انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا، منافقین کے اس تذکرہ میں تنبیہ ہے کہ ہر شخص جو اصلاح کا دعویٰ کرے، اس کی بات کو پرکھے اور گسے بغیر قبول نہ کر لینا چاہئے، کہ ہر چمکنے والی چیز ہیرا نہیں ہوتی۔

اصل فساد

آلَا	خبردار!	إِنَّهُمْ	بیشک وہ	هُمْ الْمُفْسِدُونَ	ہی فساد کرنے والے ہیں
وَلَكِنْ	اور لیکن	لَا يَشْعُرُونَ (12)	نہیں وہ شعور رکھتے ہیں۔		

یعنی اس لگائی بھجائی اور ان کی حرکات و سکنات سے کافروں کا بھی ان سے اعتماد اٹھ جائے گا اور ان کی حیثیت دھوبی کا ستانہ گھر کا نہ گھاٹ کا کے مصداق ہو جائے گی تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کے اعمال سراسر فتنہ و فساد پر مشتمل تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا، "آلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ" اصل فساد یہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں "وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ" مگر یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو آج

کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو یکجہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی رائج ہے اس سے فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے۔ کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ منافقوں کے طرز عمل سے یہ بھی واضح ہوا کہ عام فساد یوں سے بڑے فساد کی وہ ہیں جو فساد پھیلائیں اور اسے اصلاح کا نام دیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اصلاح کے نام پر فساد پھیلاتے ہیں اور بدترین کاموں کو اچھے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ آزادی کے نام پر بے حیائی، فن کے نام پر حرام افعال، انسانیت کے نام پر اسلام کو مسٹانا اور تہذیب و تمدن کا نام لے کر اسلام پر اعتراض کرنا، قرآن کا نام لے کر حدیث کا انکار کرنا وغیرہ سب فساد کی صورتیں ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بیان کردہ منافقت کی تینوں قسموں سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

صحابہ معیارِ حق / صحابہ کرام اور علماء دین کا مذاق اڑانے کا
حکم / بے دینیوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا
إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا
وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۖ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ۝ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

النَّاسُ سے مراد

وَإِذَا	اور جب	قِيلَ	کہا جائے	لَهُمْ	ان سے
آمِنُوا	تم ایمان لاؤ	کَمَا	جس طرح	آمَنَ	ایمان لائے
				النَّاسُ	لوگ

النَّاسُ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو غلو سے ایمان لائے اور ایک ہی
طرف کے ہو گئے اور اپنے کسی دنیوی نقصان کی پروا نہ کی، منافقین نے انھیں یہ یوقف کہا اور اپنے
آپ کو عقل مند، کیونکہ اپنے خیال میں انھوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دنیا کا
نقصان نہ ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین ہی کو یہ یوقف قرار دیا، کیونکہ ان کا نہ مسلمانوں کے ہاں کچھ

اعتبار رہا نہ کفار کے ہاں اور وہ چند روزہ زندگی کے فائدے کے لیے ہمیشہ کی زندگی کا نقصان کر بیٹھے۔ فرمایا یہ ایسے بیوقوف ہیں جنہیں اپنی بے وقوفی کا بھی علم نہیں۔ اس آیت سے صحابہ کرامؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ منافقین کو ان کے ایمان جیسا ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

جدید، قدیم منافقین کی تردید

قَالُوا	وہ کہتے ہیں	أَتُؤْمِنُ	کیا ہم ایمان لائیں	كَمَاءً	جس طرح
أَمِنَ السُّفَهَاءُ	ایمان لائے بے وقوف	آلَا	خبردار	إِنَّهُمْ	بیشک
هُمْ السُّفَهَاءُ	وہی بے وقوف ہیں	وَلَكِنْ	اور لیکن		
لَا يَعْلَمُونَ (13)	نہیں وہ جانتے۔				

ان منافقین نے ان صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو ”بے وقوف“ کہا، جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان و مال کی کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور آج کے منافقین یہ باور کراتے ہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) دولت ایمان ہی سے محروم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جدید و قدیم دونوں منافقین کی تردید فرمائی۔ فرمایا کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے دنیوی مفادات کو قربان کر دینا، بے وقوفی نہیں، عین عقل مندی اور سعادت ہے۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اسی سعادت مندی کا ثبوت مہیا کیا ہے، اس لئے وہ پکے مومن ہی نہیں، بلکہ ایمان کے لئے ایک معیار اور کسوٹی ہیں، اب ایمان ان ہی کا معتبر ہو گا جو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ہی کی طرح ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ، جیسے دوسرے مسلمان ایمان لائے ہیں کیونکہ فلاح کا دار و مدار اسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ، شہوات نفسانیہ، ریا کاری، طلب جاہ وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں، کسی باطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دل کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول کرو۔ دوسرے مقام پر آتا ہے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا“ اے ایمان والو! ایمان لاؤ یعنی محض

زبانی کلامی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

ایمان پر ثابت قدم رہو

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ { یہاں اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا: اٰمِنُوْا، ایمان لاؤ، اگر یہ خطاب حقیقی مسلمانوں کو ہے تو اس کا معنی ہوگا کہ ایمان پر ثابت قدم رہو۔ اور اگر یہ خطاب یہود و نصاریٰ سے ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ اے بعض کتابوں اور بعض رسولوں پر ایمان لانے والو! تم مکمل ایمان لاؤ یعنی تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر جن میں قرآن اور محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم بھی داخل ہیں۔ اور اگر یہ خطاب منافقین سے ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اے ایمان کا ظاہری دعویٰ کرنے والو! اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ۔ یہاں جو فرمایا گیا کہ رسول اور کتاب پر ایمان لاؤ تو رسول سے سید الانبیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اور کتاب سے قرآن پاک مراد ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل ایمان کا لفظ حقیقی معنی کے اعتبار سے موجودہ زمانے میں صرف مسلمانوں پر بولا جاسکتا ہے، کسی اور مذہب والے پر خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اس لفظ کو نہیں بول سکتے۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تم اللہ عَزَّ وَجَلَّ پر اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پر اور قرآن پر اور اس سے پہلی ہر کتاب اور رسول پر ایمان لاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر عمل صرف قرآن شریف پر ہی ہوگا۔ ان کتابوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں۔

امت کے لیے نمونہ

اسی سورہ بقرہ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنُتُمْ بِہٖ فَقَدْ اٰهْتَدَوْا اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے یہاں سے معیار حق ہونے والی بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم معیار حق ہیں یہ اصحاب کیا اگرچہ نبی کی طرح معصوم تو نہیں مگر محفوظ ہیں اور امت کے لیے نمونہ ہیں بِمِثْلِ مَا اٰمَنُتُمْ بِہٖ: تمہارے ایمان کی

طرح۔ یہودیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح ایمان لانے کا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایمان بارگاہ الہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال ہے۔

معیار حق سے مراد

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی وجہ سے ان خرابیوں سے محفوظ تھے جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں معیار حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں فرمایا ہے: "لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا"۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: تاکہ ہو جاؤ تم لوگوں کو بتانے والے اور معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نمونے کی جماعت تیار کر کے ان سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے حضور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق یہ بھی فرمایا خدا کی زمین پر تم اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم برائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں برا ہوگا۔ اے صحابہ! تم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ نے یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا "یعنی اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلب و زبان پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے۔ کیا وہ معیار حق نہ ہوگا؟ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے جو خلوص سے بھرپور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اسلام لانے کے ظاہری فوائد

وَإِذَا	أُورِجَ	لَقُوا	وہ ملتے ہیں	الَّذِينَ	(اُن لوگوں سے) جو
---------	---------	--------	-------------	-----------	-------------------

اٰمَنُوْا	ایمان لائے	قَالُوْا	وہ کہتے ہیں	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے
-----------	------------	----------	-------------	----------	---------------

جو مسلمان سماج میں ذی وجاہت تھے، جیسے حضرت ابو بکر، حضرت عمرؓ وغیرہ، ان سے خوشامد میں اپنے پکے مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے؛ تاکہ اسلام کے ظاہری فوائد سے محروم نہ ہوں۔ یعنی اسلام کے جو ظاہری فوائد ہیں، جان، مال، کی حفاظت، مالِ غنیمت میں حصہ داری اور نکاح کا تعلق، وہ ہم مسلمانوں سے حاصل کر رہے ہیں۔

شیاطین سے مراد

وَ اِذَا	اور جب	خَلَوْا	اکیلے ہوتے ہیں	اِلٰی شَیْطٰنِیْنِہُمْ	اپنے شیطانوں کے پاس
قَالُوْا	وہ کہتے ہیں	اِنَّا	بیشک ہم	مَعَكُمْ	تمہارے ساتھ ہیں
اِنَّمَا	درحقیقت	نَحْنُ	ہم	مُسْتَهْزِءُوْنَ (14)	مذاق کرنے والے ہیں۔

شیاطین سے مراد کفر کے سردار ہیں، خواہ مشرکین و یہود سے ہوں یا خود ان منافقین سے۔ شیطان ہر سرکش اور فسادی شخص کو کہتے ہیں، شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں سے ہوتے ہیں، فرمایا: (وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیْطٰنِیْنَ الْاِنْسِی وَالْجِنِّ یُوحِیْ بَعْضُہُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا) [الانعام: 112] ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنادیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔“ لفظ شیطان شَطْن سے مشتق ہے جس کے معنی بُعَد کے ہیں، یعنی وہ جو ہر خیر سے دور ہو۔ شیطان ”حق سے دور اور سرکش کو کہا جاتا ہے، خواہ انسان ہو یا جنات، قرآن مجید میں یہ لفظ گرجہ شیاطین جنات کے لئے زیادہ استعمال ہوا ہے؛ لیکن سرکش انسانوں کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے، یہاں شیاطین سے منافقین کے سردار اور ان کے خاص رفقاء مراد ہیں۔ وَ اِذَا الْقَوَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا) اس سے ظاہر ہے کہ اہل ایمان سے ان کی ملاقات سرسری ہوتی ہے، کبھی کسی مجلس میں، کبھی سر راہ، مگر اپنے شیطانوں کے ساتھ اہتمام کے ساتھ خلوت ہوتی ہے۔ پھر اہل ایمان کو تاکید کے کسی لفظ کے بغیر صرف ”اٰمَنَّا“ کہتے ہیں اور اپنے شیاطین کو ”اِنَّا“

اور ”اٰمَنَّا“ کی تائید کے ساتھ اپنے کفر کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم عقیدے میں بلا شک و شبہ تمہارے ساتھی ہیں، رہا ہمارا ایمان کا اقرار و اظہار تو وہ محض مذاق ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور پیشوایان دین کا مذاق اڑانا منافقوں کا کام ہے۔ آج کل بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی مجلسوں اور مخصوص لوگوں میں ”علماء و صلحاء“ اور ”دینداروں“ کا مذاق اڑاتے اور ان پر بھبتیاں کتے ہیں اور جب ان کے سامنے آتے ہیں تو منافقت سے بھر پور ہو کر خوشامد اور چاپلوسی کرتے ہیں اور تعریفوں کے پل باندھتے ہیں، یونہی ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں مذہب اور مذہبی نام سے نفرت ہے اور مذہبی حلیہ اور وضع قطع دیکھ کر ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ یاد رہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور دین کا مذاق اڑانا کفر ہے، یونہی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بے ادبی گمراہی ہے، اسی طرح علم کی وجہ سے علماء دین کا مذاق اڑانا کفر ہے ورنہ حرام ہے۔

منافقانہ عمل کی سزا

اَللّٰهُ	اللہ	يَسْتَهْزِئُ	مذاق اڑاتا ہے	يَهْمُ	اُن کا
وَيَمْدُّهُمْ	اور وہ ڈھیل دے رہا ہے اُنہیں	فِي طُعْيَانِهِمْ	اپنی سرکشی میں		
يَعْمَهُونَ (15)			وہ اندھے ہو کر بھٹک رہے ہیں۔		

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس منافقانہ عمل کی سزا ان کو دے رہے ہیں کہ ان کو ڈھیل دیتے جا رہے ہیں؛ تاکہ وہ حق تک رسائی سے مسلسل محروم رہیں اور سخت سزا کے حقدار ہو جائیں، قرآن کی بعض آیات میں بعض اوصاف ذمیرہ مثلاً استہزاء مکروہ و رذع کی اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت کی گئی ہے، یہ محض اہل عرب کے محاورہ کی وجہ سے ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن اہل عرب اور بالخصوص قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہوا ہے۔ ایسے افعال اللہ تعالیٰ کی طرف کبھی اکیلے منسوب نہیں ہوتے بلکہ کافروں کے افعال کے جواب کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ عرف عام میں ایسی صورت کو مشاکلہ کہتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسے اوصاف سے پاک ہے۔ ایسے عرب

محاوروں کی ایک مثال درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا كِي تَشْرَحُ

”جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا“ کہ برائی کے بدلہ اسی کے مثل برائی درست ہے، ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ برائی، نہیں؛ مگر تقابل کے طور پر اس کو بھی ’برائی‘ کہا گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل مذاق اڑانے کی سزا ہے نہ کہ خود مذاق اڑانا؛ لیکن یہ طور محاورہ اس کو بھی ’استہزاء‘ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے حالانکہ جو برائی کا بدلہ لے اسے برائی نہیں بلکہ انصاف کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن محاوروں میں برائی کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے جواباً مذاق اڑانے سے مراد منافقوں کو ان کے استہزاء کا پورا پورا بدلہ دینا ہے، نہ کہ ان کی طرح کا مذاق اڑانا۔ مگر محاورہ میں استہزاء کا لفظ ہی جواب کے طور پر استعمال ہو گا اور اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء کا جواب اس صورت میں دے گا کہ عنقریب ان کے سارے پول کھول دے گا۔ جس سے یہ لوگ دنیا میں ذلیل و رسوا ہوں گے اور آخرت میں عذاب الیم سے دو چار ہوں گے۔ اس طرز کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے تمسخر کا نقصان انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے تمسخر کا ضرر خود انہی کی طرف جاتا ہے۔ وہ خدا کو کیا ضرر پہنچائیں گے۔ نبی (علیہ السلام) اور مومنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ ان کے ضرر سے بچ سکیں اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کا یہی مطلب ہے۔ استہزاء منجانب اللہ کا ایک اور مطلوب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہئے۔ چونکہ منافقین محض زبانی دعوے کی بنیاد پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ اچھا ان کو ایسا کرنے دو۔ وہ نمازیں پڑھیں، صدقہ دیں، جہاد میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں لہذا ان کے ساتھ بھی

وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہئے۔ یہ بھی گویا ان کے ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔ منافقین کا مسلمانوں کو بے وقوف کہنا اور کفار سے اظہارِ تکبر کرنا اپنی نجی محفلوں میں تھا جبکہ مسلمانوں سے تو وہ یہی کہتے تھے کہ ہم مخلص مومن ہیں، اسی طرح آج کل کے گمراہ لوگ مسلمانوں سے اپنے فاسد خیالات کو چھپاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کی کتابوں اور تحریروں سے ان کے راز فاش کر دیتا ہے۔ بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے: یاد رہے کہ اس آیت سے مسلمانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہیں اور ان کی چکنی چڑی باتوں سے دھوکا نہ کھائیں۔

ہدایت کے بدلے گمراہی / اعتقادی اور عملی منافق

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهٰدِي ۖ فَمَا رِيحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ ۝
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ
بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ اَلَّا يُبْصِرُونَ ۝ صُمُّ بُكْمٌ عُمْىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝
أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٌ وَّرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۖ يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ
اْذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِيْنَ ۝ يَكَاذِبُ الْبَرْقُ
يَخْتَفُ ابْصَارَهُمْ ۗ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۖ وَاذَّآ اظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۗ
وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

سراسر گھائے والی تجارت

اُولَٰئِكَ	یہ (وہ لوگ ہیں)	الَّذِينَ اشْتَرُوا	جنہوں نے خرید لیا
الضَّلٰلَةَ	گمراہی کو	بِالْهٰدِي	ہدایت کے بدلے میں
فَمَا	پس نہ	رِيحَتْ	فائدہ پہنچایا
وَمَا	اور نہ	تِجَارَتُهُمْ	اُن کی تجارت نے
		مُهْتَدِيْنَ (16)	ہدایت پانے والے
		وہ سب تھے	

فرمایا "اُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهٰدِي" یہی وہ لوگ ہیں یہاں تجارت سے

مراد ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے۔ جو سراسر گھائے کا سودا ہے۔ منافقین نے نفاق کا جامہ پہن کر ہی گھائے والی تجارت کی۔ لیکن یہ گھانا آخرت کا گھانا ہے ضروری نہیں کہ دنیا ہی میں اس گھائے کا انہیں علم ہو جائے۔ بلکہ دنیا میں تو اس نفاق کے ذریعے سے انہیں جو فوری فائدے حاصل ہوتے تھے، اس پر وہ بڑے خوش ہوتے اور اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بہت دانا اور مسلمانوں کو عقل فہم سے عاری سمجھتے تھے۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بدعتیگی اور گمراہی کو اختیار کیا۔ ”فَمَا زِيحَتْ تَبَجَّرَ لِيْهِمْ“ پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا۔ ”وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ“ اور انہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔ یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔

ابدی خسارے میں مبتلا لوگ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے کہ یہ تمہاری پونجی ہے اس کے ساتھ اعمال خریدو اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادوں کی تپش پڑ رہی ہے۔ اور یہ برف پگھلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے پگھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لو گے تو یہ عمر کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے بدلے کفر، شرک، بدعتیگی، معاصی اور لہو و لعب خریدا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں مبتلا ہو جاؤ گے، اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہر بلائیں خریدے۔ (زہر بلائیں کا مطلب انتہائی شدید قاتل اور فوری اثر کرنے والا زہر ہے۔ یہ مرکب دو الفاظ زہر اور بلائیں (یعنی سخت زہر) کا مجموعہ ہے، جو اردو و شاعری اور نثر میں ہلاکت خیزی کی انتہا، یا انتہائی خطرناک صورتحال کو بیان کرنے کے لیے بطور محاورہ استعمال ہوتا ہے اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر خدا نخواستہ اس نے زہر کو پسند کیا تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ ”وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ“ اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ

ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

تاریکی اور روشنی کی مثال

مَثَلُهُمْ	ان کی مثال	کَمَثَلِ	(اس شخص کی) مثال کی طرح ہے
الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا	جو خوب بھڑکائے آگ		

اسْتَوْقَدَ نَارًا "اَوْقَدَ نَارًا" کے معنی ہیں اس نے آگ جلائی۔ "اسْتَوْقَدَ" میں سین اور تاء زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے اس کا ترجمہ "خوب بھڑکائی" کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا	پس جب	أَصْأَتْ	اس نے روشن کر دیا	مَا حَوْلَهُ	جو اس کے ارد گرد ہے
ذَهَبَ اللَّهُ	لے گیا اللہ	يُنْوِرُهُمْ	اُن کی روشنی کو		
وَتَرَهُمْ	اور اس نے چھوڑ دیا انہیں	فِي ظُلُمَاتٍ	اندھیروں میں		
لَا يُبْصِرُونَ (17)			نہیں وہ دیکھ پاتے ہیں۔		

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور دیگر صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے: کہ نبی (ﷺ) جب مدینہ تشریف لائے تو کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، لیکن پھر جلد ہی منافق ہو گئے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں تھا، اس نے روشنی جلائی جس سے اس کا ماحول روشن ہو گیا اور مفید اور نقصان دہ چیزیں اس پر واضح ہو گئیں، دفعتاً وہ روشنی بجھ گئی، اور وہ حسب سابق تاریکیوں میں گھر گیا۔ یہی حال منافقین کا تھا۔ پہلے وہ مشرک کی تاریکی میں تھے، مسلمان ہوئے تو روشنی میں آ گئے۔ حلال و حرام اور خیر و شر کو پہچان گئے، پھر وہ دوبارہ کفر و نفاق کی طرف لوٹ گئے تو ساری روشنی جاتی رہی۔ (فتح القدیر) تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں انھیں مسلمانوں والی عزت حاصل ہوئی، مسلمانوں کے ساتھ ان کے رشتے ناتے رہے، وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے، مال غنیمت اور دوسرے بیشمار فوائد حاصل کرتے رہے، مگر جب فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عزت چھین لی، جیسے اس آگ والے سے اس کی روشنی چھین لی اور انھیں بہت سے اندھیروں (یعنی قبر، یوم محشر اور جہنم کے عذاب) میں چھوڑ دیا۔ (طبری عن

ابن عباس (سند حسن) مطلب یہ ہے کہ منافقوں کو خود نو رصداقت دیکھنا گوارا نہیں تو اللہ نے بھی انہیں تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنا یعنی ”ایمان کی بجائے کفر اختیار کرنا“ نہایت خسارے اور گھائے کا سودا ہے۔

بہرے، گونگے اور اندھے

صُمٌّ	بہرے	بُكْمٌ	گونگے	عُمًى	اندھے	فَهْمٌ	پس وہ
لَا يَزِجُجُونَ (18)				نہیں لوٹیں گے			

صُمٌّ بہرے ”أَصَمٌّ“ کی جمع ہے۔ بُكْمٌ (گونگے) ”أَبْكَمٌ“ کی جمع ہے اور عُمًى (اندھے) ”أَعْمًى“ کی جمع ہے۔ ان کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کان، زبانیں یا آنکھیں ہیں ہی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَآبْصَارًا وَآفِئَةً فَمَا أَعْلَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفِئَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ [الاحقاف: 26] ”اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ فَهُمْ لَا يَزِجُجُونَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس پلٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ یعنی وہ اس گمراہی سے جو خرید بیٹھے اور اس ہدایت کی طرف جسے فروخت کر بیٹھے واپس نہیں لوٹتے۔ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ واپس آ کر کوئی نئی کسائی کر لے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدیل نہیں ہو سکے گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں منسوخ بھی کر دی جاتی ہیں۔ مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیے گئے اعمال میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکے گا۔ ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے مومن اور دل میں پکے کافر تھے۔ اسلام کے بارے میں تمام منافقین کی سوچ یکساں تھی، بعض تو قبول حق کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھے، گویا ان کے کان تھے؛ لیکن حق کو قبول کرنے سے محروم اور بہرے، زبان تھی؛

لیکن حق کے اقرار و اعتراف سے عاجز، آنکھیں تھیں؛ لیکن حق کے ادراک کی صلاحیت سے قاصر، یہ کفر میں زیادہ سخت تھے اور یہ مثال ان ہی لوگوں کی ہے، کہ نبوت کا نور ان کے سامنے دوپہر کے آفتاب کی طرح روشن تھا؛ مگر انھوں نے اپنے آپ کو اس کی روشنی سے محروم رکھا تھا۔ یعنی ان منافقوں کی حالت یہ ہو گئی کہ یہ حق بات سننے کے لیے بہرے، حق کہنے کے لحاظ سے گونگے ہیں اور حق سامنے موجود ہو تب بھی انہیں نظر نہیں آتا۔

بارش سے مراد/ اندھیروں اور گرج سے مراد

اَوْ كَصَيْبٍ	یابارش کی طرح	مِّنَ السَّمَاءِ	آسمان سے	فِيهِ	اس میں
ظُلُمْتُ	اندھیرے	وَرَعْدٌ	اور گرج	وَبَرْقٌ	اور بجلی
يَجْعَلُونَ	وہ ڈال لیتے ہیں	اَصَابِعَهُمْ	اپنی انگلیاں		
فِيْ اِذَائِهِمْ	اپنے کانوں میں	مِّنَ الصَّوَاعِقِ	کڑکوں (کی وجہ) سے		
حَذَرَ الْمَوْتِ ط	موت کے ڈر سے	وَاللّٰهُ	اور اللہ		
مُحِيْطٌ	گھیرنے والا ہے	بِالْكَافِرِيْنَ (19)	کافروں کو۔		

بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں اور گرج سے مراد وہ تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں پیش آتی ہیں، چمک سے مراد مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں اور کڑکنے والی بحبلیوں سے مراد جہاد کے احکام ہیں، جن میں منافقین کو موت دکھائی دیتی ہے۔ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافقین کے دوسرے گروہ کی بیان فرمائی ہے، یعنی وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ضعف ایمان کی وجہ سے ہمیشہ شک اور تذبذب میں مبتلا رہتے تھے، راحت و آرام کی صورت میں مطمئن نظر آتے، جب تکالیف کا سامنا ہوتا تو شک و شبہ میں پڑ جاتے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ اعتقادی منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے۔ بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔ منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ دل میں نور ایمان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، پیغمبر (علیہ السلام) کی رسالت اور قیامت پر ایمان ہے۔

عملى منافق كى نشانىاں

مگر ظاہر اور باطن ميں مطابقت نہيں پائی جاتی۔ حضور ﷺ نے عملى منافق كى بہت سى نشانىاں بتائی ميں مثلاً وَإِذَا أُوْتِئِمِّنْ خَانَ۔ ”جب اس كے پاس امانت كھی جائے تو خيانت كرتا ہے۔“ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، ”جب كسى سے جھگڑا كرتا ہے تو گالى گلوچ پر اتر آتا ہے۔ اور“ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، جب وعدہ كرتا ہے تو خلاف ورزى كرتا ہے۔ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، جب بات كرے تو جھوٹ بولے، ايسا شخص اعتقادى نہيں بلکہ عملى منافق ہے۔ اللہ تعالٰی كے عايد كردہ فرائض نماز، روزہ وغيرہ كو فرض سمجھتے ہوئے انہيں بجا نہيں لاتا۔ ايسے عملى منافقوں سے دنيا بھرى پڑى ہے۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالٰی لکھتے ميں: دين اسلام ميں آخر سب نعمت ہے، مگر اول كچھ محنت ہے، جيسے باش كہ آخر اسى سے آبادى ہے اور اول كڑك ہے اور بنگلى ہے۔ منافق لوگ اول سختى سے ڈر جاتے ميں اور ان كو آفت سامنے نظر آتى ہے اور جيسے بادل كى چمك ميں كچھ اجالا ہوتا ہے اور كھي اندھيرا، اسي طرح منافق كے دل ميں كھي اقرار ہے كھي انكار۔

دوسرى قسم كے منافقوں كى مثال

يَكَاذِبُ الْبَرِّقُ	وہ قريب ہے بنگلى	يَخْطُفُ	وہ اچك لے
أَبْصَارُهُمْ	أَنْ كى بصارت كو	كَلَمًا	جب
لَهُمْ	أَنْ كے لئے	وہ چل پڑتے ميں	فِيهِ
وَإِذَا	اور جب	أَظْلَمَ	عَلَيْهِمْ
قَامُوا	وہ كھڑے ہو جاتے ميں	وَلَوْ	اور اگر
لَذَهَبَ	البتہ لے جائے	بِسْمِعِهِمْ	أَنْ كى سماعت (كو)
وَأَبْصَارِهِمْ	اور اُن كى بصارت (كو)	إِنَّ اللَّهَ	بيشك اللہ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چيز پر	قَدِيرٌ (20)	خوب قدرت والا ہے۔

یہ ایک دوسری قسم کے منافقوں کی مثال بیان کی گئی ہے۔ پہلی قسم کے منافق تو وہ تھے جن کے دل میں کفر ہی کفر تھا۔ مگر مفاد پرستی کی خاطر مسلمانوں کے سامنے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے، اور یہ دوسری قسم ان منافقوں کی ہے جو شک اور تذبذب کا شکار ہیں۔ اس مثال میں زور دار مینہ سے مراد اسلامی احکامات کا نزول ہے جو پے در پے ہو رہے تھے اور جو جملہ انسانیت کے لیے رحمت ہی رحمت تھے اور اس میں تاریکیوں اور کڑک سے مراد وہ مصائب و مشکلات ہیں جو مسلمانوں کو اقامت دین کے سلسلہ میں پیش آرہی تھیں اور چمک سے مراد وہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہو رہی تھیں۔ اب جب کوئی کڑک کی آواز یا مصیبت مسلمانوں کو درپیش ہوئی تو یہ منافق اپنی جان بچانے کی خاطر مسلمانوں سے الگ ہو کر حفاظتی اقدامات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس صورت میں بھی ان کو ہلاک کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور مسلمانوں کی کامیابی اور ان کی مسلمانوں سے علیحدگی ہی ان کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ پھر جب معاملہ ذرا سہل ہو جاتا ہے اور مصائب چھٹ جاتے ہیں تو یہ لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور جب کوئی سخت احکام نازل ہوتے ہیں تو وہیں ٹھٹک کر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو پہلی قسم کے منافقوں کی طرح ان کی بصارت اور سماعت کو بھی سلب کر سکتا تھا۔ مگر اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص جس حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہے۔ اسے اس حد تک سننے اور دیکھنے دیا جائے، اگر چہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں اس امر کی تنبیہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اپنی دی ہوئی صلاحیتوں کو سلب کر لے۔ اس لیے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے گریزاں اور اس کے عذاب اور مواخذے سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اور وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

دلائل توحید و ربوبیت تین بڑی اقسام میں / قرآن کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ يٰۤاَيُّهَا
النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۖ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً
فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا ۗ لَقَدْ اَلَمْنَۤا عَلٰى عَبْدِنَا فَاَتٰوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَاَدْعُوْا
شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ

یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ	اے لوگو	اعْبُدُوْا	تم عبادت کرو	رَبَّكُمُ	اپنے رب کی
الَّذِيْ	جس نے	خَلَقَكُمْ	پیدا کیا تمہیں	وَالَّذِيْنَ	اور (اُن لوگوں کو بھی) جو
مِنْ قَبْلِكُمْ	تم سے پہلے تھے	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم	تَتَّقُوْنَ (21)	سب بچ جاؤ

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے، اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ لہذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ نبی ﷺ پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص حد کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا مضمون خود قرآن کریم اس کی حقانیت اور اس کا وحی الہی ہونا ہے۔ جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وحی الہی ہے۔ کیونکہ یہاں پر انسانی عقل و شعور کام نہیں کر سکتے۔ انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الہی ہے۔ اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔ قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھے اور برے نتیجے کا دار و مدار روز قیامت پر ہے اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوں گی۔ نسیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔ اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دو چار ہوگا۔ لہذا یہ اہم مضمون بھی یہاں بیان ہوا ہے۔ اس سے پہلی آیت تک تو تمہید تھی کہ قرآن جو ہدایت کا اصلی سرچشمہ ہے اسے ماننے اور نہ ماننے کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہیں، اب آگے براہ راست خطاب کے ساتھ تمام لوگوں کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جا رہی ہے جو اس کتاب کی دعوت کا حقیقی مقصد ہے، جس کے لیے کتابیں اتاری گئیں اور انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے وہ ہے دعوت توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی عبادت اور دعائیں کسی کو شریک نہ کرنا۔ عبادت اُس انتہائی تعظیم کا نام ہے جو بندہ اپنی عبدیت یعنی بندہ ہونے اور معبود کی اُلُوہیت یعنی معبود ہونے کے اعتقاد اور اعتراف کے ساتھ بجالائے۔ یہاں عبادت توحید اور اس کے علاوہ اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔ کافروں کو عبادت کا حکم اس معنی میں ہے کہ وہ سب سے بنیادی عبادت یعنی ایمان لائیں اور اس کے بعد دیگر اعمال بجالائیں۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ بتا کہ تمہیں پرہیزگاری ملے تقویٰ گناہ سے بچنا بھی ہے اور عذاب سے بچنا بھی، یہاں بھی دونوں مراد لئے گئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو عبادت یا اور کسی چیز سے نفع حاصل ہو۔

توحید اور وجود الہی پر دلائل

توحید کے لیے پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ میں تمہارا رب ہوں جو تمہاری پرورش کر رہا ہے اور تمہاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔ دوسری دلیل اس کی وہ نعمت ہے جو رب ہونے سے بھی پہلے کی ہے اور وہ ہے تمہیں پیدا کرنا۔ باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں قرآن مجید اس دلیل پر بہت زور دیتا ہے اور اسے بار بار دہراتا ہے۔ اس لیے کہ کفار بھی مانتے تھے کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، فرمایا: وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُولُنَّ اللّٰهُ [الزخرف: 1] اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ سرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کسی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت! وجود الہی پر کوئی دلیل لائیں۔ اتفاق کی بات کہ سامنے تو ت کا درخت تھا۔ امام صاحب فرمانے لگے (1۔ تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 58) یہ تو ت کا درخت خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے۔ دیکھو اس درخت کے پتوں کا ذائقہ، مزہ اور بو یکساں ہے۔ مگر ریشم کا کیڑا اس پتے کو کھا کر ریشم نکالتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرتی ہے۔ بکری کھائے تو میٹگیان نکالتی ہے۔ اور ہرن کھائے تو کستوری پیدا ہوتی ہے۔ بتاؤ یہ خدا تعالیٰ کا کام نہیں تو اور کس کا کام ہے۔ چار مختلف چیزیں ایک ہی پتا کھاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت نامہ کا شاہکار ہے کہ چاروں چیزوں کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا۔ فرمانے لگے (2۔ تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 59) کہ انڈہ قلعہ کی مانند ہے۔ اوپر سے سفید اور چکنا اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ یہ اچانک پھٹتا ہے تو اس سے سمیع و بصیر جو ان نکلتا ہے۔ یہ خوبصورت جانور کون نکالتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سوا اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ہی مصنوعات پر غور کرنے سے اس کی قدرت، حکمت، خالقیت اور ربوبیت کے رموز سمجھ میں آتے ہیں۔ لہذا اگر خدا تعالیٰ کی صفت سمجھ میں آگئی تو پھر عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔ ربوبیت یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق، مالک، مدبر اور کارساز ہونے پر دلائل انسان کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور کائنات میں بھی۔ متعدد نصوص اور اہل علم کی تصریحات واضح کرتی ہیں کہ اللہ نے انسان کو اپنی

ربوبیت پہچاننے کے لیے بے شمار نشانیاں عطا کی ہیں۔ انسان جب اپنے آپ میں غور کرے تو اسے ربوبیت الہی کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ کیونکہ نفس انسانی ایک عظیم نشانی ہے جو اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ ہی خالق ورب ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق کے مقاصد

الَّذِي	جس نے	جَعَلَ	بنایا	لَكُمْ	تمہارے لئے
الْأَرْضَ	زمین کو	فِرَاشًا	بچھونا	وَالسَّمَاءَ بَنَاءً	اور آسمان کو چھت
وَأَنْزَلَ	اور اُس نے اتارا	مِنَ السَّمَاءِ	آسمان سے	مَاءً	پانی
فَأَخْرَجَ	پھر اس نے نکالا	يَهْ	اُس کے ذریعے	مِنَ الشَّجَرِ	پھلوں سے
رِزْقًا	رزق	لَكُمْ	تمہارے لئے	فَلَا تَجْعَلُوا	پس مت تم بناؤ
يَلَهُ	اللہ کیلئے	أَنْدَادًا	شریک		
وَأَنْتُمْ	حالانکہ تم	تَعْلَمُونَ (22)	سب جانتے ہو۔		

فرمایا: الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا زمین کو فرش بنانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو رہائش کے لائق بنایا، اگر زمین دلدلی ہوتی تو انسان کا اس پر قیام دشوار ہو جاتا، جیسا کہ فضاء کے بعض سیاروں کی سطح کے بارے میں بتایا جاتا ہے، ”سما“ (آسمان) میں فضاء بھی داخل ہے، چھت کا کام حفاظت ہے، اسی طرح فضاء میں مختلف سیاروں اور بالخصوص سورج سے زمین کی طرف آنے والی مہلک اور نقصان دہ آلائشوں کو جذب کر لینے اور تحلیل کر دینے کی صلاحیت ہے، یہ زمینی مخلوقات کی حفاظت کا ایک قدرتی نظام ہے، غالباً اسی پس منظر میں آسمان کو چھت کہا گیا ہے۔ عربی زبان میں ’سما‘ کے معنی بادل کے بھی ہیں اور ابن کثیر کے بقول یہاں ’بادل‘ ہی مراد ہے؛ اس لئے آسمان کے بجائے ’بادل‘ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

یعنی تمہیں اور تمہارے باپ دادا کو پیدا کرنے کے بعد تمہاری ضروریات کے لیے تمہیں کسی دوسری ہستی کے سپرد نہیں کر دیا، بلکہ ہر چیز کا بند و بست خود فرمایا، زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا،

آسمان کو چھت بنایا، پھر آسمان سے پانی اتار کر تمہاری روزی کے لیے مختلف انواع کے پھل پیدا کیے۔ جب تم یہ سب کچھ جانتے ہو تو لازم ہے کہ اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، یا پھر اس کی زمین سے نکل جاؤ اور اپنے کسی داتا یا دستگیر کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر اور اس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے رہو اور اسی کا پیدا کیا ہوا رزق کھاؤ۔

ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں

قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہے، کائنات کی ایک ایک شے تو حید خداوندی کی دلیل ہے اور اس کے خالق کے ایک اور یکتا ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس آیت میں آسمان وزمین کی تخلیق، ستاروں کا منظم نظام اور کائنات کی ہم آہنگی اللہ کی ربوبیت کا قوی ثبوت ہیں۔ اور ستاروں کی ترتیب اور نظام وجود الخالق و قدرتہ پر روشن دلیل ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے جا بجا کائنات کی ان نشانیوں سے توحید پر استدلال کیا ہے، جن کو ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دن و رات اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کا وجود اور اس کے اندر پائی جانے والی پیچیدہ ساخت خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایک رب کریم اس کا خالق و مدبّر ہے۔ خلاصہ یہ کہ ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں: انسان کے اپنے وجود میں موجود نشانات دلالة الأنفس (دلالتہ الانفس کا معنی اور مفہوم انسان کے اپنے باطن، روح، اور جسمانی ساخت میں پوشیدہ ان نشانیوں (دلائل) سے ہے، جو خالق کائنات (اللہ تعالیٰ) کے وجود، حکمت اور قدرت کاملہ کی راہنمائی کرتی ہیں کائنات میں پھیلی ہوئی آیات (دلالتہ الآفاق)۔ عقل و فطرت کی گواہیاں جو مخلوقات کے نظام سے خالق کی ربوبیت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں یہ تمام دلائل اس حقیقت کو مضبوط ترین بنیاد پر ثابت کرتے ہیں کہ اللہ ہی رب العالمین ہے۔

قرآن کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت

وَأَنَّ	اور اگر	كُنْتُمْ	ہوتم	فِي رَيْبٍ	کسی شک میں
---------	---------	----------	------	------------	------------

مِمَّا	(اُس) سے جو	نَزَّلْنَا	ہم نے اُتارا	عَلَى عَبْدِنَا	اپنے بندے پر
فَاتُوا	پس تم لاؤ	بِسُورَةٍ	کوئی سورت	مِّنْ مِّثْلِهِ	اس جیسی
وَادْعُوا	اور تم بلاؤ	شُهَدَاءَكُمْ	اپنے حمایتیوں کو	مِّنْ دُونِ اللَّهِ	اللہ کے علاوہ
إِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	صَادِقِينَ (23)	سب سچے		

سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو (لَا رَيْبَ) قرار دیا، اب فرمایا کہ (اس کتاب میں کوئی شک تو نہیں لیکن) اگر تم اس کے بارے میں کسی ادنیٰ سے شک میں بھی مبتلا ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ یہ چیلنج پہلے اس کتاب جیسی ایک کتاب لانے کا کیا گیا۔ [بنی اسرائیل: 88] پھر اس جیسی دس سورتیں لانے کا۔ [ہود: 13] پھر مکہ میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا۔ [یونس: 38] اب مدینہ میں یہ چیلنج دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ سورہ بقرہ مدنی ہے۔ قرآن کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت بنیادی طور پر اس کی بے مثال فصاحت، بلاغت، اسلوب اور نظم کلام سے واضح ہوتی ہے، جس نے عرب کے فصحا و بلغاء کو بھی عاجز کر دیا۔ قرآن نے خود متعدد مقامات پر انسانوں اور جنات کو چیلنج دیا کہ اگر وہ اس میں شک رکھتے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں نصوص میں اس چیلنج کی نوعیت اور قرآن کی معجزانہ بلاغت کو تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کو ”أَحْسَنُ الْحَدِيثِ“ اس لیے کہا گیا کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا، اس میں ہر لفظ اور ہر حرف اپنی جگہ کامل مناسبت کے ساتھ رکھا گیا ہے، اسی وجہ سے فصاحت و بلاغت کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے، حتیٰ کہ عرب کے ماہرین فصاحت بھی اس کے سامنے بے بس ہو گئے اور کہنے لگے کہ «إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتَرُ» قرآن کا اعجاز اس کے ”نظم، صحت معانی اور توالی فصاحت الالفاظ“ میں ہے، اور انسان اپنی فطری کمزوریوں، جہل، نسیان، اور اضطراب کے باعث اس درجے کا کلام پیدا نہیں کر سکتا، فصحاء عرب، جو فصاحت و بلاغت کے امام تھے، اعتراضاً عاجز رہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ اور دائمی معجزہ ہے، مصطفیٰ صادق الرافعی اور دیگر ائمہ نے بھی اس کے اسلوب، الفاظ کے انتخاب، تراکیب کے حسن، اور آیات کے مقاطع میں کمال

تناق کو اس اعجاز کا بنیادی پہلو قرار دیا ہے ہر زمانے میں جو چیز کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس زمانے کے پیغمبر کو ایسا معجزہ دیا گیا جس کے سامنے انسانی کمال عاجز اور بے بس ہو، جیسے فرعون کے جادوگر اور عصائے موسیٰ، اور عیسیٰ کے زمانے کے با کمال طبیب اور عیسیٰ کا مسردوں کو زندہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود نہ کوئی پیش کر سکا نہ کر سکے گا۔ قرآن کا چیلنج ایک کھلا، ناقابل نقض چیلنج ہے کہ کوئی انسان یا جن اس جیسا کلام نہیں لاسکتا۔ اس کا اعجاز زیادہ تر فصاحت، بلاغت، اسلوب، الفاظ کے نظم، معنوی گہرائی، اور اس کے تسلسل میں ہے۔ عرب اہل زبان کو معارضہ کی بھرپور دعوت دی گئی، مگر کوئی اس کی مانند نظم پیش نہ کر سکا۔ قرآن ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی ہے، اور اس کا چیلنج ہمیشہ جاری رہے گا۔ چنانچہ قرآن کا چیلنج اس کی غیر معمولی اور فوق البشر فصاحت و بلاغت کا ثبوت ہے، جو کسی انسانی طاقت کی پیداوار نہیں ہو سکتی تھی، اور یہی اس کی معجزانہ حیثیت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنے عبادت گزار اور مقبول بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین

جہنم کا ایندھن کون سی اشیاء ہوں گی؟ تقویٰ کا لغوی مفہوم مثال کے درست ہونے کی شرط

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ
أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ ۖ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رَّرَقَا ۖ قَالُوا هَٰذَا الَّذِيْ
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيْهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيْهَا
خَالِدُونَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا
الَّذِيْنَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنََّّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ
مَاذَا آرَادَ اللّٰهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۖ يُضِلُّ بِهِ كَثِيْرًا ۖ وَيَهْدِيْ بِهِ كَثِيْرًا ۖ وَمَا يُضِلُّ بِهِ
إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۖ

جہنم کی آگ کی حرارت/ انسان اور پتھر اس کا ایندھن

فَإِنْ لَّمْ	پھر اگر نہ	تَفْعَلُوا	تم کر سکتے	وَلَنْ	اور ہرگز نہ
تَفْعَلُوا	تم کر سکو گے	فَاتَّقُوا	پس تم ڈرو	النَّارَ	آگ سے
				الَّتِيْ	جو

وَقُودَهَا	اُس کا ایندھن (ہیں)	النَّاسُ	لوگ	وَالْحِجَارَةُ	اور پتھر
اُعِدَّتْ	تیار کی گئی ہے	لِلْكَافِرِينَ (24)	کافروں کیلئے۔		

اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی علم تھا کہ ایسا کلام پیش کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اور یہ جو پانچ مرتبہ قرآن میں کھفا کو چیلنج کیا گیا ہے تو یہ ان پر تمام حجت کے لیے ہے کہ اگر ان واضح دلائل کے بعد کوئی کفر پر اڑا رہتا ہے تو اسے اس دوزخ کے عذاب سے ڈر جانا چاہیے۔ جس کا ایندھن انسان ہی نہیں معدنی پتھر (جیسے پتھری کوئلہ، گندھک) وغیرہ بھی ہوں گے جو آگ کی حدت کو بیلیوں گنا تیز کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: ”یہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔“ (طبری) عام آگ انسانی جسم اور پتھروں سے بجھ جاتی ہے یا مدہم ہو جاتی ہے، مگر جہنم کی آگ کی حرارت اس قدر ہے کہ انسان اور پتھر اس کا ایندھن بن کر اسے مزید بھڑکائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمہاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔“ (بخاری)، بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں حجارة سے مراد پتھر کے وہ بت ہیں جن کی پوجا کی جاتی رہی اور اس قول کی تائید اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ خَصَبٌ جَهَنَّمُ اَنْتُمْ لَهَا وِرْدُوْنَ (انبیاء: 98) تم بھی اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب دوزخ کا ایندھن بنو گے۔ تاکہ کافروں کو اپنے معبودوں کی خدائی کی حقیقت معلوم ہو سکے اور ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

تقویٰ کا معنی: ڈرنا، بچنا اور پرہیز کرنا

تقویٰ کا معنی اپنے اعمال کے انجام سے ڈر جانا ہے۔ اور اس کے مادہ و قی میں تین باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں: (1) ڈرنا۔ (2) بچنا۔ (3) پرہیز کرنا۔ گویا تقویٰ کے معنی اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچانا ہے جس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور شرعی اصطلاح میں اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا موجب ہو۔ اور جن امور سے شریعت نے منع کیا ہے انہیں چھوڑنے سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر تقویٰ کا مفہوم محض نواہی کو چھوڑنے تک ہی محدود

نہیں رہتا بلکہ اوامر کی بجا آوری کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے بے حیائی کے کام کرنا گناہ ہے ویسے ہی نماز یا روزہ وغیرہ ادا نہ کرنا بھی گناہ ہے۔ اور تمام تر عبادات کا بنیادی مقصد انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے یعنی وہ ہر کام کے کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچتا ہے اور اس انجام کو ملحوظ رکھ کر اسے اختیار کرتا یا چھوڑتا ہے۔ اور چونکہ انجام سے دو چار کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے لہذا تقویٰ کے مفہوم میں گناہوں کے انجام سے ڈرنے اور بچنے کے ساتھ ساتھ اللہ سے ڈرنا اور ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا از خود شامل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو گناہ، برائی یا نقصان سے بچانے کے لیے احتیاطی اقدامات اختیار کرے۔

جہنم صرف کافروں کے لیے

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے، کوئی مومن اس میں جائے گا تو کفر کے کسی کام کے ارتکاب کی وجہ ہی سے جائے گا، اگرچہ ہمیشہ اس میں نہیں رہے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم اس وقت بھی موجود ہے، یہی تمام سلف کا عقیدہ ہے، اس کا انکار صریح آیات و احادیث کا انکار ہے۔

ایمان اور عمل صالح / عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں

وَبَشِّرِ	اور خوش خبری دے دو	الَّذِينَ	(اُن لوگوں کو) جو	آمَنُوا	ایمان لائے
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	اور انہوں نے عمل کئے نیک	أَنَّ	کہ بیشک	لَهُمْ	اُن کے لئے
جَنَّاتٍ	باغات (میں)	تَجْرِي	بہتی ہیں	مِنْ تَحْتِهَا	اُن کے نیچے سے
الْأَنْهَارُ	نہریں	كُلَّمَا	جب بھی	رُزِقُوا	اُن کو رزق دیا جائے گا
مِنْهَا	اُن سے	مِنْ ثَمَرَةٍ	کوئی پھل	رَزَقًا	(بطور) رزق
قَالُوا	وہ کہیں گے	هَذَا الَّذِي	یہ (تو وہی ہے) جو	رُزِقْنَا	ہم رزق دیئے گئے
مِنْ قَبْلُ	(اس) سے پہلے	وَأْتُوا	اور وہ دیئے جائیں گے		

یہ	اُس سے	مُتَشَابِهًا	ملتاجتا	وَلَهُمْ	اور اُن کے لئے	فِيهَا	اُس میں
اَزْوَاجٍ	بیویاں (ہوگی)	مُطَهَّرَةً	پاک کی ہوں	وَهُمْ	اور وہ سب		
فِيهَا	اُس میں	خُلِدُوا (25)	ہمیشہ رہنے والے ہیں۔				

قرآن کریم میں آپ اکثر یہ بات ملاحظہ کریں گے کہ جہاں نہیں کفار اور ان کی وعید کا ذکر آتا ہے وہاں ساتھ ہی مومنوں اور ان کی جزا کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی یہی صورت ہوتی ہے، کیونکہ انسان کی ہدایت کے لیے ترغیب اور ترہیب دونوں باتیں ضروری ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ فرما کر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں اور ایمان کے بغیر اعمال خیر کی عند اللہ کوئی اہمیت نہیں۔ عمل صالح کیا ہے ”عمل صالح“ قرآن کی ایک اہم اصطلاح ہے، اس سے ایسا عمل مراد ہے جو اللہ کے حکم سے ہو، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو اور اس عمل سے خدا ہی کی خوشنودی مقصود ہو، جو عمل اللہ کے حکم کے خلاف ہو، جو بظاہر بہتر نظر آئے؛ لیکن عمل صالح نہیں، جیسے عیدین کے دن روزہ، مکروہ اوقات میں نماز، وغیرہ کوئی عمل حکم خداوندی کے تحت ہو؛ لیکن سنت نبوی کا خیال نہ رکھا جائے، تو یہ بھی عمل صالح نہیں، آج کل جو بدعات مروج ہیں، وہ اسی قبیل کی ہیں، بہر حال اطاعت الہی بھی ہو، سنت نبوی کے مطابق بھی ہو؛ لیکن ریا اور دیکھا و مقصود ہو تو یہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور گو صورت کے اعتبار سے نیک عمل ہے؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے عمل صالح میں اس کا بھی شمار نہیں خلاف سنت عمل بھی نامقبول اور نمود و نمائش اور ریاکاری کے لئے کئے گئے عمل بھی مردود و مطرود۔

مُتَشَابِهًا کا مطلب یا تو جنت کے تمام میوؤں کا آپس میں ہم شکل ہونا ہے، یا دنیا کے میوؤں کے ہم شکل ہونا۔ تاہم یہ مشابہت صرف شکل یا نام کی حد تک ہی ہوگی، یعنی شکل و صورت دیکھ کر وہ یہ تو کہہ دیں گے کہ یہ آم ہے یا انگور یا انار ہے مگر ان کا ذائقہ بالکل الگ اور اعلیٰ درجہ کا ہوگا اور ان کا سائز بھی دنیا کے پھلوں کی نسبت بہت بڑا ہوگا۔

ورنہ جنت کے میووں کے مزے اور ذائقے سے دنیا کے میووں کو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں

جنت کی نعمتوں کی بابت حدیث میں ہے: «مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرٍ» (صحیح بخاری، تفسیر الم السجدہ) ”کسی آنکھ نے انہیں دیکھا، نہ کسی کان نے ان کی بابت سنا (اور دیکھنا سنانا تو کجا) کسی انسان کے دل میں ان کا گمان بھی نہیں گزرا۔ آگے فرمایا: آذَوَاجُ مُطَهَّرَةٌ، جنتی لوگ سب کے سب خواہ مرد ہوں یا عورتیں، بول و براز اور رینٹ وغیرہ نیز اخلاق و ذلیلہ سے پاک صاف ہوں گے اور ان کی بیویاں یعنی حیض و نفاس اور دیگر آلائشوں سے نجاستوں سے بھی پاک و صاف ہوں گی۔ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ خُلُودٌ کے معنی ہمیشگی کے ہیں۔ اہل جنت ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت میں رہیں گے اور خوش رہیں گے اور اہل دوزخ ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں رہیں گے اور مبتلائے عذاب رہیں گے۔ دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں، یا تو انسان زندہ رہتا ہے اور نعمت اس سے چھن جاتی ہے، یا نعمت باقی رہتی ہے اور خود انسان دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے، غرض فنا کی بیماری انسان کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے اور ان نعمتوں کے ساتھ بھی؛ لیکن آخرت میں انسان کی زندگی بھی ابدی ہوگی اور جنت کی نعمتیں بھی لازوال۔ حدیث میں ہے۔ جنت اور جہنم میں جانے کے بعد ایک فرشتہ اعلان کرے گا ”اے جہنمیو! اب موت نہیں ہے اور اے جنتیو! اب موت نہیں ہے۔ جو فریق جس حالت میں ہے، اسی حالت میں ہمیشہ رہے گا۔“ (صحیح بخاری)

کفار کا دوسرے طریقے سے معارضہ

إِنَّ اللَّهَ	بیشک اللہ	لَا يَسْتَحْيِي	نہیں وہ شرماتا	أَنْ يَّضْعُرِبَ	کہ وہ بیان کرے
مَثَلًا	مثال	مَّا بَعُوضَةً	کسی مچھر کی	فَمَا	پھر (اُس کی) جو
فَوَقَّهَا	اُس کے اوپر	فَأَمَّا	پس رہے	الَّذِينَ	(وہ لوگ) جو

اٰمَنُوْا	ایمان لائے	فَاعِلَمُوْنَ	پس وہ جانتے ہیں
اِنَّهُ الْحَقُّ	کہ بیشک وہ ہی حق ہے	مِنْ رَّبِّهِمْ	اُن کے رب (کی طرف) سے
وَاَمَّا	اور ہے	الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا	اَرَادَ اللّٰهُ	ارادہ کیا اللہ نے
فَيَقُوْلُوْنَ	پس وہ کہتے ہیں	مَا ذَا	کیا
بِهٰذَا مَثَلًا	اس مثال سے	يُضِلُّ	وہ گمراہ کرتا ہے
كَثِيْرًا	اکثر کو	وَيَهْدِيْ	اور وہ ہدایت دیتا ہے
كَثِيْرًا	اکثر کو	وَمَا	اور نہیں
يَهْدِيْ	اس سے	اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (26)	مگر نافرمانوں کو۔

جب اللہ تعالیٰ نے دلائل قاطعہ سے قرآن کا معجزہ ہونا ثابت کر دیا تو کفار نے ایک دوسرے طریقے سے معارضہ کر دیا (یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا بنیادی مطلب مقابلہ کرنا، ٹکراؤ، یا مخالفت کرنا ہے) اور وہ یہ کہ اگر یہ کلام الہی ہوتا تو اتنی عظیم ذات کے نازل کردہ کلام میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں نہ ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات کی توضیح اور کسی حکمت بالغہ کے پیش نظر تمثیلات کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے اس میں حیا و حجاب بھی نہیں۔ فَوْقَهَا جو مجھ کے اوپر ہو، یعنی پر یا بازو، مراد اس مجھ سے بھی حقیر تر چیز۔ يٰفَوْقُ کے معنی، اس سے بڑھ کر بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں معنی (مجھ پر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز) کے ہوں گے۔ لفظ فَوْقَهَا میں دونوں مفہوم کی گنجائش ہے، واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی کی مثال اور مکوی کی مثال کافروں کے معبودان باطل کی کمزوری کو واضح کرنے کے لیے دی تھی) اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات میں کوئی باک نہیں کہ وہ مکھی اور مکوی تو درکنار، مجھ پر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی مثال بیان کرے۔ کیونکہ اس کی مخلوق ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ آیا مثال اور مُثَبِّل لہ، میں مطابقت پائی جاتی ہے؟ اگر مطابقت پائی جائے تو یہ مثال بالکل درست ہوگی۔ کفار کے معبود بھی تو حقیر چیزیں ہیں اور مکھی اور

مکڑی بھی لہذا تمثیل درست ہوئی۔ مثال دینے والا خواہ بڑا یا چھوٹا اس سے کوئی بحث نہیں کی جاتی، اور کفار نے جو اعتراض کیا تھا۔ وہ بالکل خلاف عقل تھا جو حماقت اور عناد پر مبنی تھا۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا "اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ "وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا" اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پالیتے ہیں۔ لہذا ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں۔

فسق کے تین درجے

فرمایا تاہم "وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ": اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔ شریعت میں "فاسق" اس نافرمان کو کہتے ہیں جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو۔ فسق کے تین درجے ہیں ایک تَغَايٍ وہ یہ کہ آدمی اتفاقیہ کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو جائے اور اس کو برا ہی جانتا رہا۔ دوسرا اِنْهَمَا کی کہ کبیرہ گناہوں کا عادی ہو گیا اور اس سے بچنے کی پروا نہیں کرتا۔ تیسرا جُحُودِی کہ حرام کو اچھا جان کر ارتکاب کرے اس درجہ والا ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ پہلے دو درجوں میں جب تک سب سے بڑے کبیرہ گناہ یعنی کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے وہ مومن و مسلمان ہے۔ مذکورہ آیت میں فاسقین سے وہی نافرمان مراد ہیں جو ایمان سے خارج ہو گئے۔

صلہ رحمی کی تاکید اور اقرباء سے حسن سلوک / زندگی اور موت کے چار مراحل

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۚ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ
وَ كُنْتُمْ اَمْوَ اٰثَافًا حَيًّا كُمْ ۚ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهٖ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوَّاهُنَّ
سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۹

فاسقوں کی تین صفات کا تذکرہ

الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جو	يَنْقُضُوْنَ	وہ توڑتے ہیں	عَهْدَ اللّٰهِ	اللہ کا عہد
مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ	اُس کی مضبوطی کے بعد	وَيَقْطَعُوْنَ	اور وہ کاٹتے ہیں	مَاۤ	جو
اَمَرَ اللّٰهُ	حکم دیا اللہ نے	بِهٖ	اُس کے ساتھ	اَنْ يُّوْصَلَ	کہ وہ جوڑا جائے
وَيُفْسِدُوْنَ	اور وہ فساد پھیلاتے ہیں	فِي الْاَرْضِ	زمین میں		
اُولٰٓئِكَ	(لوگ)	هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (27)	ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔		

اللہ کی کتاب سے ہدایت پانے کے بجائے گمراہ ہونے والے فاسقوں کی تین صفات ذکر کی گئی ہیں، اللہ کے عہد کو توڑنا، رشتہ داری اور دوسرے باہمی تعلقات قطع کرنا اور زمین میں فساد کرنا، جیسا کہ مشرکین نے اس عہد کو توڑا جو اَلْاَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا۔ [الأعراف: 172] یہود و نصاریٰ نے وہ عہد توڑا جو ان سے نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا، کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے رشتہ داری کو قطع کیا اور منافقین نے زمین میں فساد پھیلایا اور یہ تینوں صفات کفار کے تمام گروہوں میں پائی جاتی ہیں۔ مفسرین نے عہد کے مختلف مفہوم بیان کئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وہ وصیت جو اس نے اپنے اوامر بجالانے اور نواہی سے باز رکھنے کے لئے انبیاء (علیہم السلام) کے ذریعے سے مخلوق کو کی۔ وہ عہد جو اہل کتاب سے تورات میں لیا گیا کہ نبی آخر الزمان (ﷺ) کے آجانے کے بعد تمہارے لئے ان کی تصدیق کرنا اور ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ وہ عہد است جو صلب آدم سے نکالنے کے بعد تمام ذریت آدم سے لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے: **وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ** (الأعراف: 172) **نَقْضَ عَهْدٍ** کا مطلب عہد کی پروا نہ کرنا ہے (ابن کثیر)

تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا

اسلامی اخلاقیات کے باب میں واضح کیا گیا ہے کہ اچھا برتاؤ، محبت، تعاون، شفقت اور رحم دلی وہ صفات ہیں جن سے معاشرے میں قربت، اتحاد اور اعتماد پیدا ہوتا ہے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک انہی صفات کا لازمی حصہ ہے۔ صلہ رحمی کے ذریعے غاندانوں میں محبت اور دلوں میں قربت بڑھتی ہے۔ رشتہ داروں کی مدد، خبر گیری، مالی تعاون، اچھے اخلاق اور نرمی سے پیش آنا اسلامی اخلاق کا بنیادی تقاضا ہے۔ ان حقوق کا ادا کرنا اللہ کی رضا، معاشرتی سکون اور افساد کے باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے۔ بہر حال خدا نے جن تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، جیسے خدا اور بندہ کا تعلق، انبیاء اور امتوں کا تعلق اور ایک انسان سے دوسرے انسان کا تعلق، ان کو یہ توڑنے کے مرتکب ہیں اور اس کی دلیل وہ سلوک ہے جو یہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کی

پیروی کرنے والوں کے ساتھ روارکھتے تھے اس میں پہلی قسم میں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کا ذکر ہے اور دوسری قسم میں بندے اور بندے کے درمیان تعلق کا۔

فساد فی الارض کیا ہے؟

اگر ان دونوں قسم کے تعلقات کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہمیں سے فساد کی جملہ اقسام پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرابت داری توڑنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اور فساد سے اسلام کی مخالفت، مسلمانوں سے عداوت اور ظلم و نا انصافی مراد ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شرائع کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں، شرک، بدعت، ناچ گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بجائے اس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ الغرض عہد شکنی، قطع رحمی اور فساد فی الارض یہ تین بری خصلتیں ہیں۔ جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ الغرض! جن چیزوں کے ملانے کا حکم دیا گیا وہ یہ ہیں:

(۱) رشتے داروں سے تعلقات جوڑنا، (۲) مسلمانوں کے ساتھ دوستی و محبت کرنا، (۳) تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ماننا، (۴) تمام کتابوں کی تصدیق کرنا اور حق پر جمع ہونا۔ ان کو قطع کرنے کا معنی ہے رشتے داروں سے تعلق توڑنا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو نہ ماننا اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں کی تصدیق نہ کرنا۔

انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات

کَیْفَ	کیسے	تَکْفُرُونَ	تم انکار کرتے ہو	بِاللّٰہِ	اللہ کا
وَكُنْتُمْ	حالانکہ تم تھے	أَمْوَئَاتًا	بے جان (مردہ)		
فَاحْيَاكُمْ	تو اُس نے زندگی دی تمہیں	ثُمَّ	پھر		
يُمَيِّتُكُمْ	وہ موت دے گا تمہیں	ثُمَّ	پھر	يُحْيِيكُمْ	وہ زندہ کرے گا تمہیں
ثُمَّ	پھر	إِلَيْهِ	اُسی کی طرف	تَرْجَعُونَ (28)	تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات کا ذکر ہے۔ پہلے موت، پھر زندگی، پھر موت، پھر زندگی۔ روح اور جسم کے اتصال کا نام زندگی اور ان کے انفصال کا نام موت ہے۔ پہلی حالت موت ہے یعنی جملہ انسانوں کی ارواح تو پیدا ہو چکی تھیں۔ لیکن جسم اپنے اپنے وقت پر عطا ہوئے، اسی عرصہ میں عہد الست لیا گیا تھا۔ دوسری حالت انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک ہے، جس میں وہ اچھے یا برے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ تیسری حالت موت سے لے کر حشر تک اور چوتھی اور آخری حالت دوبارہ جی اٹھنے (حشر) کے بعد لامتناہی زندگی ہے۔ یعنی توحید و نبوت کے دلائل اور کفر و ایمان کی جزا و سزا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص و عام نعمتوں کا اور قدرت کی عجیب نشانیوں کا ذکر فرمایا اور کفر کی خرابی اور برائی کو کافروں کے دلوں میں بٹھانے کیلئے انہیں خطاب کیا کہ تم کس طرح خدا کے منکر ہوتے ہو حالانکہ تمہارا اپنا حال اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ تم بدن میں روح ڈالے جانے سے پہلے تمام مراحل میں مسردہ تھے یعنی کچھ نہ تھے یا بے جان جسم تھے پھر اس نے تم میں روح ڈال کر تمہیں زندگی دی یعنی تم نطفہ بے جان، پھر خون، پھر گوشت کا ٹکڑا تھے اور اسی سے اللہ نے ایک بولتا، دیکھتا، سنتا، چلتا، پھر تان انسان بنادیا۔ پھر زندگی کی مدت پوری ہونے پر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔ اس سے یا تو قبر کی زندگی مراد ہے جو سوال کے لیے ہوگی یا قیامت کی، پھر تم حساب کتاب اور جزا کے لیے اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو اپنے اس حال کو جان کر تمہارا

کفر کرنا نہایت عجیب ہے۔ ایمان عمل کی جڑ ہے، ایمان ہی سے عمل کی شاخیں پھوٹی ہیں اور عقیدہ آخرت ایمان و عمل صالح کا محرک ہے، اگر آخرت کا شوق اور خوف نہ ہو تو نہ کسی نیک کام کی رغبت ہو اور نہ کسی برائی سے بچنے کی توفیق؛ اسی لئے قرآن عام طور پر جہاں ایمان و عمل کی ترغیب دیتا ہے یا کفر اور گناہ سے روکتا ہے، اپنی بات کو آخرت کے تذکرہ پر ختم کرتا ہے۔ اس آیت میں غور کریں تو ہم مسلمانوں کیلئے بھی نصیحت ہے کہ ہم بھی کچھ نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی عطا کی اور زندگی گزارنے کے لوازمات اور نعمتوں سے نوازا تو اس کی عطاؤں سے فائدہ اٹھا کر اس کی یاد سے غافل ہونا اور ناشکری اور غفلت کی زندگی گزارنا کسی طرح ہمارے شایان شان نہیں ہے۔

زمین کی تمام چیزیں انسانیت کے فائدے کیلئے

هُوَ الَّذِي	وہ (ذات) جس نے	خَلَقَ	پیدا کیا	لَكُمْ	تمہارے لئے
مَّا فِي الْأَرْضِ	جو زمین میں ہے	جَمِيعًا	سب کچھ	ثُمَّ	پھر
اسْتَوَى	قصد کیا	إِلَى السَّمَاءِ	آسمان کی طرف		
فَسَوَّيْنَاهُنَّ	پھر درست کر کے بنا دیا انہیں	سَبْعَ سَمُوتٍ	سات آسمان	وَهُوَ	اور وہ
بِكُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کو	عَلِيمٌ (29)	خوب جاننے والا ہے۔		

انسان کی موت و حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ”اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کمال حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتیٰ کہ موذی جانور بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان مکھیوں سے تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں۔ کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی

ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي
الْأَرْضِ جَمِيعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح
یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب
جائز سمجھی جائے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں۔ مگر جہاں حکم
آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مردار حرام ہے۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔
باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے کہ انہیں انسان کے فائدے
کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرور کوئی روحانی یا جسمانی قباحت
ہوگی۔ جس کی وجہ سے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ سب چیزیں مباح ہیں۔ زمین کی تمام
اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی
چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ”ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ“ پھر اللہ تعالیٰ آسمانوں کی طرف
متوجہ ہوا ”فَسَوَّيْنَهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ“ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات
آسمان پیدا فرمائے۔

زمین سے آسمان تک کی مسافت

اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کیے ہیں۔ یونانی فلکیات کے ماہرین آسمانوں کی
تعداد نو بتاتے ہیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل
کر لیں۔ تو نو بن جاتے ہیں کیونکہ عرش الگ ہے۔ اور کرسی الگ ہے۔ وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر
ہیں اور ذات خداوندی ان تمام چیزوں سے وراء الراء ہے۔ فرمایا ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“
یعنی وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لہذا عبادت بھی
اسی کی کرنی چاہئے۔ جو عظیم کل اور قادر مطلق ہے ”إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ جو قادر ہے۔ جو
خالق اور رب ہے۔ اس کے علاوہ الہ بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ ذرے ذرے کو جاننے والا وہی

ہے اور محیط علم صرف خدا تعالیٰ کا ہے نہ جبرائیل (علیہ السلام) اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبود برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے اور نہ کوئی بگڑی بنا سکتا ہے نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے کیونکہ علیم کل صرف ذات خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ الغرض فرمایا ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عبادت گزار بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین

تخلیق آدم پر فرشتوں کا اعتراض/تسبیح و تقدیس کا فرق

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ٥٠

حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت ارضی

وَإِذْ قَالَ	اور جب کہا	رَبُّكَ	تیرے رب نے	لِلْمَلٰئِكَةِ	فرشتوں سے
إِنِّي	بینک میں	جَاعِلٌ	بنانے والا ہوں		
فِي الْأَرْضِ	زمین میں	خَلِيفَةً	خلیفہ		

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے ان رومانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم (علیہ السلام) کو عطا کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ گویا اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔ اس آیت میں تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ مَلَائِكَةُ (فرشتے) اللہ کی نوری مخلوق ہیں، جن کا مسکن آسمان

ہے، جو اوامرا الہی کے بجالانے اور اس کی تہمید و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرتے۔ ”یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا کہ تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جانا ہے۔ لہذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔

قرآن پاک میں خلیفہ کے دو معانی

قرآن پاک میں خلیفہ دو معانی میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ ”خلف یخلف“ دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ انسان کی حیثیت بطور مخلوق خدا زمین پر آباد کاری، اصلاح اور ذمہ داری نبھانے والے جانشین کی ہے۔ خلافت اور ”خلفاء“ دونوں ”خلیفہ“ کی جمع ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل کی جگہ لے کر زمین میں آباد ہوتی ہے اس طرح ”خلیفہ“ اپنی اصل میں ”جانشین، قائم مقام، ذمہ دار اور نائب“ کے معنی رکھتا ہے، چاہے وہ اللہ کے احکام کے تحت انسان ہو یا کسی ریاست کا حکمران۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے ”هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكَ خَلِيفًا اَرْضًا“ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے۔ جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا۔ جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔ خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا انسان کے علاوہ باقی بیشمار مخلوقات بھی اس زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آدم (علیہ السلام) کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہو گا اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہ

یہی خلافت ہے۔ ”وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ“۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور نیک اعمال کی شرط پر غلبہ، اقتدار، اور امن کا قطعی وعدہ فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام، نظام خلافت ہے۔ دین میں ملکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

خلیفہ اور اہل سنت والجماعت کا نظریہ

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ ہونا چاہئے۔ صرف ایک خارجی فرقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیروکار خلیفہ یا حاکم (امام) کو معصوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں اور وہی اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو منصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں (1- شمائل ترمذی ص 601) آتا ہے کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم (علیہ السلام) نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں، خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی (علیہ السلام) نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی ”وَيَأْتِي اللَّهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَاجُ“ یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے

سو کوئی نہیں ہونا چاہئے۔ انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب ہوا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آخری ایام میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا (4۔ البدایہ والنہایہ ج 7 ص 18) آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔ یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شوری قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور ﷺ دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پا کر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اسکی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو زمین پر اسکی احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی۔ کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔

اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے انسانی تخلیق کیوں؟

قَالُوا	انہوں نے کہا	أَتَجْعَلُ	کیا تو بنائے گا	فِيهَا	اُس میں
مَنْ يُّفْسِدُ	جو وہ فساد پھیلائے گا	فِيهَا	اُس میں		
وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ	اور وہ بہائے گا خون	وَنَحْنُ	حالانکہ ہم		
نُسَبِّحُ	ہم تسبیح بیان کرتے ہیں	بِحَمْدِكَ	تیری تعریف کے ساتھ		
وَنُقَدِّسُ	اور ہم پاکی بیان کرتے ہیں	لَكَ	تیرے لئے	قَالَ	فرمایا
إِنِّي أَعْلَمُ	بیشک میں جانتا ہوں	مَا لَا	جو نہیں	تَعْلَمُونَ (30)	تم جانتے۔

جب اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو ”قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ“ یعنی فرشتوں نے کہا اے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے۔ جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے فرشتوں کا یہ کہنا کچھ اعتراض کے طور پر نہ تھا؛ بلکہ کمالِ نیاز مندی کے ساتھ محض عرضِ مدعا تھا، کہ حمد و شفاء اور تسبیح و تقدیس میں تو ہم لوگ ہمہ دم مصروف ہیں ہی، اور جو امور ہمارے حوالہ کئے جاتے ہیں، ان کو بجالانے میں بھی کوئی کسر نہیں رکھی جاتی، زمین میں انسان سے پہلے جنات کے قیام کا تجربہ ہمیں بھی ہے اور اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہی زمینی مخلوق بھی سب کی سب نیکو کار نہ ہوگی، اس میں فساد مچانے اور خوریزی کرنے والے لوگ بھی ہوں گے، تو صد فی صد فرمانبردار اور اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے ایسی مخلوق کا وجود میں لانا مفید نظر نہیں آتا، جن میں اچھے لوگ بھی ہوں اور مفسدین و اشرار بھی۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو کسی سے مشورہ کی حاجت ہو، البتہ یہاں خلیفہ بنانے کی خبر فرشتوں کو ظاہری طور پر مشورے کے انداز میں دی گئی۔

استخارہ و استشارہ کا حکم

اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم کام کرنے سے پہلے اپنے ماتحت افراد سے مشورہ کر لیا جائے تاکہ اس کام سے متعلق ان کے ذہن میں کوئی غلطی ہو تو اس کا ازالہ ہو جائے یا کوئی ایسی مفید رائے مل جائے جس سے وہ کام مزید بہتر انداز سے ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو بھی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ سورۃ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ اور کاموں میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ (آل عمران: ۱۵۹) اور انصار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”وَأَمَرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ“ اور ان کا کام ان کے باہمی مشورے سے (ہوتا) ہے۔ (شوری: ۳۸) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس نے استخارہ کیا وہ نامراد نہیں ہوگا اور جس نے مشورہ کیا

وہ نادیم نہیں ہوگا اور جس نے میاں رومی کی وہ کنگال نہیں ہوگا۔

انسان کی زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہے اور اس دوران انسان کو بہت سے اہم فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان فیصلوں سے قبل انسان؛ اگرچہ غور و فکر کرتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق بہترین فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کے بہت سے فیصلوں کے نتائج مثبت نہیں نکلتے۔ مثبت فیصلوں کے زندگی پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں جب کہ منفی فیصلوں کے نتیجے میں انسان کو کئی مرتبہ نقصان اور پیشمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کتاب و سنت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر اہم فیصلہ کرنے سے قبل مشاورت اور استخارہ ضرور کرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کسی بھی اہم معاملے میں کوئی قدم اٹھانے سے قبل مشورہ کیا کرتے تھے اسی طرح احادیث مبارکہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے اس کو امانت دار ہونا چاہیے۔ بدنیت اور حسد سے مشاورت کرنے سے اعراض کرنا چاہیے۔ مشورہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ سے استخارہ کرنا، یعنی اس سے خیر کو طلب کرنا بھی انسان کے لیے انتہائی مفید ہے، استخارہ کے حوالے سے اس بات کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ استخارہ حلال و حرام کے تعین یا فساد ارض کو ساقط کرنے یا کسی گناہ کے کام کے بارے میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ استخارہ ان دنیاوی امور میں ہوتا ہے جن کا تعلق انسان کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے اور انسان دوران استوں میں سے ایک راستے کو ترجیح دینا چاہتا ہے یا اپنے مستقبل کے حوالے سے رہنمائی کا طلب گار ہوتا ہے۔ حلال و حرام اور ارکان دین کے بارے میں وضاحت یا رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں استخارہ کی بجائے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جب کہ روزمرہ کی زندگی کے معاملات مثلاً کاروبار شادی بیاہ یا تعلیم کے حوالے سے مشورے اور استخارے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

استخارہ کرنے کے نتیجے میں انسان کے قلبی رجحانات کو اللہ تعالیٰ خیر کی طرف مائل فرما دیتے ہیں۔ بعض لوگ استخارہ کو خواب کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں استخارہ خواب کے ساتھ مشروط نہیں ہے تاہم؛ اگر استخارہ کرنے والے کو استخارہ کے بعد کوئی واضح خواب آجائے تو اس

پر عمل کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ مومن و مسلمان کا خواب بھی وحی کا چھیا لیمواں حصہ ہوتا ہے اور خواب میں کسی خیر کا اشارہ مل جانا اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے بعید نہیں ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بہت سے معاملات میں گومگوں کا شکار رہتا ہے۔ ان معاملات میں تشویش سے نکلنے کے لیے مشورے اور استخارے کا راستہ بہترین راستہ ہے۔ اگر انسان اس راستے پر عمل پیرا ہو جائے تو اس کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ بعض لوگ اپنی زندگی کے بڑے بڑے فیصلوں میں عجلت اور جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مشاورت اور استخارہ کیے بغیر کام کر گزرتے ہیں جس کی وجہ سے بعد ازاں کسی بڑے نقصان یا شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے بڑے فیصلے صبر اور تحمل سے کرنے چاہئیں اور ان فیصلوں کو کرنے سے قبل مشورہ اور استخارہ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ درست نتیجے پر پہنچا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو زندگی کے تمام معاملات میں درست فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تَسْبِيْحٌ وَ تَقْدِيْسٌ کے معانی

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا: ”وَ تَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ“ مولا کریم! اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ ”وَ نُقَدِّسُ لَكَ“ اور تیری پاکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔ اس آیت میں جو تسبیح و تقدیس کے الفاظ آئے ہیں تسبیح کے معنی سبحان اللہ کہنا یا سبحان اللہ کا ذکر کرنا یا اس ذات کی زبان قال یا زبان حال سے صفت بیان کرنا ہے جو ہر قسم کے عیب، نقص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ گویا یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی خوبیوں کو مثبت انداز میں بیان کرنے اور اس کی حمد یا تعریف بیان کرنے کے لیے آتا ہے اور تقدیس کے معنی ایسی باتوں کی نفی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں۔ اور قدوس معنی وہ ذات ہے جو دوسروں کی شرکت کی احتیاج اور شرک جیسی دوسری نجاستوں سے پاک ہو یعنی اصداد اور انداد دونوں سے پاک ہو تسبیح سے حمد بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور تقدیس سے اللہ تعالیٰ کی تسنن یا یہ بیان

کرنا۔ الغرض! تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تخریب کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقص والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شریکوں سے پاک ہے۔

اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے

فرشتوں کا یہ جواب سن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”قَالَ رَبِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ جو میں جانتا ہوں کیونکہ خلیفہ بنانے میں میری حکمتیں تم پر ظاہر نہیں۔ فرشتوں کا یہ کہنا حسد یا اعتراض کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس کی حقیقت اور حکمت معلوم کرنے کی غرض سے تھا کہ اے رب اس مخلوق کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے، جب کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد پھیلائیں گے اور خون ریزی کریں گے؟ اگر مقصود یہ ہے کہ تیری عبادت ہو تو اس کام کے لئے ہم تو موجود ہیں، ہم سے وہ خطرات بھی نہیں جو نبی مخلوق سے متوقع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”میں وہ مصلحت راجحہ جانتا ہوں جس کی بنا پر ان ذکر کردہ مفاسد کے باوجود میں اسے پیدا کر رہا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ بات یہ ہے کہ انہی انسانوں میں انبیاء بھی ہوں گے، اولیاء بھی اور علماء بھی اور یہ حضرات علمی و عملی دونوں فضیلتوں کے جامع ہوں گے۔ کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف و دیعت کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام مفسدین اور بگاڑ پیدا کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسے: شرعی سزائیں، آخرت میں کافروں اور گنہگاروں پر عذاب، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بعض صفات وہ ہیں جن کا ظہور خطا کاروں سے متعلق ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا غفار ہونا، عفو ہونا، بخشنا ہونا، وغیرہ، اگر ایسی مخلوق نہ ہوتی جس میں نیکیوں کے ساتھ برے اور فرمانبرداروں کے ساتھ خطا کار بھی ہوں تو نہ یہ احکام الہی جاری ہو پاتے اور نہ اللہ تعالیٰ کی ان بلند صفات کا اظہار ہو پاتا؛ اس لئے ایسی مخلوق کا وجود ضروری تھا، جو خیر و شر کے سلسلہ میں امتحان لئے جانے کے لائق ہو اور نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیت رکھتی ہو، فرشتے برائی و نافرمانی پر قاصر ہی نہ تھے اور جنہوں میں نیکی کی صلاحیت نہایت مغلوب تھی؛ اس لئے وہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں تھے، غالباً اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کے بارے میں فرمایا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

خلافت کے لئے ضروری شرط / علم کے فضائل سجدہ تعظیمی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَقْبِلُوا بِأَسْمَاءِ
هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣١﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۚ إِنَّكَ
أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٣٢﴾ قَالَ يٰٓآدَمُ اقْبِلْهُم بِأَسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا أَقْبَلَهُمْ
بِأَسْمَائِهِمْ ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيٓ أَعْلَمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَأَعْلَمُ
مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٣٣﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا
إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٤﴾

علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے

وَعَلَّمَ	اور اُس نے سکھا دیئے	آدَمَ الْأَسْمَاءَ	آدم کو نام	كُلَّهَا	وہ سب
ثُمَّ	پھر	عَرَضَهُمْ	پیش کیا انہیں	عَلَى الْمَلَائِكَةِ	فرشتوں پر
فَقَالَ	پس اُس نے کہا	أَقْبِلُوا	تم بتاؤ مجھے	بِأَسْمَاءِ	نام
هَٰؤُلَاءِ	ان (چیزوں کے)	إِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	صَادِقِينَ (31)	سچے۔

انسان کو فرشتوں سے جو زائد چیز و دیعت کی گئی تھی۔ وہ بھی زمین کی اشیاء کے نام، ان کے خواص، ان خواص کا علم ہونے سے آگے نامعلوم باتوں تک پہنچنے (تحقیق یا استنباط) کی قوت و استعداد، زمین میں نظام خلافت کے قیام کے لیے یہ قوت انتہائی ضروری تھی جو فرشتوں میں نہیں تھی۔ عربی زبان میں اسم صرف نام ہی کو نہیں؛ بلکہ علامہ راغب اصفہانی کے بقول اس کو کہتے ہیں جس سے کسی شئی کی ذات کی معرفت حاصل ہو، اس لئے مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صرف اشیاء کے نام ہی نہیں؛ بلکہ ان کے حقائق و خواص بھی بتادیئے گئے تھے؛ گویا آج تک کائنات کی جن پوشیدہ حقیقتوں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے اور ان جانی باتیں علم کی روشنی میں آتی جاتی ہیں وہ اسی علم کا ظہور ہیں، جو بارگاہ ربانی سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوا تھا، ویسے غور کیا جائے تو چیزوں کو نام سے موسوم کرنا بھی انسان ہی کی خصوصیت ہے، دوسری مخلوقات اس سے محروم ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس لئے اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ سے بنی آدم ہی کو ناموں کے ذریعہ چیزوں کی شناخت اور تعین کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پر فضل ہونے کا سبب ”علم“ ظاہر فرمایا: اس سے معلوم ہوا کہ علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا ”اے ابو ذر! رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمہارا اس حال میں صبح کرنا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ایک آیت سیکھی ہو، یہ تمہارے لئے 100 رعیتیں نفل پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اس حال میں صبح کرنا کہ تم نے علم کا ایک باب سیکھا ہو جس پر عمل کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، تو یہ تمہارے لئے 1000 نوافل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب فی فضل من تعلم القرآن وعلمہ، ۱/ ۱۳۲، الحدیث: ۲۱۹) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے زیادہ ہے اور تمہارے دین کی بھلائی تقویٰ (اختیار کرنے میں) ہے۔ (معجم الاوسط، من اسمہ علی، ۳/ ۹۲، الحدیث: ۳۹۶۰) اِنْ كُنْتُمْ

صَادِقِينَ، کے اصل معنی ہیں: اگر تم سچے، لیکن فرشتوں سے جھوٹ کا احتمال نہیں کہ وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہی نہیں ہیں؛ اس لئے یہاں مراد یہ ہے کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے، کیوں کہ عربی زبان میں ”صدق“ کے معنی صواب اور درست کے بھی آتے ہیں۔

عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی

قَالُوا	اُنہوں نے کہا	سُبْحٰنَكَ	پاک ہے تو	لَا عِلْمَہ	کوئی علم نہیں
لَعَنًا	ہمارے لئے	اِلَّا	مگر	مَا عَلَّمْتَنَا	جو تو نے سکھایا ہمیں
اِنَّكَ	بیشک تو	اَنْتَ الْعَلِيْمُ		تو ہی خوب جاننے والا	
الحَكِيْمُ (32)			خوب حکمت والا ہے۔		

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کو صرف انہی امور کا علم دیا گیا ہے جن پر وہ مدبرات امر کی حیثیت سے مامور ہیں۔ مثلاً بادلوں اور پانی کا فرشتہ، پانی کے متعلق تو جملہ معلومات رکھتا ہے مگر دوسری تمام اشیاء کے افعال و خواص سے بالکل بیخبر ہے۔ یہی حال دوسرے فرشتوں کا ہے۔ جبکہ انسان کو تمام اشیاء کا سرسری علم دیا گیا تھا۔ پھر وہ تحقیق اور جستجو کے ذریعہ اس میں از خود اضافہ کر سکتا ہے۔ اصل میں فرشتوں کا علم محض تقلیدی ہے، وہ استنباط کی صلاحیت سے محروم ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت سے نوازا ہے؛ اس لئے وہ معلومات میں غور کر کے نامعلوم باتوں کو بھی اخذ کر لیتا ہے۔ اسی طرح زمین میں احکام الہی کو جاری کرنے کے لئے علم و فہم بھی مطلوب ہے، محض صلاحیت کافی نہیں؛ بلکہ صلاحیت بھی ضروری ہے، ہم اس حکمت سے واقف نہیں تھے، اس سے عبادت پر علم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ عبادت میں تو فرشتے بڑھ کر تھے، ان کو یہ مقام علم ہی کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا ایک نمایاں مظہر

قَالَ	اللہ نے فرمایا	يَا آدَمُ	اے آدم	اَتَّبِعْهُمْ	تو خبر دے انہیں
بِأَسْمَائِهِمْ	اُن کے ناموں کی	فَلَمَّا	پھر جب	اَتَّبَاهُمْ	اُس نے خبر دی انہیں
بِأَسْمَائِهِمْ	اُن کے ناموں کی	قَالَ	اللہ نے فرمایا	اَلَمْ	کیا نہیں
اَقُلْ لَّكُمْ	میں نے کہا تھا تم سے	اِنِّیْ	بیشک میں	اَعْلَمُ	میں جانتا ہوں
غَيْبٍ	چھپی ہوئی باتیں	السَّمَوَاتِ	آسمانوں کی		
وَالْاَرْضِ	اور زمین کی	وَاَعْلَمُ	اور میں جانتا ہوں	مَا تُبْدُونَ	جو تم ظاہر کرتے ہو
وَمَا	اور جو	كُنْتُمْ هُوَ	تَكْتُمُونَ (33)		سب چھپاتے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو، جنہیں اس نے تمام چیزوں کے نام سکھا دیے تھے، حکم دیا کہ وہ فرشتوں کے سامنے ان چیزوں کے نام بیان کریں، تاکہ آدم کی فضیلت اور علم کا وہ پہلو ظاہر ہو جائے جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا۔ آدم علیہ السلام نے جب ملائکہ کو ان تمام چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ اسی علم غیب اور حکمت کی بنا پر اس نے آدم کو خلافت کے لیے چن لیا۔ یہ آیت انسان کو اللہ کی عطا کردہ علم کی فضیلت، اور فرشتوں کے مقابلے میں آدم کی برتری کا ایک نمایاں مظہر دکھاتی ہے۔ جب فرشتوں کو آدم کے ہمہ علمی احاطہ کا علم ہو گیا اور انہوں نے اپنے عجزی کا اعتراف کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو وہ بات بتادی جو وہ نہیں جانتے تھے اور وہ یہ تھی کہ انسان میں اگر فتنہ و شر کا پہلو ہے تو صلاح و خیر کا پہلو بھی موجود ہے اور صلاح و خیر کا پہلو غالب ہے۔ اسی لیے اسے خلیفہ بنایا جا رہا ہے اور وہ اپنے علمی کمال کی وجہ سے اس کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اس قصہ سے ضمنی بات بھی معلوم ہو گئی کہ علم عبادت سے افضل ہے۔ عبادت کا تعلق صرف مخلوق سے ہے۔ جب کہ علم کا تعلق خالق و مخلوق دونوں سے اور سب سے بڑا عالم اور علیم تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ بلاشبہ انسان فرشتوں جیسی اور جتنی عبادت نہیں کر سکتا۔ تاہم علم کی بنا پر فرشتوں سے افضل اور مستحق خلافت قرار پایا۔

سجدہ سے مراد اور اس کے احکام

وَإِذْ	اور جب	قُلْنَا	ہم نے کہا	لِلْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں سے
اَسْجُدُوْا	تم سجدہ کرو	لَاۤ اَدَمُ	آدم کو	فَسَجَدُوْا	تو سب نے سجدہ کیا
اِلَّاۤ اٰدَمَ	سوائے	اِبٰلِیْسَ	ابلیس کے	اٰبٰی	اُس نے انکار کیا
وَاسْتَکْبَرَ	اور تکبر کیا	وَكَانَ	اور وہ ہو گیا		
مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (34)			کافروں میں سے۔		

سجدہ سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس سے پیشانی کا زمین پر رکھنا مراد نہیں؛ بلکہ محض حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بڑائی اور جلالت شان کو تسلیم کرنا مراد ہے؛ اس لئے کہ عربی زبان میں ”سجود“ کے معنی ”خضوع و تنذل“ کے بھی آتے ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے سجدہ کی مخصوص صورت یعنی پیشانی کا زمین پر رکھنا ہی مراد ہے؛ لیکن یہ سجدہ عبادت و بندگی کے طور پر نہ تھا کہ یہ تمام شریعتوں میں اللہ کے ماسوا کے لئے حرام رہا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت تو شرک ہے، جس کی اجازت کسی بھی امت میں نہیں تھی، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو شرک کا حکم کیسے دے سکتا تھا، بلکہ یہ تعظیم کا سجدہ تھا، جو پہلی امتوں میں جائز تھا، ہماری امت میں حرام ہے، جیسا کہ بعض پہلی امتوں میں بہن سے نکاح جائز تھا، اب حرام ہے؛ بلکہ احترام و تعظیم کا سجدہ مراد ہے، جو پہلی امتوں میں جائز تھا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے ظاہر ہے (یوسف: ۱۰۰) اور شریعت محمدی میں اسے بھی حرام فرما دیا گیا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ کے ماسوا کو سجدہ کی گنجائش ہوتی تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ شوہروں کو سجدہ کریں، (مشکوٰۃ مع المرقاۃ: ۶/۲۷۲) ایک رائے یہ بھی ہے کہ سجدہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو کیا تھا اور حضرت آدم کی حیثیت قبلہ کی تھی۔ (تفسیر آیات الاحکام لمحمد علی السائس: ۶۰/۱) ایک صحابی نے حضور بنی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت! ہم باہر جا کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم

آپ کے سامنے کیوں سجدہ نہ کریں۔ حضور ﷺ نے منع فرما دیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کرو گے۔ تو اس شخص نے کہا: حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر سجدہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے سجدہ کرنا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیماً ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ بیان القرآن فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے قبر کو سجدہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس سجدہ سے مراد وہی سجدہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر۔ بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئمہ دین علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔ یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آج کل کے بعض مرید اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مشرکانہ فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ بھی تھی۔ محض تعظیم مقصود تھی تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہئے۔

حد اولین گناہ

حد اولین گناہ ہے: مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں (1) - تفسیر عزیزی فارسی پارہ 1 ص (175) کہ ابن منذر (رح) نے عبادۃ بن ابی امیہ سے ایک روایت بیان کی ہے۔ کہ اس کا نعت میں سب سے پہلا گناہ حد تھا۔ جو ابلیس نے آدم (علیہ السلام) پر کیا۔ اور کہا "اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں "وَحَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ" وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا امر دو ٹوٹا ہوا۔ اس سے ثابت ہوا

کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حمد کی وجہ سے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کیا۔ ”وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ“ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔ ”كَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ“ کا ترجمہ دونوں طریقہ سے کیا گیا ہے: شیطان کافروں میں سے ہو گیا، اور شیطان کافروں میں سے تھا، یعنی وہ بہ باطن کفر کو چھپائے ہوئے تھا اور یہ بات پہلے ہی سے خدا نے علیم وخبیر کے علم میں تھی، دوسرا ترجمہ الفاظ قرآن سے زیادہ قریب ہے۔

سجدے کی دو قسمیں

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ (1)..... سجدے کی دو قسمیں ہیں: (۱) عبادت کا سجدہ (۲) تعظیم کا سجدہ۔ ”عبادت کا سجدہ“ کسی کو معبود سمجھ کر کیا جاتا ہے اور ”تعظیم کا سجدہ“ وہ ہوتا ہے جس سے مسجود (یعنی جسے سجدہ کیا جائے اس) کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔ (2)..... یہ قطعی عقیدہ ہے کہ ”سجدہ عبادت“ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتا اور نہ کسی شریعت میں کبھی جائز ہوا۔ (3)..... فرشتوں نے حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کو تعظیمی سجدہ کیا تھا اور وہ باقاعدہ پیشانی زمین پر رکھنے کی صورت میں تھا، صرف سر جھکانا تھا۔ (4)..... تعظیمی سجدہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا اب کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ لہذا کسی پیر یا ولی یا مزار کو تعظیمی سجدہ کرنا حرام ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ہر قسم کے مشرکانہ فعل سے ہماری حفاظت فرمائے، آمین۔

شجر ممنومہ / حضرت آدم (علیہ السلام) کی توبہ / توبہ کا مفہوم اور اس کے ارکان

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا
تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ⑤ فَآزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا
فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ⑥ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي
الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ⑦ فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ⑧
إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ⑨ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ⑩ فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي
هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ⑪ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ⑫ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ⑬

خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی

وَقُلْنَا	اور ہم نے کہا	يَا آدَمُ	اے آدم	اسْكُنْ	تورہ
أَنْتَ وَزَوْجُكَ	تو اور تیری بیوی	الْجَنَّةَ	جنت میں	وَكُلَا	اور تم دونوں کھاؤ
مِنْهَا	اُس سے	رَغَدًا	الطینان سے	حَيْثُ	جہاں سے

يَسْتُمْسَا	تم دونوں چاہو	وَلَا	اور مت	تَقْرَبَا	تم دونوں قریب جاؤ
هَذِهِ الشَّجَرَةَ	اس درخت کے	فَتَكُونَا		(ورنہ) پھر تم ہو جاؤ گے	
مِنَ الظَّالِمِينَ (35)			ظالموں میں سے۔		

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے شیطان مردود ہوا تھا لہذا وہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نقصان پہنچانے کی تاک میں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا کہ جنت میں رہو اور جہاں دل کرے بے روک ٹوک کھاؤ البتہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان نے انہیں وسوسہ ڈالا اور کہنے لگا کہ تمہیں تمہارے رب عز وجل نے اس درخت سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تم ہمیشہ زندہ رہنے والے نہ بن جاؤ اور اس کے ساتھ شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ اس پر انہیں خیال ہوا کہ اللہ پاک کی جھوٹی قسم کون کھا سکتا ہے، اس خیال سے حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس میں سے کچھ کھایا پھر حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیا تو انہوں نے بھی کھالیا اور یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ممانعت تحریمی تھی بلکہ تشریعی تھی یعنی حرام قرار دینے کیلئے نہ تھی بلکہ ایک ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ یہاں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجتہاد میں خطا ہوئی اور خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ شیطان کے دھوکے کی وجہ سے انہوں نے اس ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا اور پھل کھاتے ہی ان کے پردے کے مقام بے پردہ ہو گئے اور وہ اسے چھپانے کیلئے ان پر پتے ڈالنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور میں نے تم سے یہ نہ فرمایا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ اس کے بعد حکم الہی ہوا کہ تم زمین پر اتر جاؤ۔ اب تمہاری اولاد آپس میں ایک دوسرے کی دشمن ہوگی اور تم ایک خاص وقت تک زمین میں رہو گے۔ زمین پر تشریف آوری کے بعد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک عرصے تک اپنی لغزش کی معافی مانگتے رہے حتیٰ کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند کلمات سکھائے گئے، پھر جب آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کلمات

کے ساتھ توبہ و معافی کی درخواست کی تو وہ قبول ہوئی۔

شریعت میں سد ذرائع کا بنیادی مفہوم

وَلَا تَقْرَبُوا اس درخت کے کھانے سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا۔ اس سے شریعت کا قاعدہ سد ذرائع ثابت ہوتا ہے، یہ اصول فقہ کی ایک اصطلاح ”سد ذرائع“ کہلاتی ہے بغوی معنی: ’سد کے معنی روکنے یا بند کرنے کے ہیں، اور ذرائع جمع ہے ذریعہ کی، جس کا مطلب ہے وسیلہ یا راستہ، اصطلاحی مفہوم: ایسے تمام راستوں، ذرائع اور وسیلوں کی روک تھام کرنا جو بظاہر جائز یا بے ضرر ہوں، لیکن ان کا انجام لوگوں کو برائی، گناہ یا کسی شرعی نقصان تک پہنچا دے، یعنی ایسا جائز کام جو بذات خود برا نہ ہو لیکن اس کا جواز کسی حرام یا مفسد کا سبب بنتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز حرام کا ذریعہ بنتی ہے اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً 1 زنا سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا (وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْتِي) [بنی اسرائیل: 32] ”اور زنا کے قریب مت جاؤ۔“ حرام سے بچنے کے لیے مشتبہات یعنی شبہ والی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا۔ (یاد رہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ظالم کہنا گستاخی اور توہین ہے اور جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ظالم کہے وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک اور مولیٰ ہے، وہ اپنے مقبول بندوں کے بارے میں جو چاہے فرمائے کسی دوسرے کی کیا مجال کہ وہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے متعلق کوئی خلاف ادب کلمہ زبان پر لائے اور اللہ تعالیٰ کے اس طرح کے خطابات کو اپنی جرأت و بیبائی کی دلیل بنائے۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ بادشاہ کے مال باپ بادشاہ کو ڈانٹیں اور یہ دیکھ کر شاہی محل کا جمعدار بھی بادشاہ کو انہی الفاظ میں ڈانٹنے لگے تو اس احمق کا کیا انجام ہوگا؟ ہمیں تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور مجبوبانِ خدا کی تعظیم و توقیر اور ادب و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور ہم پر یہی لازم ہے۔ اس آیت سے یہ باتیں معلوم ہوئی کہ: 1 معلوم ہوا کہ کھانا پینا اور ازدواجی تعلق تقویٰ و بزرگی اور دینی کمالات کے منافی نہیں ہے۔ 2 اس درخت کا نام نہ قرآن میں مذکور ہے نہ صحیح حدیثوں میں، عوام میں جو گیہوں مشہور ہو گیا ہے، اس کی کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔ 4 ظلم کا لفظ قرآن مجید میں

متعدد جگہ گناہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، گناہ پیغمبر کے شایان شان نہیں؛ اسی لئے خطا کار کے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ظلم سے مراد اللہ رب العزت کی نافرمانی بھی ہے اور اپنے نفس پر زیادتی بھی جس کی وجہ سے جنت سے نکلنا پڑا۔

انبیاء معصوم ہوتے ہیں، یہی علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے

فَاَزَلَّهُمَا	پس ورغلا یا اُن دونوں کو	الشَّيْطَانُ	شیطان نے
عَنْهَا	اُس سے	فَاَخْرَجَهُمَا	پس نکلوا دیا اُن دونوں کو
كَانَا	وہ دونوں تھے	فِيهِ	اُس میں
اَهْبَطُوا	تم اتر جاؤ	بَعْضُكُمْ	تمہارا بعض
عَدُوٌّ	دشمن ہے	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے
مُسْتَقَرٌّ	ٹھکانا	وَمَتَاعٌ	اور فائدہ اٹھانا ہے
		إِلَىٰ حِينٍ (36)	ایک وقت تک۔

یعنی شیطان نے انہیں بہکا کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ یوں تو یہ درخت بڑا مفید ہے کیونکہ اس کو کھانے سے ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے؛ لیکن شروع میں آپ کو اس لئے منع کیا گیا تھا کہ آپ کی جسمانی کیفیت اس کو برداشت نہ کر سکتی تھی اب چونکہ آپ جنت کے ماحول کے عادی ہو گئے ہیں اور آپ کے قوی مضبوط ہو چکے ہیں اس لئے اب وہ ممانعت باقی نہیں رہی عَنْهَا کے دو معنی کئے گئے ہیں اور دونوں کی گنجائش ہے: اول یہ کہ اس سے 'جنت' مراد لی جائے، دوسرے اس سے وہی ممنوع درخت مراد لیا جائے، آیت میں اس سے پہلے دونوں ہی کا ذکر آیا ہے، ہندوستان کے اہل علم میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے دوسرا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ اور ایسا صغیرہ گناہ جو مروت و شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہو، کا صدور بالاتفاق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے نہیں ہو سکتا، البتہ لغزشوں اور غلاف اولی باتوں کا صدور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہو سکتا ہے، یہی اکثر علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام سے ان کے صدور کی حکمت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انسان اور بشر ہونے کا پہلو اُمت کے ذہن میں باقی رہے اور وہ ان کی شان کے بارے میں افراط اور مبالغہ سے کام نہ لیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس درخت کے پھل سے کھانا، حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبل از وقت نینوی سے ہجرت کر جانا، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بلا ارادہ ایک قبیلہ کو قتل کر دینا اور آپ ﷺ کا ایک موقع پر ”انشاء اللہ“ کہنا بھول جانا اسی قبیل سے ہے، اُمت کی تو ایسی لغزشیں بارگاہِ خداوندی میں یوں ہی معاف ہیں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان اور ان کے مقام کے لحاظ سے اتنی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت ہو جاتی ہے، بہر حال شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وسوسہ اندازی نے ”فَاَخْرَجَهُمَا جَنَّاتٍ كَانَا فِيْهِ“ ان دونوں کو اسی جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ ”وَقُلْنَا اهْبِطُوا“ اور ”حم“ نے کہا اتر جاؤ ”بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ“ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ ”وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ“ اور زمین میں تمہارے لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ ”وَمَتَاعٌ اِلٰى حِينٍ“ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ کر کہیں فسادوں یا سمندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے۔ دوسری جگہ فرمایا ”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اٰخَرٰى“ اے انسان! ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں گے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا، کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ ایک خاص مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

میت کی تدفین کے بعد ایک مُستحب عمل

یہاں ایک بات یاد رہے کہ جب کسی مسلمان کو انتقال کے بعد دفن کر دیا جائے اور اس کی قبر پر تختے لگانے کے بعد مٹی دی جائے تو اس وقت مستحب یہ ہے کہ اس کے سرہانے کی طرف دونوں ہاتھوں سے تین بار مٹی ڈالیں۔ پہلی بار کہیں ”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ“ دوسری بار ”وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ“

اور تیسری بار ” وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ “ (عالمگیری، کتاب الصلاة، الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل السادس، ۱/۱۶۶)

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے

فَتَلَقَّىٰ	پھر خوب سیکھ لئے	أَدَمُ	آدم نے	مِنْ رَبِّهِ	اپنے رب سے
كَلِمَاتٍ	چند کلمات	فَتَابَ	پس متوجہ ہوا	عَلَيْهِ	اُس پر
إِنَّهُ هُوَ	بیشک وہ	التَّوَّابُ	وہی توبہ قبول کرنے والا	الرَّحِيمُ	بڑا مہربان ہے۔

یعنی یہ پہلی توبہ تھی، جو کسی انسان کو اپنے رب کریم سے طلب کرنی تھی: اس لئے خداوند کریم ہی نے حضرت آدم کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی دعا میں ہ کلمات عرض کئے جو سورہ اعراف میں ہیں: رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تُو نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ضرور ہم نقصان والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

اس کے علاوہ حدیث میں ان دعائیہ کلمات کا ذکر ہے جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی نتیجہ یہ ہوا کہ ” فَتَابَ عَلَيْهِ “ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم (علیہ السلام) کی طرف مہربانی کے ساتھ ”تاب“ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا، گویا توبہ کی صفت کا تعلق خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں ”تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ“ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔ ”إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“۔ بیشک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔

خوف اور حزن سے مراد

قُلْنَا	ہم نے کہا	اهْبِطُوا	تم اتر جاؤ	مِنْهَا	اُس سے	بِجَمِيعًا	سب کے سب
---------	-----------	-----------	------------	---------	--------	------------	----------

فَاِمَا	پھر جب	يَا تَيِّبُكُمْ	وہ ضرور آئے تمہارے پاس
مِيْنِي	میری طرف سے	هُدًى	ہدایت
تَبَعَ	پیروی کی	هُدَايَ	میری ہدایت کی
عَلَيْهِمْ	اُن پر	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ
		يَخْزُونُ (38)	سب غمگین ہونگے۔

گویا توبہ قبول ہونے کے بعد بھی انسان کے لئے زمین میں قیام پذیر ہونے کا حکم باقی رہا کیوں کہ اس کے بغیر انسان کو زمین کی خلافت سونپنے کا مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ کسی تکلیف دہ بات کے پیش آنے سے پہلے جو گھبراہٹ اور اندیشہ ہوتا ہے، اس کو خوف اور پیش آنے کے بعد جو دمک اور صدمہ ہوتا ہے، اسے 'حزن' کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ راجح کی پیروی کرنے والوں کو نہ مستقبل کا کوئی خوف ہونا چاہئے اور نہ گزرے ہوئے حالات پر کوئی رنج۔

اللہ کی نازل کردہ نشانیوں کو جھٹلانے کا انجام

وَالَّذِينَ	اور جنہوں نے	كَفَرُوا	کفر کیا	وَكَذَّبُوا	اور انہوں نے جھٹلایا
بِآيَاتِنَا	ہماری آیات کو	أُولَئِكَ	وہ (لوگ)	أَصْحَابُ النَّارِ	دوزخ والے
هُمْ	وہ سب	فِيهَا	اس میں	خُلِدُوا (39)	ہمیشہ رہنے والے ہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے سے انکار کرنے (کفر) اور اللہ کی نازل کردہ نشانیوں کو جھٹلانے کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

'آیات' کے معنی احکام الہی کے بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ کی اُن نشانیوں کے بھی، جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں اور اپنی زبانِ حال سے ہر لمحہ اور ہر آن خدا کے وجود اور اس کی توحید کی گواہی دے رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ جیسے اہل جنت ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے، اسی طرح دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

بنی اسرائیل پر انعامات / بنی اسرائیل کا کتاب اللہ سے سلوک / تلبیس اور کتمان حق

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآءِیْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوا بِعَهْدِیْ اَوْفِ
بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاٰیٰتِیْ فَارْهَبُوْنَ ۝ ۞ وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا
تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرٍ بِهٖ ۚ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۚ وَاٰیٰتِیْ فَاتَّقُوْنَ ۝ ۞ وَلَا
تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنُّمُوهَا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ۞

بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب

یٰۤاَيُّهَا	اِسْرَآءِیْلُ	اِذْكُرُوْا	تم یاد کرو
نِعْمَتِیَ الَّتِیْ	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی	علیکم
وَاَوْفُوا	اور تم پورا کرو	بِعَهْدِیْ	میرے عہد کو
اَوْفِ	اور میں پورا کروں گا	بِعَهْدِكُمْ	تمہارے عہد کو
وَاٰیٰتِیْ	اور صرف مجھ ہی سے	فَارْهَبُوْنَ (40)	پس تم سب ڈرو

اس سے پہلے ”یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ“ کے ساتھ تمام لوگوں کو دعوت تھی، اب بنی اسرائیل کو خصوصی

خطاب ہے، کیونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کا زیادہ حق ہے کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لائیں۔ یہ خطاب کبھی انعامات یاد دلا کر ہے جو ان پر کیے گئے، کبھی ان کی بد اعمالیوں پر ڈانٹ کے ساتھ ہے اور کبھی ان سزاؤں کے ذکر کے ساتھ ہے جو ان کی نافرمانیوں پر انھیں دی گئیں۔ یہاں سے لے کر آیت ایک سو پینتالیس تک ان پر دس انعامات، ان کی دس بد اعمالیوں اور انھیں دی جانے والی دس سزاؤں کا ذکر ہے۔ (التسہیل) یعنی آیت نمبر 40 سے لے کر آیت نمبر 147 تک کی اکثر آیات میں بنی اسرائیل کے عروج و زوال، عزت و ذلت، اقبال و ادبار، جزا و سزا اور قومی و اجتماعی اچھے برے کردار کا تذکرہ ہے۔ پھر اسی بیان کو قرآن پاک میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس بار بار کے تکرار میں ایک بڑی حکمت قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت کا فلسفہ سمجھانا اور مسلمانوں کو اس سے عبرت دلانا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد ہونے، جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امت ہونے اور تورات جیسی کتاب پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنے اعتقاد و عمل کے بگاڑ پر ذلیل و رسوا اور مغلوب و مقہور ہوئی جبکہ توبہ و رجوع اور نئی و کتاب کی تعلیمات پر عمل کرنے کی صورت میں معزز و غالب ہوئی اسی طرح امت مسلمہ بھی اپنے عروج و زوال کے اسباب کو اسی آئینے میں دیکھ سکتی ہے۔

مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟

آج سب پوچھتے ہیں کہ مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟ قرآن میں بیان کردہ بنی اسرائیل کا قومی اور اجتماعی کردار اور موجودہ دور کے مسلمانوں کا قومی اور اجتماعی کردار سامنے رکھ کر موازنہ کر لیں۔ خود ہی سمجھ آ جائے گا کہ اگر بنی اسرائیل کو کانٹے بونے پر کانٹے ملتے تھے تو ہمیں کانٹے بونے کے بدلے آم کیوں ملیں گے؟ یہود مدینہ میں بکثرت آباد تھے۔ چونکہ سیدنا اسحاق (علیہ السلام) سے لے کر ان میں تقریباً چار ہزار بنی آپکے تھے۔ اس لیے تمام عرب پر ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے بیشمار انعامات کئے تھے۔ مگر کچھ مدت گزرنے پر ان میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے تھے اپنے اس علمی تفوق کی بنا پر اور اس حسد کی بنا

پر کہ آنے والا بنی اسحاق کی اولاد سے نہیں، انہوں نے دعوت اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسرائیل کا معنی عبد اللہ ہے اور یہ یعقوب (علیہ السلام) کا لقب تھا اور بنو اسرائیل سے مراد ان کی اولاد یا یہودی قوم ہے۔ جن کے لیے تورات نازل ہوئی۔

بنی اسرائیل کے اعمال بد

رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو یہ چیزیں یاد دلانی گئیں، حالانکہ یہ سب کچھ پہلے بنی اسرائیل پر گزرا تھا، کیونکہ ان کے بزرگوں پر انعام ان پر بھی انعام تھا اور وہ اب بھی اپنے بزرگوں کی بد عادتوں میں ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ گزشتہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آپ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل کے اعمال بد کا بھی ذکر فرمایا، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود کفر، کتاب اللہ کی تحریف، جبریل علیہ السلام سے عداوت، جادو کرنا، ایک دوسرے کو قتل کرنا وغیرہ۔ بنی اسرائیل کے احوال اتنی تفصیل سے ذکر فرمانے سے یہ بھی مقصود ہے کہ امت محمد ﷺ ان بد اعمالیوں سے بچے اور ان کے نتائج سے ڈرتی رہے۔

نِعْمَتِي (اگرچہ یہ لفظ واحد ہے، مگر جنس مراد ہے، جس میں تمام نعمتیں شامل ہیں)۔ (وَأَوْفُوا بِعَهْدِي) یہاں اس عہد کی تفصیل بیان نہیں فرمائی، سورہ مائدہ (12) میں اس عہد کی تفصیل موجود ہے۔ اس کے مطابق ان کا اللہ تعالیٰ سے عہد یہ تھا کہ تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر (جن میں محمد ﷺ بھی شامل ہیں) ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے اور اللہ کا ان سے عہد یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کروں گا اور تمہیں جنتوں میں داخل کروں گا۔ تورات میں یہود سے ہمیشہ احکام خداوندی پر کاربند رہنے کا عہد لیا گیا تھا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ تم کو تمام قوموں میں ایک خصوصی مقام دیا جائے گا، اسی دو طرفہ عہد کا غالباً یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعنی وہ عہد یہ تھا کہ تم تورات کے احکام کے پابند رہو گے اور میں جو پیغمبر بھیجوں اس پر ایمان لا کر اس کا ساتھ دو گے اور اللہ کا عہد یہ تھا کہ ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا۔ بنی اسرائیل نے اس اقرار کو قبول تو کر لیا مگر بعد میں

اس پر قائم نہ رہے، بدینتی کی، رشوت لے کر غلط مسئلے بتائے، حق کو چھپایا۔ آنے والے نبیوں کی اطاعت کے بجائے ان میں سے بعض کو قتل ہی کر ڈالا اور اپنی ریاست جمائی اور تورات میں جہاں کہیں رسول اللہ ﷺ کی توصیف تھی اسے بھی بدل ڈالا۔

فَارْهَبُونِ كَامَعْنٰی

(وَاَيَّايَ فَارْهَبُونِ) کا معنی ”خاص مجھ سے“ ہے۔ ”فَارْهَبُونِ“ اصل میں ”فَارْهَبُونِي“ تھا۔ ”یاء“ حذف ہوگئی، اس کا معنی بھی مجھ سے ڈرو ہے۔ ”مجھ سے ڈرو“ کی وجہ سے ”خاص مجھ ہی سے ڈرو“ ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ خاص کے بعد ”مجھ“ کا لفظ کافی تھا مجھی یا مجھ ہی کی ضرورت نہ تھی۔

قرآن پاک کو بحیثیت کلام الہی تسلیم کر لو

وَاٰمِنُوْا	اور تم ایمان لاؤ	بِمَا	اس پر جو	اَنْزَلْتُ	میں نے نازل کیا
مُصَدِّقًا	تصدیق کرنے والا	لِّمَا	(اس) کی جو	مَعَكُمْ	تمہارے پاس ہے
وَلَا تَكُوْنُوْا	اور مت تم ہو جاؤ	اَوَّلَ کَافِرٍ	پہلے انکار کرنے والا	یہ	اس کے
وَلَا تَشْتَرُوْا	اور مت تم بیچو	بِاٰیٰتِنِیْ	میری آیتوں کو		
ثَمَنًا قَلِيْلًا	تھوڑی قیمت میں	وَاَيَّايَ	اور صرف مجھ سے ہی		
فَاتَّقُوْنَ (41)		پس تم ڈرو۔			

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا: ”وَاٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ“ اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز ”مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ“ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ یعنی توراۃ اور دیگر سابقہ کتب یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے مگر اس کی شریعت اور احکام کی من و عن تصدیق نہیں کرتا کیونکہ بسا اوقات دوسرا نبی پہلے نبی کی بعض

چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم اس قرآن پاک کو بحیثیت کلام الہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ ”وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ“ اور تم لوگ قرآن پاک کے اولین منکرین نہ بن جاؤ۔ یہ کی ضمیر قرآن کی طرف، یا حضرت محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف ہے۔ دونوں ہی قول صحیح ہیں کیونکہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں، جس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا، اس نے محمد رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ کفر کیا اور جس نے محمد (ﷺ) کے ساتھ کفر کیا، اس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا (ابن کثیر) ”پہلے کافر نہ ہو“ کا مطلب ہے کہ ایک تو تمہیں جو علم ہے دوسرے اس سے محروم ہیں، اس لئے تمہاری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے، مدینہ میں یہود کو سب سے پہلے دعوت ایمان دی گئی، ورنہ ہجرت سے پہلے بہت سے لوگ قبول اسلام کر چکے تھے۔ اس لئے انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ یہودیوں میں تم اولین کافر مت بنو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمام یہودیوں کے کفر و تجو دکا وبال تم پر پڑے گا۔

تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے

فرمایا ”وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا“ اور مت خرید و میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت۔ تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں۔ یعنی کھانا، پینا، پہننا اور نکاح کرنا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا انجام گندگی اور پینے کا انجام بول ہے۔ اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد پھٹ جاتا ہے۔ اور اسے پھینک دیا جاتا ہے رہا نکاح تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان حقیر اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔ ”تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو“ کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکام الہی کا سودا کر لو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔ احکام الہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال و متاع بھی ان کے مقابلے میں بچ اور ٹمن قلیل ہے۔ آیت

میں اصل مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں، لیکن یہ حکم قیامت تک آنے والوں کے لئے ہے، جو بھی ابطال حق یا اثبات باطل یا کتمان علم کا ارتکاب اور احقاق حق سے محض طلب دنیا کے لئے، گریز کرے گا وہ اس وعید میں شامل ہوگا۔ (فتح القدیر)

فرمایا ”وَإِنِّي أَنَا فَاتَّقُونِ“ اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آخرت کی خبر لو۔ دنیا کے پیچھے مت پڑو آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب و کتاب ہوگا۔ اور پھر تمہیں اپنے کئے کی جزا یا سزا بھگتنا ہوگی۔ لہذا مجھ سے ڈرتے رہو۔ ”فَاتَّقُونِ“ کے معنی مجھ سے یعنی میرے غضب سے ڈرو، کے بھی کئے گئے ہیں اور میرے غضب سے بچو، کے بھی، دونوں کی گنجائش ہے۔

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو

وَلَا تَلْبِسُوا	اور مت تم ملاؤ	الْحَقَّ	حق کو	بِالْبَاطِلِ	باطل کے ساتھ
وَتَكْتُمُوا	اور تم (نہ) چھپاؤ	الْحَقَّ	حق کو	وَأَنْتُمْ	حالانکہ تم
تَعْلَمُونَ (42)			سب جانتے ہو۔		

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ”اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ (خلط ملط کا بنیادی مطلب کسی چیز کا گڈمڈ، ملا جلایا درہم برہم ہونا ہے۔ یہ دو مختلف الفاظ کا مجموعہ ہے، خلط: (عسربنی لفظ) جس کا مطلب ملانا یا آمیزش کرنا ہے، ملط: (فارسی/ ہندی الاصل) جس کا مطلب بھی گڈمڈ کرنا یا گھلنا ملنا ہے۔)

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ ”اور نہ ہی حق کو چھپاؤ یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی۔ کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔ آگے آئے گا۔ کہ یہ لوگ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان ﷺ کو اسی طرح پھپھانتے تھے۔ جس طرح اپنی اولاد کو پھپھانتے تھے۔ مگر پھر بھی انکار کر دیتے تھے۔ یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں بڑے ماہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریفیں ہو چکی ہیں (1۔ تقریر دلپذیر) ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر

تحریف کا عمل آزمایا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور جس کتاب کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہوگا۔

آج کل دین کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟

آج کل دین کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ نہ کسی کو فرائض کی پروا ہے۔ اور نہ واجبات کی۔ معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تشہیر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر گالی گلوچ تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو بیماریاں۔ بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں۔ اے میری امت تم میں بھی وہی بیماریاں عود کر آئیں گی۔ جس طرح ایک جو تادوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔ فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ ”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ اور تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے اگلے رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ دعوت الی القرآن ہے کہ ”وَأْمِنُوا بِمَا آتَزَلْتُ“ جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے۔ یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخرت نوشتہ اور صحیفہ ہے اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے پیش کردہ پروگرام پر عمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت اور فضائل / پریشانیوں اور مصائب کا علاج

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَأَقِمْوَا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٣٧﴾ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ
وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٣٨﴾ وَاسْتَعِينُوا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهَمْ
مُلْقُوا رَبِّهَمْ وَأَنَّهَمْ إِلٰهٌ رَّجْعُونَ ﴿٤٠﴾

نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان

وَأَقِمْوَا	اور تم قائم کرو	الصَّلٰوةَ	نماز	وَآتُوا	اور تم ادا کرو	الزَّكٰوةَ	زکوٰۃ
وَارْكَعُوا	اور تم رکوع کرو	مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٣٧﴾	(43)	رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔			

اس سے پہلی آیات میں یہودیوں کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا، پھر انہیں حق کو باطل کے ساتھ
ملانے اور نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی نبوت کے دلائل چھپانے سے منع کیا گیا، اب ان
کے سامنے وہ شرعی احکام بیان کئے جا رہے ہیں جو ایمان قبول کرنے کے بعد ان پر لازم ہیں،
چنانچہ فرمایا گیا کہ اے یہودیو! تم ایمان قبول کر کے مسلمانوں کی طرح پانچ نمازیں ان کے

حقوق اور شرائط کے ساتھ ادا کرو اور جس طرح مسلمان اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اسی طرح تم بھی اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو اور میرے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اور ان کے صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرو۔ نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان رہے ہیں۔ لیکن یہود میں نماز باجماعت کا اہتمام نہیں تھا اور ان کی نماز میں رکوع بھی نہیں تھا۔ یہود نے نماز ادا کرنا بالکل چھوڑ ہی دیا تھا اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بجائے سود کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس آیت میں انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اب تمام امور میں نبی آخر الزمان صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی اتباع کرو۔ اس آیت اور اس سے اگلی تین آیات میں خطاب یہود اور مسلمانوں میں مشترک ہے۔ ہماری شریعت میں بھی نماز باجماعت ادا کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے اور بلا عذر ترک جماعت کبیرہ گناہ ہے۔ جیسا کہ احادیث سے واضح ہوتا ہے۔ اس آیت میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی ترغیب بھی ہے اور احادیث میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے کثیر فضائل بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ”جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔“ (بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ، ۱/۲۳۲، الحدیث: ۶۳۵)

بزرگانِ دین کے نزدیک باجماعت نماز اداء کرنے کی اہمیت

بزرگانِ دین کے نزدیک باجماعت نماز اداء کرنے کی اہمیت کس قدر تھی اس کا اندازہ ان دو حکایات سے لگایا جاسکتا ہے: (۱)..... حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں کہ ”حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اپنے ایک باغ کی طرف تشریف لے گئے، جب واپس ہوئے تو لوگ نمازِ عصر ادا کر چکے تھے، یہ دیکھ کر آپ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھا اور ارشاد فرمایا: ”میری عصر کی جماعت فوت ہو گئی ہے، لہذا میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ مساکین پر صدقہ ہے تاکہ یہ اس کام کا کفارہ ہو جائے۔“ (الزواجر عن اقتراف الکبائر، باب صلاۃ الجماعۃ، الکبیرۃ الخامسۃ والثمانون، ۱/۳۱۱) (۲)..... حضرت حاتم

اَصَم رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فَرَمَاتے ہیں: ”ایک مرتبہ میری باجماعت نماز فوت ہو گئی تو حضرت ابو اسحاق بخاری رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کے علاوہ کسی نے میری تعزیت نہ کی اور اگر میرا بچہ فوت ہو جاتا تو دس ہزار سے زیادہ افراد مجھ سے تعزیت کرتے کیونکہ لوگوں کے نزدیک دینی نقصان دنیوی نقصان سے کم تر ہے۔ (احیاء علوم الدین)،

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ یہود کو حب مال اور حب جاہ کی دو ایسی بیماریاں لاحق تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دو بیماریوں میں مبتلا ہو کر خیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ حب مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَإِنَّ لِحُبِّ الْمَالِ لَشَدِيدًا“ مال کی محبت انسان میں فطرۃ بڑی شدید ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک انسان مال کی محبت اور اس کی طلب میں تو بہت مضبوط اور طاقتور ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کیلئے کمزور ہے، غافل انسان مال کی محبت کی وجہ سے سخت دل ہے کیونکہ مال کی محبت سختی دل کا باعث ہے، جیسے حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی محبت نرمی دل کا سبب ہے دیکھو یزید، فرعون، شداد، جانوروں سے زیادہ سخت دل تھے، محض محبت مال سے یا غافل انسان مال کی محبت میں سخت دل ہے، دین میں نرم (یعنی دین میں سختی برداشت نہیں کرتے)، اسی لئے عام طور پر لوگ دنیا کے لئے وہ مشقتیں جھیل لیتے ہیں جو دین کے لئے نہیں جھیلتے۔

مال سے محبت کی چار صورتیں

خیال رہے کہ محبت مال چار طرح کی ہے: (1) حُبِ ایمانی جیسے حج وغیرہ کے لئے مال کی چاہت، (2) حُبِ نفسانی جیسے اپنے آرام و راحت کے لئے مال سے رغبت، (3) حُبِ طُغیانی جیسے محض جمع کرنے اور چھوڑ جانے کے لئے مال سے محبت، (4) حُبِ شیطانی یعنی گناہ و سرکشی کے لئے مال کی محبت۔ یہاں آخری دو محبتیں مراد ہیں، پہلی قسم کی محبت عبادت ہے، حضرت سلیمان عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَاٰلِہٖ وَسَلَام نے فرمایا تھا: ”إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ“ حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو

جہاد کے گھوڑوں سے بڑی محبت تھی، چونکہ مال بہت خیر کا ذریعہ ہے، اسی لئے اسے خیر فرمایا گیا۔ صوفیاء کے نزدیک نعمت سے ایسی محبت بری ہے جو دل کو بھردے کہ مَنعِ محبت کی جگہ نہ رہے، وہی یہاں مراد ہے، اندرونِ دل صرف یار کی محبت ہو، وہاں اغیار نہ ہوں، باقی مجتبیٰ دل کے باہر رہیں، کشتی پانی میں رہے سلامت ہے، اگر پانی کشتی میں آجائے تو ڈوب جائے گی۔

حب مال جملہ امراض کی جڑ اور بنیاد ہے

دوسری جگہ فرمایا: "وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا" تم جی بھر کر مال سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اور یہ حقیقت میں بقیہ جملہ امراض کی جڑ اور بنیاد ہے اور وہ ہے مال اور دنیا کی محبت۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ تم مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو کہ اس کو خرچ کرنا ہی نہیں چاہتے، الغرض فساد کی جسٹ یعنی مال کی محبت کی وجہ سے ہر طرح کا بگاڑ پیدا کرتے ہو۔ مال کی محبت انتہائی تباہ کن ہے: مال کی محبت نہایت تباہ کن ہے، اسی لئے قرآن و حدیث میں اس کی بکثرت مذمت بیان کی گئی ہے۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں ممانع تھیں۔ ان بیماریوں کا علاج: ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز کیا: "وَأَقِمْوُا الصَّلَاةَ" نماز قائم کرو، چنانچہ فرمایا گیا کہ اے یہودیو! تم ایمان قبول کر کے مسلمانوں کی طرح پانچ نمازیں ان کے حقوق اور شرائط کے ساتھ ادا کرو۔ وَأَتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جس طرح مسلمان اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اسی طرح تم بھی اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو یعنی حب جاہ اور حب مال کی بیماری کے لیے نماز اور زکوٰۃ شافی علاج ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب سمجھے گا۔ وہ حب جاہ کی بیماری سے شفا یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حب مال کی بیماری کا علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مجملہ ان کے بخل دور کرنا بھی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ بخل کی لعنت سے پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو یہی وہ جذبہ ہے۔ اس آیت میں بھلائی سے مراد تقویٰ اور فرمانبرداری ہے اور خرچ کرنے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ”یہاں خرچ کرنے میں واجب اور نفلی تمام صدقات داخل ہیں۔ امام حن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: جو مال مسلمانوں کو محبوب ہوا سے رضاے الہی کے لیے خرچ کرنے والا اس آیت کی فضیلت میں داخل ہے خواہ وہ ایک کھجور ہی ہو۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے بخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ حب جاہ اور حب مال کی بیماری کا علاج ہے۔

وعظ و نصیحت کرنے والوں کو تنبیہ

اَتَاْمُرُوْنَ	کیا تم حکم دیتے ہو	النَّاسِ	لوگوں کو	بِالْبِرِّ	نیکی کا
وَتَنْسُوْنَ	اور تم بھول جاتے ہو	اَنْفُسَكُمْ	اپنے آپ کو	وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم
تَتْلُوْنَ	تلاوت کرتے ہو	الْكِتٰبِ	کتاب	اَفْلاَ	کیا پس نہیں
تَعْقِلُوْنَ (44)		تم سب عقل کرتے۔			

یعنی لوگوں کو تو رات پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم بھی موجود ہے۔ (ابن ابی حاتم عن ابن عباس:) حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کا حکم دیتے اور خود عمل نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عار دلائی۔“ اب مسلمانوں کا حال بھی بنی اسرائیل جیسا ہو گیا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو شخص خود عمل نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم نہ دے، کیونکہ یہود کو اس بات پر عار دلانی ہے کہ وہ عمل نہیں کرتے، اس پر نہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور جو شخص دعوت دے کہ خود عمل نہ کرے اسے دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا، اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی انتڑیاں آگ میں نکل کر ڈھیر ہو جائیں گی، وہ ان کے گرد ایسے گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد

گھومتا ہے۔ آگ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں! تیسرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا، میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ کام نہیں کرتا تھا اور تمہیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔ (بخاری) یاد رہے کہ اس آیت کی مراد وعظ و نصیحت کرنے والوں کو تقویٰ و پرہیزگاری پر ابھارنا ہے، بے عمل کو وعظ سے منع کرنا مقصود نہیں، یعنی یہ فرمایا ہے کہ جب دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے ہو تو خود بھی عمل کرو، یہ نہیں فرمایا کہ جب عمل نہیں کرتے تو وعظ و نصیحت کیوں کرتے ہو؟ کیونکہ عمل کرنا ایک واجب ہے اور دوسروں کو برائی سے روکنا دوسرا واجب ہے۔ اگر ایک واجب پر عمل نہیں تو دوسرے سے کیوں رُکا جائے۔ (بیضاوی، البقرة تحت الآية: ۱۰۴، ۳۱۶)

’نماز‘ تعلق مع اللہ کا عنوان

وَأَسْتَعِينُوا	اور تم مدد طلب کرو	بِالصَّبْرِ	صبر کے ساتھ
وَالصَّلَاةِ	اور نماز کے (ذریعے)	وَأَتَمُّهَا	اور بیشک وہ
لَكَبِيرَةٌ	البتہ بڑی (بوجھل) ہے	إِلَّا	سوائے
عَلَى الْخُشْعَيْنِ (45)		عاجزی کرنے والوں پر۔	

مصیبت اور پریشانی کی حالت میں صبر اور نماز کو اپنا شعار بنانے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی یاد میں جس قدر طبیعت مصروف ہو اسی قدر دوسری پریشانیاں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں صبر سے روزہ بھی مراد لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو خود بھی نماز میں مشغول ہوتے اور اپنے اہل بیت کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے۔

وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ”میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادات کی جامع ہے۔ نماز میں روحانی نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادات جمع ہیں۔ مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے اور طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء (علیہم السلام) کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر پوشی تو ہر حالت میں لازم ہے مگر

نماز کے دوران تو اور زیادہ مؤکدہ ہے۔ انسان بڑھتی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ تو گویا نماز میں انفاق جیسی عبادت بھی شامل ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان معصتکف ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں اعتکاف بھی شامل ہے نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی اسی طرح نماز میں شیطان کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان شہادتین کا تلم کرتا ہے اور کہتا ہے ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ جس کی انسان گواہی دیتا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض امام بیضاوی فرماتے ہیں، کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔ نماز تعلق مع اللہ کا عنوان ہے، مومن کے لئے یہی تعلق سب سے بڑا ہتھیار اور فتح و نصرت کی کلید ہے؛ اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف انسانی ضروریات سے متعلق نماز میں رکھی ہیں، بارش کے لئے استسقاء، سورج و چاند گرہن کے موقع پر کموف و خوف کی نماز، استغفار کے لئے نماز جنازہ، گناہ ہو جائے تو نماز توبہ، کسی معاملہ میں مفید اور غیر مفید پہلوؤں کی بابت تردد ہو تو نماز استخارہ اور کوئی بھی حاجت درپیش ہو تو نماز حاجت، صبر کے معنی برداشت کرنے کے ہیں، جب آدمی بے برداشت ہو جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بجائے مشتعل جذبات کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرتا ہے تو بے تدبیری اور بد تدبیری کا شکار ہو جاتا ہے، پس صبر، ہوش گوش کے ساتھ تدبیر کے مطابق کام کرنے کا نام ہے، اللہ کی طرف توجہ اور دنیا میں بنجیدہ تدبیر یہی کامیابی کی کلید ہے؛ اسی لئے ان دونوں کو خدا کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

آخرت میں مؤمنین کیلئے دیدار الہی کی نعمت

الَّذِينَ	جو	يُظُنُّونَ	وہ یقین رکھتے ہیں	أَتَتْهُمْ	کہ بیشک وہ
مُلِقُوا	ملنے والے ہیں	رَبِّهِمْ	اپنے رب کو	وَأَتَتْهُمْ	اور کہ بیشک وہ
إِلَيْهِ	اسی کی طرف	رُجِعُونَ (46)	لوٹنے والے ہیں		

یعنی جو لوگ مرنے کے بعد اپنے پروردگار سے ملنے اور اس کے حضور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں۔ ان کے لیے نماز کی ادائیگی کبھی مشکل نہیں ہوا کرتی بلکہ اگر کوئی نماز چھوٹ جائے یا نماز میں تاخیر ہو جائے تو ان کی طبیعت گراں بار ہو جاتی ہے اور جب تک وہ نماز ادا نہ کر لیں انہیں چین نہیں آتا اور جو لوگ روز آخرت پر پورا یقین نہیں رکھتے، ان کے لیے نماز ایک مصیبت اور مفت کی بیگار ہوتی ہے۔ اس آیت میں بشارت ہے کہ آخرت میں مؤمنین کو دیدار الہی کی نعمت نصیب ہوگی، نیز اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کی طرف رجوع میں ترغیب و ترہیب دونوں ہیں اور ان دونوں کو پیش نظر رکھنا نماز میں خشوع پیدا ہونے کا ذریعہ ہے، گویا نماز میں خشوع و خضوع قائم رکھنے کا حکم بھی دیا اور اس کے حصول کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو باجماعت نماز ادا کرنے کی اہتمام اور توفیق عطا فرمائے، (آمین)

سفارش پر تکیہ کرنا زری بے وقوفی ہے / فرعون کی بنی اسرائیل کو تعذیب کی وجہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ يٰبَنِيَّ
إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاِنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٤﴾
وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا
يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٧٥﴾ وَاذْكُرْ اَنۡجَيْنَاكُمْ مِّنۡ اِلٍ فِرْعَوْنَ
يَسُوۡمُوۡنَكُمْ سُوۡءَ الْعَذَابِ يُدۡخِلُوۡنَ اَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوۡنَ نِسَاءَكُمْ ؕ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمْ عَظِيۡمٌ ﴿٧٦﴾

اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم

یٰبَنِيَّ اِسْرَآءِيلَ	اے اولادِ اسرائیل	اذْكُرُوْا	تم یاد کرو
نِعْمَتِيَ الَّتِيْ	میری نعمت جو	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی
وَاِنِّيْ	اور بیشک میں	فَضَّلْتُكُمْ	میں نے فضیلت دی تم کو
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (47)	جہان والوں پر۔		

یہاں سے ایک بار پھر بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ

اللہ تعالیٰ کے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی اطاعت ترک کرنے سے ڈریں اور ان پر حجت پوری ہو جائے۔ یاد رہے کہ ان آیات میں بنی اسرائیل کے ان لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جو سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے مقدس زمانے میں موجود تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں یاد کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ یہ ہیں: (1)..... تمام اہل زمانہ پر فضیلت و برتری، (2)..... دریا میں راستہ بن جانا، (3)..... فرعون سے نجات، (4)..... تورات کا عطا ہونا، (5)..... پچھڑے کی پوجا پر معافی مل جانا، (6)..... ایک گروہ کامرنے کے بعد زندہ کیا جانا، (7)..... بادلوں سے سایہ ملنا، (8)..... مَن و سلویٰ نازل ہونا، (9)..... پانی کے بارہ چشمے جاری ہو جانا، (10)..... زمینی اناج عطا کیا جانا وغیرہ، یہ تمام نعمتیں ان کے آباؤ اجداد کو عطا کی گئی تھیں اور چونکہ جو نعمت آباؤ اجداد کو ملی ہو وہ ان کی اولاد کے حق میں بھی نعمت ہوتی ہے اس لئے ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ اے یعقوب کی اولاد! میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میرے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی پیروی کر کے اور ان کے دین میں داخل ہو کر میری ان نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ بنی اسرائیل کی نعمتوں کو سامنے رکھ کر امت محمدیہ پر ہونے والے انعامات کو شمار کریں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شکرگزاری کا تقاضا ہم سے کس قدر مطلوب ہے۔ اِنِّیْ فَضَّہٗ لِمُتَّکُم عَلَی الْعٰلَمِیْنَ: میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ اس سے مراد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے پہلے زمانوں کے لوگ ہیں، کیونکہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے تشریف لانے پر یہ فضیلت (کُنْتُ خَیْرُ اُمَّةٍ) [آل عمران: 110] فرما کر اس امت کو عطا کر دی گئی۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا: (خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ) ”سب سے بہتر میرے زمانہ کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے، پھر وہ جو ان سے ملیں گے۔“ (بخاری)

بہر حال یہاں پر بنی اسرائیل کی جہان والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے قرآن پاک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت

سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دور میں دینی اور دنیوی ہر دو لحاظ سے باقی اقوام پر برتری حاصل تھی۔ اس زمانے میں اس قوم میں صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔ اور ان کی علمی حیثیت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے۔ برخلاف اس کے ہندو قوم ہزاروں برس تک برسرِ اقتدار رہی ہے۔ مگر سوائے چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ غامی خود ہندو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیین ﷺ کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنے زریں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبری (رحمہ اللہ) تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ ابن خلدون (رحمہ اللہ) اور ابن کثیر رحمہ اللہ، آٹھویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیر (رحمہ اللہ) جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مفسر بھی ہیں اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہم ہیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ استفادہ نہیں ہو پاتے۔ جب سے انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اسے اب یورپ کے افراد پر فخر

ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اسے محفوظ کرنے کی تگ و دو ہوتی ہے۔

اُمتِ محمدیہ خیر اُمت

الغرض! اسلام سے پہلے ایک طویل عہد تک جب کہ دنیا میں ہر طرف شرک اور بت پرستی چھائی ہوئی تھی، صرف بنی اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور ان کے درمیان یکے بعد دیگرے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا، توحید کے حامل ہونے اور انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے وہ یقیناً اس وقت تمام عالم پر فضیلت رکھتے تھے؛ لیکن یہ فضیلت ایمان و عمل کی بنیاد پر تھی، نہ کہ رنگ و نسب کی وجہ سے؛ اسی لئے جب خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اور بنی اسرائیل نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، تو فضیلت کا یہ تاج ان کے سر سے اُتار کر اُمتِ محمدیہ کے سر پر رکھ دیا گیا، اب بنو اسرائیل 'مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ' اور 'ضَالِّينَ' ٹھہرے اور اُمتِ محمدیہ خیر اُمت کے لقب سے سرفراز کی گئی۔ (آل عمران: ۱۱۰) مستند احادیث میں نبی کریم ﷺ نے مَغْضُوبٌ عَلَیْہِم سے مراد یہودیوں کی قوم کو لیا ہے، کیونکہ انہیں اللہ کی طرف سے شریعت اور علم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق اور سچائی کا علم رکھنے کے باوجود اسے قبول نہ کریں، حبان بوجھ کر نافرمانی کریں یا اسے پس پشت ڈال دیں۔ علماء کرام کے نزدیک یہ اصطلاح ہر اس شخص یا گروہ پر صادق آتی ہے جو حق حبانے کے باوجود ضد، عناد یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستے پر گامزن رہے۔

شفاعت کن لوگوں کے حق میں مقبول ہوگی

وَاتَّقُوا	اور تم ڈرو	يَوْمًا	اس دن سے	لَا تَجْزِي	نہ کام آئے گی
نَفْسٍ	کوئی جان	عَنْ نَفْسٍ	کسی جان کے	شَيْئًا	کچھ بھی
وَلَا يُقْبَلُ	اور نہ قبول کی جائے گی	مِنْهَا	اس سے	شَفَاعَةً	کوئی سفارش
وَلَا يُؤْخَذُ	اور نہ لیا جائے گا	مِنْهَا	اس سے	عَدْلٌ	کوئی معاوضہ

وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يُنْصَرُونَ (48)	مدد کئے جائیں گے۔
------------	-----------	------------------	-------------------

نعمت یاد دلانے کے بعد انھیں قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔ بنی اسرائیل میں فساد کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے انبیاء اور علماء پر ناز کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کتنے ہی گناہ کر لیں ہمارے بزرگ اور آباء و اجداد ہمیں بخشوا لیں گے، ان کے اسی باطل گمان کی تردید کی گئی ہے۔ کسی گرفتار شخص کو چھڑانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، کسی کی سفارش کام آجائے، یا فدیہ دے کر چھڑا لیا جائے، یا زبردستی حملہ کر کے چھڑا لیا جائے، قیامت کے دن ان میں سے کوئی بھی ممکن نہیں۔ فرمایا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی کی ہے کہ روز قیامت کفار اور نافرمانوں کے حق میں کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ یہاں ان لوگوں کا رد کیا گیا ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ دنیا میں کسی بھی قسم کے عقائد یا گناہوں میں ملوث رہیں، لیکن آخرت میں ان کے بزرگ یا سفارشی انہیں بچا لیں گے۔ مختلف تفاسیر کے مطابق، ایسی شفاعت (سفارش) صرف ان کے لیے مسترد کی جائے گی جو ایمان سے محروم ہوں گے۔ شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش برحق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش ہوگی اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کافر کے حق میں سفارش مفید نہیں ہوگی۔ کسی کافر سے سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری سفارش برحق ہے۔ اور یہ میری امت کے ہر اس شخص کو پہنچے گی۔ ”مَنْ لَا يُشْفِرُكَ بِاللَّهِ شَيْئًا“ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ یہ توحید کی بنیاد اور مغفرت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں اس عقیدے کے حاملین کے لیے دنیا اور آخرت میں بہت بڑی بشارتیں دی گئی ہیں، مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی۔ عقیدہ صحیح ہوگا۔ مشرک اور کافر نہیں ہوگا تو سفارش مفید ہوگی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کافر کو نہ کوئی کافر نفع پہنچا سکے گا اور نہ کوئی مسلمان، اس دن شفاعت صرف مسلمان کیلئے ہوگی جیسا کہ دیگر آیات میں بیان ہوا البتہ یہ

بات یاد رکھنی چاہئے کہ شفاعت کی امید پر گناہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اچھے ڈاکٹر کے مل جانے کی امید پر کوئی زہر کھالے یا ہڈیوں کے ماہر ڈاکٹر کے ملنے کی امید پر گاڑی کے سپنجے آکر سارے بدن کی ہڈیاں تڑوالے۔ یعنی دنیا میں مدد کے جتنے طریقے ہیں، وہ سب کام نہ آئیں گے، یہود سمجھتے تھے کہ اپنے بزرگوں کی سفارش سے ان کا کام چل جائے گا اور عیسائیوں کا خیال تھا کہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کی قربانی ان کے لئے فدیہ نجات کا کام کرے گی، ان سب کی تردید ہو گئی، مسلمان بھی ضرور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں؛ لیکن یہ شفاعت بھی صرف انھیں کے حق میں مقبول ہوگی، جن کے لئے خود اللہ تعالیٰ اجازت دیں (البقرہ: ۲۵۵) اور یہ اجازت ایمان اور عمل صالح کی بنا پر ہوگی۔

’آلِ فرعون‘ سے مراد ’فرعون‘ نام نہیں بلکہ لقب تھا

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ	اور جب ہم نے نجات دی تمہیں	مِّنْ اِلٰی فِرْعَوْنَ	آلِ فرعون سے
یَسُوْمُوْنَكُمْ	وہ پہنچاتے تھے تمہیں	سُوْءَ الْعَذَابِ	بُرْ اعداب
یُكَلِّمُوْنَ	وہ ذبح کرتے تھے	اَبْنَاءَ كُمْ	تمہارے بیٹوں کو
وَيَسْتَحْيُوْنَ	اور وہ زندہ چھوڑ دیتے تھے	نِسَاءَ كُمْ	تمہاری عورتوں کو
وَفِیْ ذٰلِكُمْ	اور اس میں	بَلَاءٌ	آزمائش (تھی)
مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے	عَظِیْمٌ (49)	بہت بڑی۔

’آلِ فرعون‘ سے صرف فرعون کی اولاد مراد نہیں ہے؛ بلکہ اس کی پیروی کرنے والے بھی مراد ہیں، ’فرعون‘ نام نہیں؛ بلکہ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد میں بنی اسرائیل جن شاہانِ مصر کے زیرِ عتاب آئے، وہ یکے بعد دیگرے دو فرمازواتھے۔ جس طرح فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ، روم کے بادشاہ کا قیصر اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی تھا اسی طرح قبطی اور عجمی لفظ قوم سے تعلق رکھنے والے مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے فرعون کا نام ولید بن مضعب بن ریان تھا اور

اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔ اس کی عمر چار سو سال سے زیادہ ہوئی، نیز اس آیت میں آل فرعون سے اس کے پیروکار مراد ہیں۔ يُذَيِّجُونَ آبْنَاءَكُمْ: وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے۔ فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ آئی اور اس نے مصر کو گھیر کر تمام قبیلوں کو جلا ڈالا جبکہ بنی اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس خواب سے اسے بڑی وحشت ہوئی، اس کے کاہنوں نے تعبیر دی تھی کہ ایک اسرائیلی لڑکا فرعون کی سلطنت اور مذہب کو نیست و نابود کر دے گا، اس خبر پر فرعون نے عام حکم جاری کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے یہاں جو لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو رہنے دیا جائے، کہ ایک تو ان سے یہ خطرہ نہیں تھا، دوسرے ان سے خدمت لینے اور اپنے حرم میں لانے کا فائدہ بھی متعلق تھا، بائبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے یوں ہزاروں کی تعداد میں بچے قتل کئے گئے۔ قدرت الہی سے اس قوم کے بوڑھے جلد مرنے لگے تو قبیلہ سرداروں نے گہرا کفر فرعون سے شکایت کی کہ ایک طرف بنی اسرائیل میں موت کی کثرت ہو گئی ہے اور دوسری طرف ان کے بچے بھی قتل کئے جا رہے ہیں، اگر یہی صورت حال رہی تو ہمیں خد متنا کر کہاں سے ملیں گے؟ اس پر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال بچے قتل کئے جائیں اور ایک سال چھوڑ دینے جائیں تو جو سال چھوڑنے کا تھا اس میں حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوئے اور قتل کے سال حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت ہوئی۔ یہ واقعہ سورہ قصص کے پہلے رُوع میں کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ: اور اس میں آزمائش تھی۔ ”بلا“ امتحان و آزمائش کو کہتے ہیں اور آزمائش نعمت سے بھی ہوتی ہے اور شدت و محنت سے بھی۔ نعمت سے بندے کی شکرگزاری اور محنت و مشقت سے اس کے صبر کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ اس آیت میں اگر ”ذٰلِكُمْ“ کا اشارہ فرعون کے مظالم کی طرف ہو تو ”بلا“ سے محنت و مصیبت مراد ہوگی اور اگر ان مظالم سے نجات دینے کی طرف اشارہ ہو تو ”بلا“ سے نعمت مراد ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنی نعمتوں کی قدر دانی نصیب فرمائے۔ (آمین)

گو سالہ پرستوں کا قتل عام / مرتد کی سزا قتل کیوں ہے؟

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾
وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ
ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا
مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ
إِنِّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا
أَنْفُسَكُمْ ۖ ذَلِكُمْ خَبِيرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۖ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا

وَإِذْ	اور جب	فَرَقْنَا	ہم نے پھاڑا	بِكُمْ	تمہاری وجہ سے
الْبَحْرَ	سمندر (کو)	فَأَنْجَيْنَاكُمْ	پس ہم نے نجات دی تمہیں		
وَأَغْرَقْنَا	اور ہم نے غرق کر دیا	آلَ فِرْعَوْنَ	آلِ فرعون (کو)		
وَأَنْتُمْ	اس حال میں کہ	تَنْظُرُونَ (50)	تم دیکھ رہے تھے۔		

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ: اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا۔ یہ دوسری نعمت کا

بیان ہے جو بنی اسرائیل پر فرمائی کہ انہیں فرعونوں کے ظلم و ستم سے نجات دی اور فرعون کو اس کی قوم سمیت ان کے سامنے غرق کر دیا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حکم الہی پر رات کے وقت بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صبح کو فرعون ان کی جستجو میں ایک بھاری لشکر لے کر نکلا اور انہیں دریا کے کنارے پر پالیا، بنی اسرائیل نے فرعون کے لشکر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فریاد کی، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سمندر پر اپنا عصا مارا۔ اس کی برکت سے عسین دریا میں بارہ خشک راستے پیدا ہو گئے اور پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا اور ان آبی دیواروں میں جالی کی مثل روشدان بن گئے۔ بنی اسرائیل کی ہر جماعت ان راستوں میں ایک دوسری کو دیکھتی اور باہم باتیں کرتی گزر گئی۔ فرعون بھی اپنے لشکر سمیت ان سمندری راستوں میں داخل ہو گیا لیکن جب اس کا تمام لشکر سمندر کے اندر آ گیا تو سمندر اپنی اصلی حالت پر آیا اور تمام فرعونوں اس میں غرق ہو گئے اور بنی اسرائیل سمندر کے کنارے فرعونوں کے غرق کا منظر دیکھ رہے تھے۔ (قرطبی، البقرة تحت الآية: ۵۱، ۱ / ۳۱۸-۳۱۹، بیضاوی، البقرة تحت الآية: ۵۱، ۱ / ۳۲۲، ملقطاً)

فرعونوں کی غرقابی کا دن

فرعونوں کا غرق ہونا محرم کی دسویں تاریخ کو ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دن شکر کا روزہ رکھا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: جب حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ کیا ہے؟ یہودیوں نے عرض کی: یہ نیک دن ہے، یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس دن روزہ رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”تمہاری نسبت موسیٰ سے مسیدر تعلق زیادہ ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس دن روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم

ارشاد فرمایا۔ (بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء، ۱/ ۶۵۶، الحدیث: ۲۰۰۴، مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، ص ۵۷۲، الحدیث: ۱۲۸ (۱۱۳۰))

دس محرم کا روزہ میں یہودیوں کی مخالفت

البتہ صرف دس محرم کا روزہ نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ آگے یا پیچھے ایک روزہ ملایا جائے جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ رکھو اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرو، عاشوراء کے دن سے پہلے یا بعد میں ایک دن کا روزہ رکھو۔ (مسند امام احمد، ۱/ ۵۱۸، الحدیث: ۲۱۵۴) بہر حال اسی واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَاعْرِضْنَا آلَ فِرْعَوْنَ" ہم نے تمام فرعونوں کو غرق کر دیا، "وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ" اور یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میرے اس احسان کو یاد کرو۔ جب تمہارے لئے سمندر میں راستے بنادیے جن کے ذریعے تم نے سمندر کو عبور کر لیا اور فرعونوں سے نجات پالی۔ مگر اس پانی میں فرعون کے سارے لشکر کو تمہارے سامنے غرق کر دیا۔ ان احسانات کو یاد دلانے کا مقصد یہ تھا کہ اب بھی اپنی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ اور اس دن سے ڈ جاؤ۔ جس دن نہ کوئی سفارش کام آئیگی اور نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تمہارے اوپر نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔

طورِ سینین اور وادیِ مقدس

وَإِذْ	اور جب	وَعَدْنَا	ہم نے وعدہ کیا	مُوسَى	موسیٰ سے
أَرْبَعِينَ	چالیس	لَيْلَةً	راتوں کا	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ	پھر تم نے پکڑا
الْعِجْلَ	بجھڑا	مِنْ بَعْدِهِ	اس کے بعد	وَأَنْتُمْ	حالانکہ تم
ظَلِمْتُمْ (51)			ظلم کرنے والے تھے۔		

مصریوں سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کو شریعت خداوندی کی ضرورت پڑی، تو حید

پردہ پہلے ہی سے قائم تھے، اب حلال و حرام کے احکام کی ضرورت تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور نامی پہاڑ کی چوٹی پر طلب فرمایا کہ یہاں چالیس روز معتکف ہوں، کوہ طور مصر کے جزیرہ نماسینا میں واقع وہ تاریخی اور مقدس پہاڑ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور انھیں آسمانی کتاب (تورات) عطا کی۔ عربی اور سریانی زبان میں طور کا مطلب پہاڑ ہے۔ کوہ طور کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں متعدد بار اس کا ذکر آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ کی قسم بھی کھائی ہے (مثلاً سورۃ الطور اور سورۃ التین میں)۔ قرآن میں اسے 'طور سینین' اور وادی مقدس طوی کے ناموں سے بھی پکارا گیا ہے، بہر حال اسی درمیان بنی اسرائیل نے مصریوں یا کنعانیوں کی گوسالہ پرستی سے متاثر ہو کر سونے کا ایک بچھڑا بنا لیا اور اس کی پوجا شروع کر دی، جب موسیٰ (علیہ السلام) چالیس روز کے لیے کوہ طور پر معتکف ہو گئے فرمایا: "ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مَوْجِبَ بَعْدٍ" تم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵﴾" اور تم بڑے ظالم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ "إِنَّ إِلَهَكُمْ لَظَلَمٌ عَظِيمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: "وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ" کفر کرنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتے ہیں۔ سورہ طہ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔ انسان کتنا ظاہر پرست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے باوجود اور نبیوں (حضرت ہارون و موسیٰ علیہما السلام) کی موجودگی کے باوجود بچھڑے کو اپنا (معبود) سمجھ لیا۔ آج کا مسلمان بھی شرکیہ عقائد و اعمال میں بری طرح مبتلا ہے، لیکن وہ سمجھتا ہے کہ مسلمان مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان مشرک مسلمانوں نے شرک کو پتھر کی مورتیوں کے پجاریوں کے لئے خاص کر دیا ہے کہ صرف وہی مشرک ہیں۔ جب کہ یہ نام نہاد مسلمان بھی قبروں پر قبوں کے ساتھ

وہی کچھ کرتے ہیں جو پتھر کے پجاری اپنی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُ
 بچھڑے کی عبادت جیسا سنگین گناہ

ثُمَّ	پھر	عَفَوْنَا	ہم نے درگزر کر دیا	عَنْكُمْ	تم سے
مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ	اس کے بعد	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم		
تَشْكُرُونَ (52)			شکر گزار بن جاؤ۔		

یہ آیت بنی اسرائیل کے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہ
 طور پر تشریف لے گئے، اور ان کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل نے سونے کے بچھڑے کو اپنا
 معبود بنا لیا۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا، لیکن جب انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم فضل اور
 کرم سے انہیں معاف فرما دیا۔ یعنی جب موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان
 ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ
 ہمارے اس جرم کا از الہ کس طرح ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ”ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ
 بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ کی تفسیر میں مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ بنی اسرائیل نے
 جب بچھڑے کی عبادت جیسا سنگین گناہ کیا، تو اللہ نے سخت سزا کے باوجود ان کی توبہ قبول کی اور ان
 کے گناہ مٹا دیے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ کا معنی ہے کہ اللہ نے تمہیں یہ معافی اس لیے دی کہ تم اس
 کی نعمت کا شکر ادا کرو اور آگے بڑھ کر اطاعت کرو۔

فرقان سے مراد اور فرقان کے معنی

وَإِذْ	اور جب	اتَيْنَا	ہم نے دی	مُوسَىٰ	موسیٰ کو	الْكِتَابَ	کتاب
وَالْفُرْقَانَ	اور معجزے	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم	تَهْتَدُونَ (53)	سب ہدایت پالو۔		

فرقان کے معنی اس چیز کے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتی ہو، اب یا تو یہ کتاب
 یعنی تورات ہی کی تفسیر ہے، یا تورات کے احکام و قوانین مراد ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی

اسرائیل کی وہ مدد گئی جو ان کو فتح مند اور ان کے دشمنوں کو مغلوب کرتی جاتی تھی یا حضرت موسیٰ کو عطا ہونے والے خصوصی معجزات مراد میں، جیسے عصا اور ید بیضا کا معجزہ، الغرض الْفُرْقَان: فرق کرنا۔ فرقان کے کئی معانی کہنے گئے ہیں: (1) فرقان سے مراد بھی تورات ہی ہے۔ (2) کفر و ایمان میں فرق کرنے والے معجزات جیسے عصا اور ید بیضاء وغیرہ۔ (3) حلال و حرام میں فرق کرنے والی شریعت مراد ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ اس جملے کا جامع مفہوم یہ بنتا ہے: "تا کہ تم سیدھا راستہ پالو، ہدایت یافتہ ہو جاؤ، اور مقصود حق تک پہنچ سکو۔"

شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا

وَإِذْ قَالَ	اور جب کہا	مُوسَىٰ	موسیٰ نے	لِقَوْمِهِ	اپنی قوم سے
يَقَوْمِ	اے میری قوم	إِنَّكُمْ	بیشک تم	ظَلَمْتُمْ	تم نے ظلم کیا
أَنْفُسَكُمْ	اپنے نفسوں پر	بِاتِّخَاذِكُمْ	تمہارے معبود پکڑنے کے سبب		
الْعِجْلِ	بجھڑے کو	فَتَوَبُّوْا	تم رجوع کرو	إِلَىٰ بَارِئِكُمْ	اپنے پروردگار کی طرف
فَاقْتُلُوا	پس تم قتل کرو	أَنْفُسَكُمْ	اپنی جانوں کو		
ذَلِكُمْ	یہی	خَبِيرٌ لَّكُمْ	بہتر ہے تمہارے لئے		
عِنْدَ بَارِئِكُمْ	تمہارے پروردگار کے نزدیک	فَتَابَ	تو اس نے رجوع کیا		
عَلَيْكُمْ	تم پر	إِنَّهُ	بیشک وہ	هُوَ التَّوَّابُ	ہی بہت توبہ قبول کرنے والا
الرَّحِيمُ (54)			بڑا مہربان ہے۔		

شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا قتل تھی؛ اس لئے حکم ہوا کہ جو لوگ بجھڑے کی پوجا کرنے کے گناہ سے بچے رہے، وہ اپنے ان قریبی لوگوں کو قتل کر دیں، جو شرک اور گناہ پرستی کے مرتکب ہوئے ہیں، فرمایا: فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ: کہ تم اپنے لوگوں کو قتل کرو۔ بنی اسرائیل کو بجھڑا پوجنے کے گناہ سے یوں معافی ملی کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قوم سے فرمایا: تمہاری توبہ

کی صورت یہ ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی ہے وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں اور مجرم راضی خوشی سکون کے ساتھ قتل ہو جائیں۔ وہ لوگ اس پر راضی ہو گئے اور صبح سے شام تک ستر ہزار قتل ہو گئے، تب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام نے گڑگڑاتے ہوئے بارگاہِ حق میں ان کی معافی کی التجاء کی۔ اس پر وحی آئی کہ جو قتل ہو چکے وہ شہید ہوئے اور باقی بخش دیئے گئے، قاتل و مقتول سب جنتی ہیں۔ (تفسیر عربی (مترجم)، البقرہ تحت الآیۃ: ۵۴، ۱/ ۴۳۹-۴۴۲، ملخصاً) اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک کرنے سے مسلمان مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر رہا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا باغی ہوا اسے قتل کر دینا ہی حکمت اور مصلحت کے عین مطابق ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں یہ قانون نافذ ہے کہ جو اس ملک کے بادشاہ سے بغاوت کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ اس قانون کو انسانیت کے تمام علمبردار تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف کسی طرح کی کوئی آواز بلند نہیں کرتے، جب دنیوی بادشاہ کے باغی کو قتل کر دینا انسانیت پر ظلم نہیں تو جو سب بادشاہوں کے بادشاہ اللہ تعالیٰ کا باغی ہو جائے اسے قتل کر دیا جانا کس طرح ظلم ہو سکتا ہے۔ اور یہ ظلم آلِ فرعون کے مظالم سے بھی زیادہ شدید ہیں کیونکہ یہ افعال ان سے بعد ایمان سرزد ہوئے، اس وجہ سے وہ متحق تو اس کے تھے کہ عذاب الہی انہیں مہلت نہ دے اور فی الفور ہلاک کر کے کفر پر ان کا خاتمہ کر دے لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کے طفیل انہیں توبہ کا موقع دیا گیا، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اور یہ قتل ان کے لیے کفارہ تھا۔

بنی اسرائیل کے کئی جرم

بہر حال بچھڑا بنا کر پوجنے میں بنی اسرائیل کے کئی جرم تھے: (۱)..... مجسمہ سازی جو حرام ہے۔ (۲)..... حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نافرمانی۔ (۳)..... بچھڑے کی پوجا کر کے شرک ہو جانا۔ ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ“۔ اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں جان بوجھ کر شرک کروں اور تجھ سے معافی مانگتا ہوں اس شرک سے جسے میں انجانے میں کروں۔ (رواہ البخاری فی الادب المفرد 739 و صححه (الالبانی)

منتخب ستر آدمیوں کی موت اور دوبارہ زندگی /

بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمْ الصَّيْعَةُ
وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّٰ وَ السَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ۝ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ وَ اِذْ قُلْنَا اَدْخُلُوْا
هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَاْكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَ اَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا
حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْئَتَكُمْ ۝ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا
غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلٰى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ۝

بقائمی ہوش و حواس کلام الہی سننے کی فرمائش

وَ اِذْ	اور جب	قُلْتُمْ	تم نے کہا	یٰمُوسٰى	اے موسیٰ	لَنْ	ہرگز نہیں
نُّؤْمِنَ	ہم ایمان لائیں گے	لَكَ	تجھ پر	حَتّٰى	یہاں تک کہ		

نَرَى اللَّهَ	ہم دیکھ لیں اللہ کو	جَهْرَةً	ظاہراً	فَاَخَذَتْكُمْ	تو پکڑ لیا تمہیں
الصُّعِقَةُ	بجلی نے	وَاَنْتُمْ	اور تم	تَنْظُرُونَ (55)	تم سب دیکھ رہے تھے۔

جب موسیٰ (علیہ السلام) تورات لے کر وہ طور سے واپس لوٹے اور قوم کے سامنے کتاب پیش کی تو کہنے لگے۔ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کتاب واقعی منزل من اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ فی الواقع آپ سے ہم کلام ہوا تھا۔ اس صورت حال سے موسیٰ (علیہ السلام) سخت پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ ستر آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ طور پہاڑ پر لے آؤ۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کئے اور انہیں اپنے ہمراہ طور پر لے گئے کہ وہ خود باقائمی ہوش و حواس کلام الہی کو سن لیں۔ پھر جب انہوں نے کلام الہی سن لیا تو کہنے لگے: موسیٰ (علیہ السلام) پر دے میں سننے کا ہمیں کچھ اعتبار نہیں اور ہم تو جب تک اللہ کو صاف صاف دیکھ نہ لیں، تمہاری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔

تفسیری روایات اور بائبل کی ہدایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی توراۃ کو کتاب الہی تسلیم نہ کیا، ”فَاَخَذَتْكُمْ الصُّعِقَةُ“ تو انہیں بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ یکدم بجلی چمکی اور سب کو فنا کر گئی اور جو ان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ”وَاَنْتُمْ تَنْظُرُونَ“ ۵۵۔ ”کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی حضور ﷺ کا فرمان ہے ”تم مرے بغیر اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رویت تمام محدثین اور فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے ”وَجُودَ كَيْفَ مَبْدِئًا خَيْرٌ إِلَى رَبِّهِمْ مَا نَظَرُوا“ کئی چہرے ان دن تروتازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ اس سے مراد مومنین کے چہروں کی وہ بے مثال خوبصورتی، تروتازگی اور نورانیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت، بخشش اور انعامات کو

دیکھ کر ان پر طاری ہوگی، مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ آخرت میں مومنین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، یہی اہل سنت کا عقیدہ ہے اور اس پر قرآن و حدیث اور اجماع کے کثیر دلائل قائم ہیں اور یہ دیدار کسی کیفیت اور جہت کے بغیر ہوگا۔ صحیح بخاری و مسلم کی متفقہ احادیث میں بھی اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ مومنین روز قیامت اللہ تعالیٰ کا دیدار بالکل ایسے ہی واضح طور پر کریں گے جیسے چودھویں کا چاند یا بے بادل سورج دیکھا جاتا ہے۔

موت کی بعد کی زندگی اس پر اشکال

ثُمَّ	پھر	بَعَثْنَكُمْ	ہم نے زندہ کیا تمہیں
مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ	تمہاری موت کے بعد	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم
تَشْكُرُونَ (56)		تم شکر گزار بن جاؤ۔	

جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بجلی پڑی اور ستر کے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب موسیٰ (علیہ السلام) کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی جیسا کہ سورہ اعراف میں آیا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دعائی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی وجہ سے میری ذات پر کوئی حرف نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا تو وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی لے جا کر مسروا دیے۔ اے مولا کریم! مہربانی فرما! نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔

ثُمَّ بَعَثْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ” پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ صریح الفاظ موجود ہیں۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض تو جہہ کرتے ہیں کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سکتے پڑ گیا تھا۔ پھر ہوش میں آ گئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ ” سے واضح ہے کہ ان لوگوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے (1)۔ تفسیر

ابن کثیر ج 1 ص 93) کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ راکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پورے کے پورے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا“ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٩٣﴾ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ الغرض! ان ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا کہ ہم ہی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی گستاخی نہیں کرنی چاہئے تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے اس کے بعد انہوں نے قوم میں آ کر گواہی دی کہ بیشک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

من وسلوی کی حقیقت

وَضَلَّلْنَا	اور ہم نے سایہ کیا	عَلَيْكُمْ	تم پر	الْغَمَامَ	بادل کا
وَأَنْزَلْنَا	اور ہم نے نازل کیا	عَلَيْكُمْ	تم پر	الْمَنِّ وَالسَّلْوَى	من اور سلوی
كُلُّوا	تم سب کھاؤ	مِنْ طَيِّبَاتِ	پاکیزہ چیزوں سے		
مَا رَزَقْنَكُمْ	جو ہم نے عطا کی ہیں تمہیں	وَمَا	اور نہیں		
ظَلَمُونَا	انہوں نے ظلم کیا ہم پر	وَلَكِنْ	اور لیکن	كَانُوا	وہ سب تھے
أَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ پر	يَظْلِمُونَ (57)	وہ ظلم کرتے		

یہ واقعہ تفصیل سے سورہ مائدہ میں آئے گا مختصر یہ کہ موسیٰ (علیہ السلام) جب بنی اسرائیل کو لے کر وادی سینا میں پہنچے تو اس وقت یہ قوم لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا منشاء یہ تھا کہ وہ بیت المقدس کو جو ان کا قبلہ تھا مشرک قوموں سے پاک کریں اور اس کو پھر سے توحید کا مرکز بنائیں، لیکن جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر بیت المقدس کے پاس پہنچے اور انہوں نے قوم عموالہ (جو اس وقت بیت المقدس پر قابض تھے) کا ڈیل ڈول دیکھا تو جہاد سے

صاف انکار کر دیا، اس کی سزا ان کو یوں ملی کہ ان کے چالیس برس ایک صحرائی میدان میں اس طرح گزرے کہ صبح سے شام تک پھرتے رہتے اور منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم رہتے، اس صحرا میں نہ کوئی مکان تھا، نہ ہر ابھر درخت، نہ کوئی کھانے کی چیز ہی میسر تھی، خدائے کریم نے اس سرکش قوم پر اُس وقت بھی رحم کھایا، دھوپ سے بچاؤ کا یہ سامان فرمایا کہ ان پر مستقل بادلوں کا سایہ کر دیا، بابل میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح جہاد سے انکار کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ملک شام کی فتح چالیس سال تک کے لئے موخر کر دی۔ تاکہ اس عرصہ میں یہ بزدل نسل مر کھپ جائے اور آئندہ جو نسل اس بیابان اور آزادانہ فضا میں پیدا ہو۔ اس میں کچھ ہمت اور جرأت پیدا ہو اور جہاد کے قابل بن جائیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اس بیابان میں نہ کوئی مکان تھے اور نہ سامان خورد و نوش اور لوگ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ اور خوراک کا یہ انتظام فرمایا کہ کثیر تعداد میں من و سلوی نازل فرمایا۔ من ایک میٹھی چیز تھی جو دھنیے کے بیج جیسی تھی اور رات کو اس کی شکل میں نازل ہوتی تھی اور سلوی بیٹر کی قسم کے پرندے تھے جنہیں یہ لوگ بھون کر اور کباب بنا کر کھاتے تھے اور یہ غذائیں بلا مشقت انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کثیر مقدار میں اس طویل عرصہ میں ملتی رہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قوم پر خاص انعامات تھے۔ ورنہ جو مایوس کن جواب انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دیا تھا۔ اگر اللہ چاہتا تو اس کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیتا اور پھر اس جزیرہ میں اس طرح زندگی بسر کرنا بھی ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسی جنگل میں سیدنا ہارون (علیہ السلام) کی وفات ہوئی۔ پھر ایک سال بعد سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کی بھی وفات ہوئی تھی۔

تحریف کلام الہی کی سزا

وَاذْ	اور جب	قُلْنَا	ہم نے کہا	ادْخُلُوا	داخل ہو جاؤ
هَذِهِ الْقَرْيَةَ	اس بستی میں	فَكُلُوا	پھر تم کھاؤ	مِنْهَا	اس سے
حَيْثُ	جہاں سے	يَشْتُمُّ	تم چاہو	رَغَدًا	اطمینان سے
وَاَدْخُلُوا	اور تم داخل ہو جاؤ	الْبَابِ	دروازے (میں)		

سَجْدًا	سجدہ کرتے ہوئے	وَقُولُوا	اور تم کہو	حِطَّةً	بخش مانگنا
تَغْفِرْ لَكُمْ	ہم معاف کر دیں گے تم سے	خَطِيئَتُكُمْ	تمہاری خطائیں	وَسَنُؤَيِّدُ	اور عنقریب ہم زیادہ دیں گے
الْمُحْسِنِينَ (58)	نیکی کرنے والوں کو۔				

اس آیت میں تحریف کلام الہی کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ جب حضرت یوشع (علیہ السلام) کا زمانہ آیا تب بنی اسرائیل نے اریکا شہر کو فتح کیا، مگر بتائے ہوئے لفظ کو بدل کر اور غرور و نخوت سے شہر میں داخل ہوئے۔ حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخلہ کے وقت ”حِطَّةً“ یعنی استغفار کہنا مگر بنی اسرائیل نے اس کو ”حِطَّةً“ کہنا شروع کر دیا مزید نافرمانی یہ کی کہ بجائے عاجزی و انکساری کے اکڑتے ہوئے نخوت و غرور کا اظہار کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اس صریح نافرمانی کی بدولت ان پر عذاب الہی نازل ہوا، طاعون کی بیماری پھوٹ پڑی اور ستر ہزار اسرائیلی اس عذاب کا شکار ہو گئے۔ اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہیے نہ کہ نافرمانی اور غرور کا مظاہرہ کریں تو ایسی صورت میں عذاب الہی ضروری ہو جاتا ہے جو لوگ تکبر کرتے ہیں۔ اللہ انہیں پسند نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے بنی اسرائیل کے قصہ سے صاف عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو سبق سکھا رہا ہے کہ وہ کس قدر کرم نواز ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ بدکار، نافرمان اور ظالم انسانوں کو سزا ہی نہ دے۔ بار بار معاف کرنا اور سزا دے کر سمجھانا یہ شان کریمی نہیں تو اور کیا ہے، نخوت غرور بے راہ روی اور نافرمانی یقیناً قوموں کے زوال کا باعث بنتی ہے۔ استغفار کرتے رہنا چاہیے اور دعا مانگتے رہنا چاہیے انسان کی بھلائی اسی میں ہے کیونکہ گناہ اندھیرا ہے اور توبہ روشنی اور گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی گناہ انسان کے دل و روح پر تاریکی اور بوجھ پیدا کرتا ہے، جبکہ توبہ اس تاریکی کو مٹا کر روشنی، سکون اور پاکیزگی بحال کرتی ہے۔ یہ روحانی اور اخلاقی اندھیرے سے اجالے کی طرف لوٹنے کا وہ خوبصورت عمل ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ معافی عطا فرماتا ہے۔

احکام الہی سے تمسخر اور مذاق

فَبَدَّلَ	پھر بدل ڈالا	الَّذِينَ	جنہوں نے	ظَلَمُوا	ظلم کیا
قَوْلًا	بات کو	غَيْرَ الَّذِي	علاوہ جو	قِيلَ لَهُمْ	کہی گئی اُن سے
فَأَنزَلْنَا	تو ہم نے نازل کیا	عَلَى الَّذِينَ	(اُن) پر جن		
ظَلَمُوا	سب نے ظلم کیا	رَجْزًا	عذاب	مِّنَ السَّمَاءِ	آسمان سے
يَمَنًا	اس وجہ سے جو	كَانُوا	وہ تھے	يَفْسُقُونَ (59)	وہ سب نافرمانی کرتے۔

اس کی وضاحت ایک حدیث میں آتی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا ان کو حکم دیا گیا کہ سجدہ کئے ہوئے داخل ہوں، لیکن وہ سرول کو زمین میں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حکم بجالانے کی بجائے ان سے ان کی سرتابی و سرکشی کا جو ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور احکام الہی سے تمسخر اور مذاق جس کا ارتکاب انہوں نے کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے جب کوئی قوم کردار کے لحاظ سے زوال پذیر ہو جائے تو اس کا معاملہ پھر احکام الہی کے ساتھ اسے طرح کا ہو جاتا ہے، یہ آسمانی عذاب کیا تھا؟ بعض نے کہا غضب الہی، بعض نے کہا کہ، طاعون۔ اس کی آخری معنی کی تائید حدیث سے ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا یہ طاعون اسی رجز اور عذاب کا حصہ ہے جو تم سے پہلے بعض لوگوں پر نازل ہوا۔ تمہاری موجودگی میں کسی جگہ یہ طاعون پھیل جائے تو وہاں سے مت نکلو اور اگر کسی اور علاقے کی بابت تمہیں معلوم ہو کہ وہاں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے طرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو بتایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام فرمایا۔

بارہ چشموں کا پھوٹنا / استسقاء کی حقیقت / فساد فی الارض حقیقتاً ہے کیا چیز؟

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ
اثْنَا عَشْرَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ
اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۶۰﴾

استسقی کا لفظی معنی اور اس کی حقیقت

وَإِذِ	اور جب	اسْتَسْقَىٰ	پانی مانگا	مُوسَىٰ	موسیٰ نے
لِقَوْمِهِ	اپنی قوم کیلئے	فَقُلْنَا	تو ہم نے کہا	اضْرِبْ	تو مار
بِعَصَاكَ	اپنی لاٹھی کو	الْحَجَرَ	پتھر (پر)	فَانْفَجَرَتْ	تو پھوٹ پڑے
مِنْهُ	اُس سے	اِثْنَا عَشْرَةَ	بارہ	عَيْنًا	چشمے
قَدْ	تحقیق	عَلِمَ	جان لیا	كُلُّ اُنَاسٍ	تمام لوگوں نے
مَشْرَبَهُمْ	اپنا گھاٹ	كُلُّوا	تم سب کھاؤ	وَاشْرَبُوا	اور تم سب پیو
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ	اللہ کے رزق سے	وَلَا	اور مت	تَعْثَوْا	تم سب پھرو

فِی الْأَرْضِ	زمین میں	مُفْسِدِینَ (60)	فساد مچانے والے۔
---------------	----------	------------------	------------------

وَإِذِ اسْتَسْقَى مُوسَى لِقَوْمِهِ، اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقی کا لفظی معنی طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ہود (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے واقعات میں ملتا ہے۔ کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا اے قوم اپنے رب سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ ”يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا“ تاکہ وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسائے۔ جب کبھی دنیا خشک سالی کا شکار ہو جاتے۔ زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جاتے تو فراہمی آب کے لئے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ صدقہ خیرات کریں، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی غرضیکہ استسقی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رورو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کرنے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے سے بے شمار دینی اور دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت

فقہاء کرام میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقاہت و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گی۔ آپ نے دین کا نچوڑ اور خلاصہ اس طریقہ پر پیش کیا کہ تمام عجمی قومیں اسے بخوشی قبول کر گئیں امت پر آپ کا بڑا احسان ہے۔ جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی۔ مفسرین کرام نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا

استنباط کیا۔ اور مشکلات کے حل پیش کئے۔ انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقہ پر امت کے سامنے پیش کیا۔ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔

استسقا کی حقیقت

استسقا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اس کے لئے نماز پڑھنا بھی سنت ہے۔ تاہم استسقا کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے آنے سے پہلا طریقہ یہ ہے مسلمان بستی سے باہر کھلے میدان میں نکل جائیں۔ دو رکعت نماز ادا کریں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ استسقاء کے لئے صرف مومن اکٹھے ہوں۔ کسی کافر کو قریب نہ آنے دیں۔ پھر عاجزی اور انکساری کے ساتھ دو نفل ادا کریں۔ اس کے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ باران رحمت نازل کرے گا۔ اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔ دوسرا طریقہ بھی حضور بھی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ منبر پر تشریف فرما تھے۔ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضور! جب نور ہلاک ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسا دے۔ آپ نے منبر پر بیٹھے بیٹھے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ آپ دعا فرما رہے تھے کہ کسی کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہو ادیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل پھیل گیا اور یکا یک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ایک تیسرا طریقہ بھی ہے کہ کسی بھی نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔ استسقا کی یہ مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت اپنائی جاسکتی ہے۔

بہر حال موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ساری قوم سخت پریشانی کے عالم میں تھی۔ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے۔ مگر آپ دعا میں مصروف ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے حکم کی تعمیل کی۔ جو نبی لاٹھی پتھر پر ماری۔ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَ نَاحِيَةً اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔ یہ واقعہ بھی اس وقت کا ہے جب بنی

اسرائیل میدان تیر (صحرائے سینا) میں محصور تھے وہاں پانی کا کوئی چشمہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے طور پر بارہ چشمے پیدا فرمادئے، حضرت یعقوب (اسرائیل) کے بارہ بیٹے تھے ہر بیٹے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اس طرح بنی اسرائیل بارہ قبیلوں میں تقسیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لئے الگ چشمہ جاری فرمادیا تاکہ کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

پانی کے بارہ چشمے پھوٹنے کی حکمت یہ تھی کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چشمہ مقرر کر دیا۔ چشموں کا تعین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چشمہ مقرر ہوا اور چھوٹے قبیلے کے لئے چھوٹا چشمہ۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کر دیا گیا۔ فرمایا: "قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرِ بِنِجْمِهِمْ" ہر ایک نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ہر قبیلے میں ایک ایک چشمہ تقسیم کر دیا ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نالیاں کھود لیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مشترکہ مفاد کی اشیاء کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہئے۔ تاکہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی والے معاملہ میں بھی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ قَالَ هَذِهِ نَاقَةُ لِهَآ شَرْبٌ وَلَكُمْ شَرْبٌ يَوْمَ مَعْلُومٍ "قوم صالح (علیہ السلام) سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز تمہاری باری ہوگی۔ اور ایک روز اونٹنی کی۔ قوم نے مقررہ حد سے تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔

معجزہ اور کرامت

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ کام کرنے والی وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر اگر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تو "يَا دُنِ اللّٰهُ" تھا فرمایا "وَأَبْرُؤُاْ"

كُفَّةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِيَ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ ”میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص کو ٹھیک کرتا ہوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ ”وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ“ ”فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہادی اعظم (علیہ السلام) کی زندگی میں بیشمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکلنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت (علیہ السلام) کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں (1۔ بخاری ج 1 ص 505، مسلم ج 2 ص 245) کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھارہاتے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا بہت پانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیالے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آؤ پانی پی لو اور اس سے وضو کرو لوگوں نے پانی حاصل کیا اس سے وضو کیا۔ اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا لشکر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھا لیا اور پانی نکلنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء (علیہم السلام) کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور ﷺ کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ہو یا ہمارے رسول اعظم ﷺ کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لئے من و سلویٰ کا بند و بست ہو گیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمہ جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ“ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھادی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اسے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدی نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہئے کہ روٹی کا یہ کچھ اکتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کروڑوں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے، پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشقوں سے گزر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں، کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس مالک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر انصافی کی بات ہوگی۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسری مقام پر آتا ہے۔ ”كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ حَلال اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں“ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (172) ”اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم مالک ہو۔ مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ ان کے حق ادا نہیں کرو گے تو یہ

اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور متحقیق پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اسے دیکھنا چاہئے کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا ننگا نہ رہے۔ خاص طور پر برسرہاں مملکت کا یہ فرض منصبی ہے کہ اپنے اپنے ملک میں حاجت مندوں کی خبر گیری کریں لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔ آگے فرمایا وَلَا تَعْتَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو،

فساد فی الارض کیا ہے؟

قرآن و تفاسیر کی روشنی میں ”فساد فی الارض“ ایک جامع اصطلاح ہے جس کا تعلق عملی، اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی بگاڑ سے ہے۔ مفسرین نے اس کی حقیقت مختلف پہلوؤں سے بیان کی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے: سب سے بنیادی معنی اللہ کی نافرمانی اور اس کی حدود کو توڑنا ہے۔ فساد فی الارض اس ہر چیز کا نام ہے جو: اللہ کی نافرمانی، عدل و امن کے نظام کا بگاڑ، معاشرتی انتشار، قتل و فتنہ، ظلم، لوٹ مار، راستہ روکنا، کھیتی اور نسل کی بربادی، قحط و خشک سالی کو جنم دے۔ قرآن کے مطابق یہ زمین کے نظام میں بگاڑ اور انسانوں کے باہمی معاملات میں خرابی پیدا کرتا ہے۔ یہ دراصل اللہ کی شریعت سے انحراف اور اس کے نتیجے میں اخلاقی، معاشی، سماجی اور فطری بگاڑ کا مجموعہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔ الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پیو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

طعام کی تبدیلی / ذلت اور مسکنت کا مفہوم / آیات الہی کا انکار

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
وَاذْكُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَن تَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا
تُخْبِئُ الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلَهَا ۖ قَالَ
اَتُتَّبَدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۖ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِن لَّكُمْ مَّا
سَأَلْتُمْ ۖ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۖ وَبَاءَ وَبَغَضَ مِنَّا اللّٰهُ ۖ ذَلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَّ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

وَاذْ	اور جب	قُلْتُمْ	تم نے کہا	يُمُوسَىٰ	اے موسیٰ	لَن	ہرگز نہیں
تَصْبِرَ	ہم صبر کریں گے	عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ	ایک کھانے پر				
فَادْعُ	پس آپ دعا کریں	لَنَا	ہمارے لئے	رَبَّكَ	اپنے رب سے		
يُخْرِجْ	وہ نکالے	لَنَا	ہمارے لئے	مِمَّا	(اس) سے جو		
تُخْبِئُ	آگاتی ہے	الْأَرْضُ	زمین	مِن بَقْلِهَا	اُس کا ساگ		
وَقِثَّآئِهَا	اور اُس کی گڑبی	وَفُومِهَا	اور اس کی گندم				

اور اس کا پیاز	وَبَصَلِهَا	اور اس کی مسور	وَعَدَسِهَا
----------------	-------------	----------------	-------------

یہ بھی اسی جنگل کا واقعہ ہے جہاں ایک طویل مدت کے لئے بنی اسرائیل کو محصور کیا گیا تھا۔ انہیں من و سلوی جیسی نعمتیں بلا مشقت مل رہی تھیں۔ مگر وہ ان چیزوں کو کھاتے کھاتے اکتانگے تھے تو زمینی پیداوار کا مطالبہ کر دیا۔ موسیٰ نے انہیں سمجھایا کہ جو چیز تمہیں یہاں سے بلا مشقت مل رہی ہے وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جو تم مانگ رہے ہو اور وہ مشقت کے بعد ہی تمہیں حاصل ہوگی۔ دراصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر۔ مقصد یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”وَإِذْ قُلْتُمْ يٰعِبْرٰہٖمُ لٰنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامِہٖ وَاٰجِدُ“ اے بنی اسرائیل اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب تم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔

بنی اسرائیل کی ناشکری

صحراے سینا میں بلا مشقت من و سلوی کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج بھر چکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے لہذا انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شکایت کی کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من و سلوی دو مختلف کھانے تھے۔ مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا۔ کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پر ہی نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا

کھانا کھا کھا کرتنگ آچکے ہیں اے موسیٰ (علیہ السلام) ”فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ“ آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔ ”يُخْرِجْ لَنَا“ کہ وہ نکالے ہمارے لئے ”مِمَّا تُعِدُّ الْأَرْضُ“ وہ چیزیں جن کو زمین اگاتی ہے۔ ”مِنْ بَقْلِهَا“ اپنی ترکاریوں سے ”بَقْلُ“ ہر قسم کی ہری سبزی یا ساگ۔ ”وَقِثَّاءُ“ اور اپنی لکڑیوں سے ”قِثَّاءُ“ لکڑی، کھیرے یا تر ”وَقُومَهَا“ اور گندم سے ”قُومُ“ اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد گیہوں (گندم) ہے، جبکہ بعض اے لہسن بھی مانتے ہیں۔ ”وَعَدَسِيَّهَا“ اور مسور سے ”عَدَسُ“ یعنی مسور کی دال ”وَبَصِلَتِهَا“ اور اپنے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ کر ہمیں یہ دلوایے۔ ”مِنْ“ وسلوی جیسی قوت بخش غذا سے ان کا بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل کو میدانِ تیبہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانی غذا ’من وسلوی‘ مفت اور بغیر محنت کے ملتی تھی۔ لیکن وہ اس نعمت سے استغنائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسانوں جیسی عام بھریاں اور دالیں مانگیں۔

اعلیٰ چیز کے بدلے ادنیٰ اور کمتر چیز لینا چاہتے ہو؟

قَالَ	اس نے کہا	اَتَسْتَبْدِلُونَ	کیا تم بدلنا چاہتے ہو
الَّذِي	جو	هُوَ اَدْنٰى	وہ ادنیٰ (ہے)
الَّذِي	جو	بِالَّذِي	(اُس کے) بدلے میں جو
هُوَ خَيْرٌ	وہ بہتر (ہے)	اِهْبِطُوا مِصْرًا	تم اتر جاؤ شہر میں

اور فرمایا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوا مِصْرًا ”کیا تم ایک ادنیٰ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کتنے بیوقوف ہو کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من وسلوی جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ یعنی ”من وسلوی“ جیسی عمدہ، لذیذ اور بے محنت حاصل ہونے والی غذا کی جگہ یہ معمولی ساگ سبزی کی خواہش کرتے ہو! اور تم سبزی ترکاری اور لہسن پیاز کے پیچھے پھر رہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مفت من وسلوی دے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر

ان کے مطلوبہ لہسن پیاز پر تو حساب کتاب بھی ہو گا۔ یہ بھی ان کے گھائے کا سودا تھا۔ مگر وہ اسی پر مصر تھے۔ جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان سے کہلوایا کہ اگر تم یہی چاہتے ہو۔ ”اِهْبِطُوا مِصْرًا“ تو کسی شہر میں اتر جاؤ۔ وہاں جا کر کھیتی باڑی کرو۔ بل چلاؤ۔ آپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ ”فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا سَأَلْتُمْ“ پس جو کچھ تم چاہتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔ مصر سے مراد یہاں ملک مصر نہیں، بلکہ کوئی ایک شہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے کسی بھی شہر میں چلے جاؤ اور وہاں کھیتی باڑی کرو، اپنی پسند کی سبزیاں، دالیں اگاؤ اور کھاؤ۔ ان کا یہ مطالبہ چونکہ کفرانِ نعمت اور استکبار پر مبنی تھا، اس لئے زجر و توبیخ کے انداز میں ان سے کہا گیا ”تمہارے لئے وہاں مطلوبہ چیزیں ہیں۔“

مسکنت و دناوت کا اصل معنی و مفہوم

فَإِنَّ	پس بیشک	لَكُمْ	تمہارے لئے	مَا سَأَلْتُمْ	جو تم نے مانگا ہے
وَضَرَبَتْ	اور مسلط کر دی گئی	عَلَيْهِمُ الدِّلَّةُ	اُن پر ذلت		
وَالْمَسْكَنَةُ	اور محتاجی	وَبَأْؤُ	اور وہ لوٹے	بِغَضَبٍ	غضب کے ساتھ
مِّنَ اللَّهِ			اللہ (کی طرف) سے		

مسکنت کا اصل معنی ’محتاجی‘ ہے، مولانا دریا بادی نے یہی ترجمہ کیا ہے، مسلسل فقر و افلاس قوم کے اندر دناوت و پستی کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے؛ گویا یہ پستی محتاجی کا نتیجہ ہے؛ اسی لئے مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا تھانوی نے پستی سے ترجمہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ فقر و احتیاج تو آتی جانی چیز ہے اور آج دولت جتنی یہود کے پاس ہے شاید کسی اور قوم کے پاس ہو؛ عربی لفظ ”دناوت“ (دَنَاةٌ) کا بنیادی مفہوم پستی، گھٹیا پن اور اخلاقی کمزوری ہے، دناوت کا جامع مطلب و مفہوم یہ بنتا ہے: ”اخلاقی پستی، کمزوری، گھٹیا پن، ذلت اور وہ صفت جو انسان کو خیر و شرافت سے دور اور رذالت کے قریب کر دے۔ لیکن دناوت و پستی ایسا وصف ہے جس سے کبھی یہ قوم آزاد نہ ہو سکی اور نہ آج ہے۔“ اور یہ جو

مشہور بات ہے کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم ہیں۔ مگر یہ درست نہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ ورنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔ حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک در بدر مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جرمنی والے ان کے دشمن۔ اٹلی والے ان کے دشمن۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ ”معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جو تھے پارے میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ ”إِلَّا بِمَحَبَّةٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ الدِّمَاسِ“ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ سے ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت ان کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تویہ قسریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کا نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہاتھ اٹھالے تو یہودی سلطنت دو دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہوے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے وَبَاءُ وَبِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَهُوَ اللَّهُ تَعَالَىٰ كَاذِبٌ هِيَ لَے كَرُلُوْٓتَے اور وہ غضب

الہی کے مصداق بن گئے۔

داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل و اہانت

ذٰلِكَ	یہ اس وجہ سے	بِأَنَّهُمْ	کہ بیشک	كَانُوا	وہ تھے
يَكْفُرُونَ	وہ سب انکار کرتے	بِأَيِّدِ اللَّهِ	اللہ کی آیات کا		
وَيَقْتُلُونَ	اور وہ قتل کرتے	النَّبِيِّنَ	نبیوں کو	بِغَيْرِ الْحَقِّ	ناحق

قتل کے ساتھ ناحق، کا لفظ محض اظہار واقعہ کے لئے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قتل تو ناحق ہی ہوگا، خود بائبل کے بیان کے مطابق یہودیوں نے یسعیاہ نبی، یرمیاہ نبی، زکریا نبی اور یحییٰ نبی علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قتل کیا اور اپنے تئیں بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت مسیح کے قتل کی بھی کوشش کی، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کی بدسلوکی کی داستان بہت دراز ہے اور بائبل کا عہد عتیق اور عہد جدید اب بھی اس شقاوت کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ذلت و غضب الہی کی وجہ بیان کی جا رہی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار اور اللہ کی طرف بلانے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل و اہانت، یہ غضب الہی کا باعث ہے۔ کل یہود اس کا ارتکاب کر کے مغضوب اور ذلیل و رسوا ہوئے تو آج اس کا ارتکاب کرنے والے کس طرح معزز اور سرخرو ہو سکتے ہیں: ”أَيُّنَ مَا كَانُوا وَحَيْثُ مَا كَانُوا“ ”وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں۔“

مَنْهِيَّات سے باز رہا جائے اور مَأْمُورَات کو بجالایا جائے

ذٰلِكَ يَمْنَا	یہ اس وجہ سے	عَصَوَا	انہوں نے نافرمانی کی
وَكَانُوا	اور وہ تھے	يَعْتَدُونَ (61)	حد سے تجاوز کرتے۔

فرمایا ”ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِأَيِّدِ اللَّهِ“ بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر

اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ ابلیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ" جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت پرستی رہے یہ ذلت و مسکنت کی دوسری وجہ ہے۔ عَصَا (نافرمانی کی) کا مطلب ہے جن کاموں سے انہیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کیا اور (يَعْتَدُونَ) کا مطلب ہے مامور بہ کاموں میں حد سے تجاوز کرتے تھے۔ اطاعت و فرمانبرداری یہ ہے کہ مَنَهِيات سے باز رہا جائے اور مَأْمُورَات کو اس طرح بجالایا جائے جس طرح ان کو بجا لانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اپنی طرف سے کئی بیشی یہ زیادتی (اِعْتِدَاء) ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ خلاصہ اس آیت کا یہ کہ ذلت اور بد حالی کے علاوہ اللہ کا غضب یہ ہوا کہ ان کی ٹریننگ اور تربیت کی مدت کو پھیلا کر چالیس سال تک بڑھا دیا گیا۔ ورنہ اگر اللہ اور اس کے پیغمبر موسیٰ (علیہ السلام) کی مرضی پر چلتے تو ممکن تھا کہ چالیس سال گزرنے سے پہلے ہی شام کا ملک فتح کرنے کے قابل ہو جاتے۔ مگر ان لوگوں کی عادت ہی یہ بن گئی تھی کہ جو بات اپنی مرضی کے خلاف دیکھتے تو فوراً نافرمانیوں پر اتر آتے تھے حتیٰ کہ بعض انبیاء تک کو قتل کرتے رہے اور اللہ کے غضب، ذلت اور مسکنت کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہودی قوم کبھی بارہ دوسری قوموں سے پٹ چسکی ہے۔ مالدار ہونے کے باوجود آج بھی سخت افرادی قلت سے دوچار ہے اور ایک چھوٹے سے خطہ میں ان کی حکومت قائم ہوئی بھی ہے تو وہ دوسری قوموں کے سہارے پر اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اخلاقی انحطاط اس قدر ہے کہ آج بھی بے حیائی، فحاشی، سود خوری اور حرام خوری اس قوم کا طرہ امتیاز ہے۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی روش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی رہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

بنی اسرائیل کا عہد / دین میں جبر نہیں کا مطلب

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِيَّانَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
 يَحْزَنُونَ ﴿٣٢﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ طُحُّوْا مَا آتَيْنَاكُمْ
 بِقُوَّةٍ وَّادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٣٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا
 فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿٣٤﴾

یہود، نصاریٰ اور صائبین

اِنَّ الَّذِيْنَ	بے شک جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَالَّذِيْنَ	اور جو
هَادُوْا	یہودی بنے	وَالنَّصٰرٰی	اور نصاریٰ	وَالصَّبِيَّانَ	اور بچے دین
مَنْ اٰمَنَ	جو ایمان لایا	بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	اور آخرت کے دن پر
وَعَمِلَ	اور عمل کیا	صَالِحًا	نیک	فَلَهُمْ	تو اُن کیلئے
اَجْرُهُمْ	اُن کا اجر ہے	عِنْدَ رَبِّهِمْ	اُن کے رب کے پاس	وَلَا خَوْفٌ	اور نہ کوئی خوف ہوگا
عَلَيْهِمْ	اُن پر	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يَحْزَنُوْنَ (62)	غمگین ہوں گے۔

یہود ہُوَادَّةُ (بمعنی محبت) سے یا تہْوَؤُ (بمعنی توبہ) سے بنا ہے گویا ان کا یہ نام اصل میں

توبہ کرنے یا ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے پڑا۔ تاہم موسیٰ (علیہ السلام) کے ماننے والوں کو یہود کہا جاتا ہے۔

نَصَارَی، نَصْرَانِ کی جمع ہے۔ جیسے سُکَّارِی سَكْرَانِ کی جمع ہے۔ اس کا مادہ نصرت ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی وجہ سے ان کا نام پڑا، ان کو انصار بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو کہا تھا: **يَحْيَىٰ اَنْصَارُ اللّٰہ** حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پیروکاروں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے، جن کو عیسائی بھی کہتے ہیں۔ یہاں نصاریٰ سے حقیقی عیسائی یعنی وہ لوگ مراد ہیں، جو حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ اور رسول یقین کرتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں؛ اس لئے کہ جو حضرت مسیح کو ابن اللہ مانتے ہیں، وہ تو اللہ پر ایمان ہی سے محروم ہیں اور یہاں اللہ پر ایمان رکھنے کی شرط ہے۔

صَابِئِیْنَ صَابِئِی کی جمع ہے۔ یہ لوگ وہ ہیں جو یقیناً ابتداءً کسی دین حق کے پیرو رہے ہوں گے (اسی لئے قرآن میں یہودیت و عیسائیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن بعد میں ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آگئی، یا یہ کسی بھی دین کے پیرو نہ رہے۔ اسی لئے لامذہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مؤمنین، یہود، نصاریٰ اور صابین کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورہ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین۔ یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت مولانا شیخ الہند اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں (1۔ قرآن مجید مترجم ص 13 مطبوعہ دارالتصنیف کراچی) کہ یہود حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے۔ جنہیں وہ اچھا سمجھتے تھے۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ زبور پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

اس میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہے، تاہم ان اقوال سے اتنی بات بہر حال واضح ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں اس نام سے ایک ایسی قوم موجود تھی، جو توحید و رسالت پر ایمان رکھتی تھی اور اپنے آپ کو کسی ایسے پیغمبر سے منسوب کرتی تھی، جن کی نبوت کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہے۔ اللہ پر ایمان رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان کو بھی شامل ہے، چوں کہ مسلمان، یہودی، نصاریٰ اور صابئی رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہی تھے؛ اس لئے رسول پر ایمان رکھنے کا مستقل اور علاحدہ ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس آیت سے پہلی آیات اور اس کے بعد والی آیات میں بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کے مقابلے میں ان کے اعمال بد کا تذکرہ ہے۔ یہ آیت درمیان میں ایک خاص مناسبت کی بنا پر آئی ہے، وہ یہ کہ جب بات ان پر ذلت و مسکنت مسلط ہونے اور اللہ کے غضب کا نشانہ بننے تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت کے مطابق ان کے لیے اپنی رحمت کا تذکرہ ضروری سمجھا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد اس ذلت و مسکنت اور غضب الہی کا نشانہ نہیں، پہلے بھی اللہ تعالیٰ بید مہربان تھا اور توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوگا، خواہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہو، جیسے آپ سے پہلے اپنے اپنے انبیاء پر ایمان لا کر عمل صالح کرنے والے لوگ ہوں، یا آپ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ میں سے ایمان لانے والے ہوں، مثلاً عبد اللہ بن سلام، صہیب اور سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم، سب کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو مزید مانوس کرنے کے لیے مسلمانوں اور صابئین کا بھی ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی خاص نسل کے ساتھ مخصوص نہیں، شرط صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ [التحریر والتنوير]

شریعت کے احکام میں اولین حکم

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کرنا ہی ”عمل صالح“ ہے؛ اس لئے اب ”عمل صالح“ سے شریعت محمدی پر عمل کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ توحید و آخرت پر ایمان اور اچھے اعمال

کافی نہیں ہیں؛ بلکہ شریعت محمدی ﷺ کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور شریعت کے احکام میں سے اولین حکم آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا، آپ ﷺ سے محبت کرنا اور آپ ﷺ کا احترام کرنا بھی ہے۔ الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویٰ دار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہے یا صابی نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں، ہمتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور عمل صالحہ انجام دے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے۔ مگر نجات کا دار و مدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آرہی ہے۔

ایک ہیبت ناک منظر

وَإِذْ	اور جب	أَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيثَاقَكُمْ	تم سے پختہ عہد
وَرَفَعْنَا	اور ہم نے اٹھایا	فَوْقَكُمْ	تمہارے اوپر	الْطُّورَ	طور (پہاڑ)
خُذُوا	تم تھام لو	مَا آتَيْنَاكُمْ	جو ہم نے دیا تم کو	بِقُوَّةٍ	مضبوطی سے
وَإِذْ كُرُوا	اور تم یاد رکھو	مَا فِيهِ	جو اس میں (ہے)		
لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم	تَتَّقُونَ (63)	تم بچ جاؤ۔		

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا عہد لیتے ہوئے ایک ہیبت ناک منظر پیدا فرما دیا، تاکہ وہ دل سے یہ عہد کریں۔ اس وقت وہ پہاڑ کے دامن میں تھے کہ زلزلے کے ساتھ پہاڑ اکھڑ کر (وَإِذْ تَنْقَضَتَا الْجَبَلِ) ان پر جھک گیا اور سائبان کی طرح ان پر سایہ فگن ہو گیا، حتیٰ کہ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔ یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ان کے ستر منتخب افراد پر بجلی گرا کر انہیں ہلاک کیا گیا اور پھر دوبارہ زندہ کیا گیا تھا۔ ان کو بھی اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کو بھی طور کے دامن میں کھڑا کیا گیا اور طور پہاڑ کو ان پر اس طرح جھکا دیا گیا جیسے وہ ان کے اوپر ایک سائبان ہے۔ اب پیچھے سمندر تھا اور آگے

سروں کے اوپر ساتبان کی طرح طور پہاڑ، اس وقت ان سے پوچھا گیا تاؤ تورات پر عمل کرتے ہو یا نہیں؟ اور اقرار کرتے ہو تو پھر پوری مضبوطی سے عہد و پیمان کرو، ورنہ ابھی اس پہاڑ کو تمہارے اوپر گرا کر تمہیں کچل دیا جائے گا۔ اس وقت بنی اسرائیل کو اپنی نافرمانیوں اور غلطیوں اور عہد شکنیوں کا احساس ہوا اپنے گناہوں سے توبہ کی اور تورات پر عمل پیرا ہونے کا پختہ اقرار کیا۔ اور یہ اس لیے کیا گیا تھا تا کہ تم لوگوں میں کچھ پرہیزگاری کی صفت پیدا ہو۔ اولاً تو بنی اسرائیل نے تورات کو اللہ کی طرف سے ماننے میں ہی بہت پس و پیش سے کام لیا اور خدا کی آواز سننے اور خدا کو دیکھنے کی جسارت انگیز شرطیں لگائیں، پھر جب ماننے سے چارہ نہ رہا تو کچھ احکام کے بارے میں مطالبہ کرنے لگے کہ ان کو نکال دیا جائے، اس ناشائستہ مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر ”طور“ نامی پہاڑ کو اٹھا لیا کہ تورات کو قبول کرو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے، اب جا کر اس سرکش قوم نے تورات کو قبول کرنے کی ہامی بھری، بائبل میں بھی یہ واقعہ آیا ہے (خروج: ۱۷/۱۹-۱۸)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

قرآن مجید کا بیان بالکل واضح ہے کہ خود پہاڑ ان پر اٹھا لیا گیا تھا، یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ دین میں توجہ و اکراہ نہیں ہے، یہاں جبر سے کیوں کام لیا گیا؟ اس لئے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن جو مسلمان ہو، اس کو احکام اسلام کے ماننے پر یقیناً مجبور کیا جائے گا، بنی اسرائیل ایمان لا چکے تھے؛ لیکن تورات کے تمام احکام کو ماننے سے گریز کر رہے تھے؛ اسی لئے ان کو مجبور کیا گیا کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قطعاً جبر روا نہیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون شکنی کا مرتکب ہو گا۔ اس پر جبر بھی ہو گا۔ بنی اسرائیل پر پہاڑ مسلح کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جو عہد کیا تھا اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مدفن یہیں بنے گا۔ اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے تو سارا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ جب کسی ملزم کو سزا دی جائے گی تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے

گا کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ اسے جبراً کوڑے لگائے جا رہے ہیں یا اسے جبراً قید میں ڈالا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہوگا بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔ الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبراً سزا دی جاسکتی ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجھائی جا رہی ہے کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشہیر کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دنیوی حکومت کے قانون کی تشہیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

پختہ عہد و پیمان کے باوجود روگردانی

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ	پھر تم پھر گئے	مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ	اُس کے بعد	فَلَوْلَا	پس اگر نہ
فَضَّلَ اللَّهُ	اللہ کا فضل (ہوتا)	عَلَيْكُمْ	تم پر	وَرَحْمَتُهُ	اور اس کی رحمت
لَكُنْتُمْ	البتہ تم ہو جاتے	مِّنَ الْخَاسِرِينَ (64)	خارہ پانے والوں میں سے		

اس سارے عہد و پیمان کے بعد انھوں نے بہت سی باتوں میں تورات سے کنارہ کشی اختیار کی، چنانچہ انھوں نے تورات میں تحریف کی، اس کی آیات کو چھپایا، انبیاء کے احکام کی نافرمانی کی، بعض کو جھٹلایا، بعض کو قتل کیا، میدان تیرہ میں عجیب و غریب نعمتوں کے مشاہدے کے باوجود موسیٰ پر بار بار اعتراض کیے، ان کی حکم عدولی کی، انھیں سخت ایذا پہنچائی۔ ارض مقدس میں داخلے کا حکم ہوا تو صاف انکار کر دیا حتیٰ کہ موسیٰ نے خود کو ان نافرمانوں سے الگ کر دینے کی دعائی۔ یہ تو پہلوں کا حال تھا، بعد والوں نے رسول اللہ ﷺ کو بیچا بننے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ فرمایا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد ”ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ“ تم اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے اسے پورا نہ کیا اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دیتا رہا کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کر سکو۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا فَضَّلَ اللَّهُ: اللہ کا

فصل۔ یہاں فضل و رحمت سے یا تو توبہ کی توفیق مراد ہے کہ انہیں توبہ کی توفیق مل گئی اور یا عذاب کو مؤخر کرنا مراد ہے یعنی بنی اسرائیل پر عذاب نازل نہ ہوا بلکہ انہیں مزید مہلت دی گئی۔ (مدارک، البقرۃ تحت الآیۃ: ۶۴، ص ۵۶) اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی (علیہ السلام) بھی آچکا ہے۔ لَكُنْتُكُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (یعنی ان تمام نافرمانیوں کے باوجود فوراً عذاب کے ساتھ ہلاک کرنے کے بجائے تمہیں توبہ و استغفار کی مہلت دی گئی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہ راست پر آ جاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پکتے عہد و پیمان اور ان پر کی گئی عنایات کے باوجود وہ دوبارہ روگردانی کے مرتکب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی رحمت اور فضل کو واضح کیا ہے کہ اگر اس کی توبہ کی توفیق اور معافی شامل حال نہ ہوتی، تو وہ ہمیشہ کے لیے تباہ اور خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جاتے۔

اصحاب سبت کا انجام / جمعہ کی فضیلت / تبدیلی اشکال کی توجیہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً
خَاسِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کرنے والے

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَلِمْتُمْ	تم جان چکے ہو	الَّذِينَ	جنہوں نے
اعْتَدَوْا	زیادتی کی	مِنْكُمْ	تم میں سے	فِي السَّبْتِ	ہفتے کے دن میں
فَقُلْنَا	تو ہم نے کہا	لَهُمْ	ان سے	كُونُوا	تم سب ہو جاؤ
قِرَدَةً	بندر	خَاسِيْنَ (65)	ذلیل		

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں حکم نازل فرمایا تھا۔ شہر آیلہ میں بنی اسرائیل آباد تھے انہیں حکم تھا کہ ہفتے کا دن عبادت کے لیے خاص کر دیں اور اس روز شکار نہ کریں اور دنیاوی مشاغل ترک کر دیں۔ ان کے ایک گروہ نے یہ چال چلی کہ وہ جمعہ کے دن شام کے وقت دریا کے کنارے کنارے بہت سے گڑھے کھودتے اور ہفتے کے دن ان گڑھوں تک نالیاں بناتے جن کے ذریعہ پانی کے ساتھ

آکر مچھلیاں گڑھوں میں قید ہو جاتیں اور اتوار کے دن انہیں نکالتے اور کہتے کہ ہم مچھلی کو پانی سے ہفتے کے دن تو نہیں نکالتے، یہ کہہ کر وہ اپنے دل کو تسلی دے لیتے۔ چالیس یا ستر سال تک ان کا یہی عمل رہا اور جب حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا زمانہ آیا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ قید کرنا ہی شکار ہے جو تم ہفتے ہی کو کر رہے ہو۔ جب وہ باز نہ آئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان پر لعنت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ نوجوان بندروں کی شکل میں اور بوڑھے خنزیروں کی شکل میں مسخ ہو گئے، ان کی عقل اور حواس تو باقی رہے مگر قوت گویائی زائل ہو گئی اور بدنوں سے بدبو نکلنے لگی، وہ اپنے اس حال پر روتے رہے یہاں تک کہ تین دن میں سب ہلاک ہو گئے، ان کی نسل باقی نہ رہی اور یہ لوگ ستر ہزار کے قریب تھے۔ (روح البیان، البقرة:)

یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، اس زمانہ میں مقام ایلہ میں یہودیوں کی ایک بڑی آبادی واقع تھی، یہود کو تورات میں جو احکام دیئے گئے تھے، ان میں ایک یہ تھا کہ ہفتہ کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص رکھیں اور اس دن کسبِ معاش سے اجتناب کریں، یہ حکم اتنی تاسکید کے ساتھ تھا کہ اس کی مخالفت کی سزا موسوی شریعت میں قتل تھی (خروج: ۳۱/۱۴-۱۵)

ناجائز حیلہ سازی پر سخت سزا

ایلہ کے یہودیوں نے اس کی مخالفت کی اور حیلہ بہانہ سے اس دن بھی مچھلی کا شکار کرنے لگے اس پر یہ عذاب نازل ہوا کہ یہ بندر بنادیں گئے، تین دنوں تک اسی حال میں رہے اور اس کے بعد مر گئے، اللہ ہی اصل صورت بنانے والے ہیں، ”يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ“ (آل عمران: ۶) جو صورت بنا سکتا ہے، اس کے لئے صورتوں اور جسم کے قابلوں کا بدل دینا کیا مشکل ہے؟ معلوم ہوا کہ ناجائز حیلہ سازی بہت بری خصلت اور بہت بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا: تم حیلہ سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا، یہ بڑا سخت جرم ہے ایسا

کرنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہو گا اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ سب کچھ جعل سازی اور حرام ہے۔ ناجائز حیلہ سازی بہر حال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے زیور بیوی کے نام ہبہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا تو بیوی نے خاوند کے نام ہبہ کر دیا گویا نہ کسی کے ہاں زیور پر پورا سال گزرے اور نہ اس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرض، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔

یہود و نصاریٰ کے مقدس دن

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا (1 بخاری ج 1 ص 120، مسلم ج 1 ص 282) کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کو بہکا دیا کہ وہ جمعہ کا دن نہ پاسکیں۔ بلکہ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی کیونکہ جمعہ تمام ایام سے زیادہ فضیلت والا دن ہے۔ جمعہ کو یوم المیزید بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس میں اہل ایمان کو مزید کرامتیں اور انعامات عطا ہوتے ہیں۔

جمعہ اہل اسلام کیلئے سب سے عظیم دن

تنبیہ الغافلین میں ہے کہ قیامت کے دن اہل ایمان اس دن کے ذریعے مزید قرب الہی حاصل کریں گے۔ جمعہ کی نماز اور جمعہ سے جمعہ تک کے اعمال انسان کے گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے، یہ دن اجتماع اور امت کی یکجہتی کا دن ہے۔ قرآن نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ
جمعہ کے دن ایک قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے جس میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس کا ذکر مختلف احادیث میں آیا ہے اور کتابوں میں اس دن کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جمعہ اسلام میں ہفتے کا سب سے عظیم دن ہے؛ تخلیق انسان، خصوصی عبادات، اجتماعی عبادت، دعاؤں کی

قبولیت، گناہوں کی مغفرت اور بلند درجات ایک ہی دن میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا ”الیهودُ غداً“ یعنی یہود نے جمعہ سے اگلا دن اختیار کیا۔ ”وَالنَّصْرَیْ بَعْدَ غَدِی“ اور نصاریٰ نے اس کے بعد یعنی اتوار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب نہ کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدّر میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے متبرک دن سمجھا گیا۔

الغرض! حضرت داؤد (علیہ السلام) نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور برائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہ کی کہ اگر تم اپنی بری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ تو ان کے مقابلے میں صالحین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو برائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ یہ گروہ برائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا ”مَعْدِنَ رَکَّ اِلَی رَبِّکُمْ وَلَعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ“ کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے غداری کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا کہ تم نے انہیں برائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہو گا۔ قیامت کے روز ندامت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کیلئے دعوت و تبلیغ ضروری ہے

اس لئے اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت لوگوں تک پہنچائیں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہ راست پر

آجائے۔ پھر جب اس قوم پر عذاب نازل ہوا تو اس عذاب سے صرف منع کرنے والا گروہ بچا لیا گیا۔ خاموش رہنے والے اور مجرم دونوں گروہوں پر عذاب نازل ہوا اور وہ عذاب یہ تھا کہ تم ذلیل و خوار بند رہ جاؤ۔

نچری حضرات کی توجیہ

اب معجزات کے منکر اور نچری حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی عادات و خصائل تو بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی تھیں (یعنی وہ فی الواقع بندر نہیں بنے تھے) یہ توجیہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ ایک تو قرآن کے ظاہری الفاظ سے یہ گنجائش نہیں نکلتی۔ دوسرے مابعد کی آیت اس توجیہ کی توثیق کے بجائے تردید کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر ان کی شکلیں بدستور انسانوں کی ہی رہیں، تو وہ اس وقت کے موجود لوگوں اور پچھلوں کے لیے سامان عبرت کیسے بن سکتے تھے اور پرہیزگار ان سے کیا سبق لے سکتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ فی الواقع بندر بن گئے تھے تاہم ان کے دماغ وہی رہے۔ ان میں فہم و شعور انسانی موجود تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر روتے تھے مگر کلام نہیں کر سکتے تھے۔ پھر تین دن کے بعد سب مر گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی شکل میں اور خاص طور پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا۔ کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

انسان اور جانور میں فرق

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آ گیا۔ اور ظاہری شکل و صورت

کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندر حس اور شعور میں بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا انتقال جانور ہے جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھ لے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو ان سے زیادہ مشابہ ہیں۔

اخلاق اور قانون میں فرق

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس میں کوئی معاملہ طے کرتے ہیں تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاہدہ یا (Agreement) ہوتا ہے۔ جس کی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چسلی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آجائے گی جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں اسی طرح مرد اگر اپنی منسوختہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر بد سے دیکھتا ہے تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گرجائے گا۔ اور اس کے علاوہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرے ہوئے ہیں خنزیر ایک ایسا جانور ہے کہ اس کی مادہ کے ساتھ کبھی نہ بیک وقت جفستی کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔ اور بندر کی ایک بہت بری خصلت یہ ہے کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قصائے شہوت کر لیتا ہے خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت ہوتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا مادہ کثرت سے پایا جاتا

ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں جو خود قانون شکن ہے۔ نماز کا ایک اہم قانون ہے کہ مقتدی امام سے آگے نہ نکلے۔ رکوع، سجود، قومہ، قعدہ، ہر مقام پر امام کی اقتداء میں رہے۔ اور اگر کوئی نمازی امام سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بیوقوف جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے وہ گدھے کی مانند ہے۔

عذاب کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کیلئے

فَجَعَلْنَاهَا	تو ہم نے بنادیا اس کو	نَكَالًا	عبرت	لِهَا	(اُن) کیلئے جو
بَيِّنَ يَدَيَّهَا	اس کے سامنے	وَمَا	اور جو	خَلَفَهَا	اس کے پیچھے تھے
وَمَوْعِظَةً	اور نصیحت	لِلْمُتَّقِينَ (66)	پر ہیزگاروں کیلئے۔		

نَكَالًا: عبرت۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں عذاب کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کیلئے بیان کئے گئے ہیں، یعنی اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعث خوف و عبرت بنادیا اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے یعنی جنہوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے" یا جو بستیاں شہر کے آگے اور اس کے پیچھے آباد تھیں۔ لہذا قرآن پاک کے حقوق میں سے ہے کہ اس طرح کے واقعات و آیات پڑھ کر اپنی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اس وقت کے لوگوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنادیا۔ ڈرنے والوں کے لیے نصیحت میں یہ بھی شامل ہے کہ امت محمدیہ ﷺ بنی اسرائیل کی ان نافرمانیوں اور ان پر ملنے والی سزاؤں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

گائے کو ذبح کرنے کے حکم پر بنی اسرائیل کی کٹ حجتیاں / گائے کی نشانیاں

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ وَإِذْ قَالَ
مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ
أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۖ قَالَ
إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۖ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا
تُؤْمَرُونَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْهَا ۖ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَاءٌ ۖ فَاقْعَلُوهَا تَسْرُ النَّظِيرِينَ ۞ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۖ
إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُونَ ۞ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ ۖ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۖ مُسْلِمَةٌ ۖ لَا شَيْءَ فِيهَا ۖ قَالُوا
الَّذِي جِئْتَ بِالْحَقِّ ۖ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۞

گو سالہ پرستی کے جراثیم اور گائے بیل سے محبت

وَإِذْ قَالَ	اور جب کہا	مُوسَىٰ	موسیٰ نے	لِقَوْمِهِ	اپنی قوم سے	إِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ
يَأْمُرُكُمْ	حکم دیتا ہے تمہیں	أَنْ تَذْبَحُوا	یہ کہ تم ذبح کرو	بَقَرَةً	گائے		

قَالُوا	انہوں نے کہا	اَنْتَ تَخِذْنَا	کیا تو کرتا ہے ہم سے	هٰذَا	مذاق
قَالَ	اُس نے کہا	اَعُوذُ	میں پناہ مانگتا ہوں	بِاللّٰهِ	اللہ کی
اَنْ اَكُوْنَ	کہ میں ہو جاؤں	مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (67)	جاہلوں میں سے		

بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص مارا گیا جس کا وارث صرف ایک بھتیجا تھا، ایک رات اس بھتیجے نے اپنے چچا کو قتل کر کے لاش کسی اور آدمی کے دروازے پر ڈال دی، صبح قاتل کی تلاش میں ایک دوسرے کو مذمہ دار ٹھہرانے لگے، بالآخر بات حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچی تو انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا، گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارا گیا جس سے وہ زندہ ہو گیا اور قاتل کی نشان دہی کر کے مر گیا (فتح القدیر) گائے کو ذبح کرنے کا حکم دراصل بنی اسرائیل کی دھتھی رگ پر ہاتھ رکھنے کے مترادف تھا۔ گو سالہ پرستی کے جراثیم اور گائے بیل سے محبت اور اسے دیوتا سمجھنے کا عقیدہ تاہنوز ان میں موجود تھا۔ لہذا ایک تکلیف تو انہیں یہ ہونی کہ جس چیز کو قابل پرستش سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ اس طرح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارنے سے مردہ لاش جی اٹھے گی اور بول کر قاتل کا پتہ بتا دے گی۔ لہذا موسیٰ (علیہ السلام) سے یوں کہہ دیا کہ ہم سے دل لگی کرتا ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ میں تو تمہیں اللہ کا حکم بتا رہا ہوں، دل لگی نہیں کر رہا۔ اَنْ اَكُوْنَ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ کا اصل معنی ہے: میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں مقصود یہی ہے کہ نبی ہونے کے باوجود (جس کا ایک ایک قول اللہ کی طرف سے ہوتا ہے) جاہلوں کی سی بات کیسے کر سکتا ہوں؟۔ کیونکہ ایسی دل لگی کرنا جاہلوں کا کام ہے۔

تَعَبُّقُ كَامَعْنٰی وَمَفْهُوم

قَالُوا	انہوں نے کہا	ادْعُ	آپ دعا کریں	لَنَا	ہمارے لئے	رَبِّكَ	اپنے رب سے
يُبَيِّنُ	وہ بیان کرے	لَنَا	ہمارے لئے	مَا هِيَ	وہ کیسی ہو		
قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهٗ	بیشک وہ	يَقُوْلُ	فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ
بَقَرَةً	گائے	لَا فَاْرِضُ	نہ بوڑھی ہو	وَلَا بَكْرٌ	اور نہ چھوٹی عمر کی ہو		

عَوَانٌ	جوان ہو	بَيْنَ ذَلِكَ	اُس کے درمیان	فَاعْلَوْا	پس تم سب کرو
مَا تُؤْمَرُونَ (68)			جو تم کو حکم دیا جاتا ہے۔		

مفسرین فرماتے ہیں (1۔ معالم التنزیل ج 1 ص 32) کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ (علیہ السلام) کی تھی۔ صحیح حدیث میں آتا ہے (2۔ تفسیر مظہری ج 1 ص 80، دمنثور ج 1 ص 77، ابن کثیر ج 1 ص 21) کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت لیت وعل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبعیتوں میں تعمق تھا۔ تَعَمُّق کا معنی ہے کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنا، گہرائی میں جا کر چھان بین کرنا، غور و خوض، یا باریک بینی سے سوچنا۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو کسی مسئلے، بات یا علم کی گہرائی، باریک بینی اور دور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے، یعنی کسی چیز کا سر اور اصل دریافت کرنا۔ اور اسرائیلی بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بیچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم پر عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جہاں گے۔ اگر بنی اسرائیل ایک فرمانبردار قوم ہوتے اور کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی، مگر کٹ جتنی اور ٹال مٹول جتنی کہ نافرمانی ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ کہنے لگے اچھا ہمیں اپنے پروردگار سے پوچھ کر بتاؤ وہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔ وہ گائے جوان ہونی چاہیے، بوڑھی یا کم عمر نہ ہو۔

شوخی زرد رنگ کی گاتے

قَالُوا	انہوں نے کہا	ادْعُ	دعا کرو	لَنَا	ہمارے لئے
رَبِّكَ	اپنے رب سے	يُبَيِّنُ	وہ بیان کرے	لَنَا	ہمارے لئے
مَا لَوْنُهَا	کیا (کیسا) ہو اُس کا رنگ	قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهُ	بیشک وہ
يَقُولُ	وہ فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ	بَقَرَةٌ	گائے ہو
صَفْرَاءُ	زرد رنگ کی	فَاقِعُ	گہرا ہو	لَوْنُهَا	اُس کا رنگ
تَسْرُ	خوش کر دے	النَّظِيرِينَ (69)	سب دیکھنے والوں کو۔		

پھر دوسری مرتبہ یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر ہمیں بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ وہ گہرے زرد رنگ کی ہونی چاہیے، جو دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دے۔ اب بھی حکم بجالانے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ بَقَرَةٌ اُس کی تئیں سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا، مگر وہ تو گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہی نہ تھے، ادھر موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے پے در پے سوال کیے، جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی طرح جان چھوٹ جائے، مگر وہ جتنے سوال کرتے گئے پھنتے گئے، آخر اس شوخی زرد رنگ کی گائے پر بات آپہنچی جو عبادت کے لیے مثالی سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں کو ذبح کا و پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہئے

قَالُوا	انہوں نے کہا	ادْعُ	دعا کرو	لَنَا	ہمارے لئے	رَبِّكَ	اپنے رب سے
يُبَيِّنُ	وہ بیان کرے	لَنَا	ہمارے لئے	مَا هِيَ	کیا (کیسی) ہو وہ		
إِنَّ الْبَقَرَ	بیشک گائے	تَشْبَهَ	مشتبہ ہو گئی ہے	عَلَيْنَا	ہم پر		
وَأَنَّا	اور بیشک ہم	إِنْ شَاءَ اللَّهُ		اگر چاہا اللہ نے			
لَمْ هُمْ تَدُون (70)			ضرور ہدایت پالیں گے۔				

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے تیسرا سوال کر دیا۔ ”قَالُوا اِذْ عَلَّمْنَا رَبَّكَ“ (اے موسیٰ (علیہ السلام) اپنے رب سے دعا کریں ”يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ“ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ اِنَّ الْبَقْرَةَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا“ بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے۔ ”وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ“ تو بیشک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا گویا یہ آخری بات تھی جو انہوں نے دریافت کی عام قانون بھی ہے۔ ”وَلَا تَقُولُ لَنْ لِّشَايَءٍ اِنِّ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا“ (23) اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ یعنی جب کبھی کوئی مستقبل میں کام کرنا ہو تو یوں نہ کہو کہ کل یا پرسوں ضرور کروں گا۔ بلکہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کر دو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا کروں گا۔ مومن کی یہی شان ہے کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی توفیق کا طلب گار ہوتا ہے۔ اور تیسری بار ان کی زبان سے انشاء اللہ نکل گیا؛ ورنہ شاید اب بھی ان کی سیری نہ ہوتی، خدا خدا کر کے ان کو بات سمجھ میں آئی، تلاش کی گئی تو یہ خوبصورت سنہری گائے ایک یتیم کی ملکیت تھی، اُس بہانہ اس غریب کو بھی منہ مانگی قیمت مل گئی، غالباً گائے اور سنہری گائے کا انتخاب اس لئے فرمایا گیا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سونے کی خود ساختہ گائے ہی کی پرستش میں مبتلا ہو گئے تھے، تو ایسی ہی گائے ان کے ہاتھوں ذبح کرائی گئی؛ تاکہ گائے کی تقدیس ہمیشہ کے لئے ان کے دل سے نکل جائے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جن ملکوں میں پڑوسی قوم گائے کی پوجا کرتی ہو، وہاں خاص کر مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہئے؛ اس لئے کہ وہاں ذبح گاؤ توحید کے شعار کی حیثیت رکھتا ہے، اسی حکم میں ہمارا پڑوسی ملک ہندوستان بھی ہے۔

اس واقعہ سے حاصل ہونے والا سبق

قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهُ	بیشک وہ	يَقُولُ	وہ فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ
بَقْرَةً	گائے	لَا ذَلُولَ	نہ کام میں لگائی گئی ہو (کہ)	تَثْبِيْهُ	بل جوتی ہو		

الْأَرْضَ	زمین میں	وَلَا تَسْقِي	اور نہ پانی دیتی ہو	الْحَرْثَ	کھیتی کو
مُسَلَّمَةً	صحیح سلامت ہو	لَا شَيْئَةً	نہ کوئی داغ ہو	فِيهَا	اُس میں
قَالُوا اَللّٰنِ	انہوں نے کہا اب	جِئْتُ	تو آیا ہے	بِالْحَقِّ	حق کے ساتھ
فَذَبَحُوْهَا	پھر انہوں نے ذبح کیا اسے	وَمَا	اور نہ	كَادُوْا	وہ لگتے تھے
يَفْعَلُوْنَ (71)		وہ سب کریں گے۔			

پھر یہ سوال کر دیا کہ ایسی صفات کی گائیں تو ہمارے ہاں بہت سی ہیں ہمیں پوچھ کر بتایا جائے کہ اس کی مزید صفات کیا ہوں؟ تاکہ ہمیں کسی متعین گائے کا علم ہو جائے جس کی قربانی اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ وہ گائے ایسی ہونی چاہیے جس سے ابھی تک کھیتی باڑی کا کام لینا شروع ہی نہ کیا گیا ہو یعنی نہ وہ بل کے آگے جوتی گئی ہو اور نہ کنویں کے آگے۔ تندرست ہو اور صحیح و سالم ہو۔ یہ نہ ہو کہ کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے کام نہ لیا جا رہا ہو اور اس میں کوئی داغ بھی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شروع میں جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا تو کسی خاص قسم کی گائے نہیں بتائی گئی تھی چنانچہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو حکم پورا ہو جاتا لیکن انہوں نے خواہ مخواہ کھود کر یہ شروع کر دی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے بھی نت نئی شرطیں عائد فرمائیں اور ایسی گائے تلاش کرنا مشکل ہو گیا جو ان شرطوں کو پورا کرتی ہو۔ یہاں تک کہ ایک مرحلے میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ ایسی گائے تلاش کر کے ذبح کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اس واقعے میں سبق یہ دیا گیا ہے کہ بلا وجہ غیر ضروری کھوج میں پڑنا ٹھیک نہیں جو بات جتنی سادہ ہو اس پر اتنی ہی سادگی سے عمل کر لینا چاہیے۔

اس واقعہ سے ملنے والی معلومات

- (1)..... نبی کے فرمان پر بغیر ہچکچاہٹ عمل کرنا چاہیے اور عمل کرنے کی بجائے عقلی دھکولے بنانا بے ادبوں کا کام ہے۔
- (2)..... پیغمبر جھوٹ، دل لگی اور کسی کا مذاق اڑانا وغیرہ عیبوں سے پاک ہیں البتہ خوش طبعی

ایک محمود صفت ہے یہ ان میں پائی جاسکتی ہے۔

(3)..... شرعی احکامات سے متعلق بے جا بحث مشقت کا سبب ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل بحث نہ نکالتے تو جو گائے ذبح کر دیتے وہی کافی ہو جاتی۔ (در منثور، البقرة، تحت الآیة: ۴۰، ۱/۱۸۹)

(4)..... إِنْ شَاءَ اللَّهُ کہنے کی بہت برکت ہے۔ حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا: اگر بنی اسرائیل وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ نہ کہتے تو کبھی وہ گائے نہ پاتے۔ (کشف الخفاء، حرف الشین المعجمۃ، ۲/۷، رقم: ۱۵۲۸)

(5)..... جو اپنے عیال کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اللہ تعالیٰ اس کی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔

(6)..... جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اس کی امانت میں دے اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتا ہے۔

(7)..... والدین کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

لاش کا زندہ ہو کر قاتل کا پتہ بتانا / دل سخت ہوتا کیوں ہے اور اس کا علاج

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَاَدْرَءْتُمْ فِيْهَا ۖ وَاللّٰهُ خَرَجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اَصْرِيْ بُؤْءًا بِبَعْضِهَا ۖ كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۖ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسُوَةً ۖ وَاِنَّ مِنْ الْحِجَارَةِ لَمَنَ لَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ اِلَآ نَهْرٌ ۖ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَنَ لَا يَشَقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْبَآءُ ۖ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَنَ لَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۖ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾

اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے

وَإِذْ	اور جب	قَتَلْتُمْ	تم نے قتل کیا	نَفْسًا	ایک شخص
فَاَدْرَءْتُمْ	پھر تم جھگڑنے لگے	فِيْهَا	اُس (کے بارے) میں		
وَاللّٰهُ	حالانکہ اللہ	خُرِجَ	ظاہر کرنے والا ہے	مَّا كُنْتُمْ	جو تم تھے
تَكْتُمُوْنَ (72)			تم سب چھپاتے۔		

یہ قتل کا وہی واقعہ ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس طرح

اللہ تعالیٰ نے اس قتل کا راز فاش کر دیا، دراصل حالیکہ وہ قتل رات کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ نیکی یا بدی تم کتنی بھی چھپ کر کرو، اللہ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ اسے لوگوں پر ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لئے خلوت ہو یا جلوت ہر وقت اور ہر جگہ اچھے کام ہی کیا کرو تا کہ اگر وہ کسی وقت ظاہر ہو جائیں اور لوگوں کے علم میں بھی آجائیں تو شرمندگی نہ ہو، بلکہ اس کے احترام و وقار میں اضافہ ہی ہو اور بدی کتنی بھی چھپ کر کیوں نہ کی جائے، اس کے فاش ہونے کا امکان ہے جس سے انسان کی بدنامی اور ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔ اس آیت سے حاصل ہونے والے سبق و اجر چھپانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا؛ اللہ حقیقت ظاہر کر دیتا ہے۔ الزام تراشی کے بجائے تحقیق اور انصاف ضروری ہے۔ اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے، وہ مردے بھی زندہ کر سکتا ہے۔ قتل جیسے بڑے گناہ کے دنیاوی اور اخروی نتائج شدید ہیں۔

قاتل کی تین جرائم

فَقُلْنَا	پھر ہم نے کہا	اَضْرِبُوْهُ	تم مارو اس کو	بِبَعْضِهَا	اس کے ٹکڑے کو
كَذٰلِكَ	اسی طرح	يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى	اللہ زندہ کرے گا مردے کو		
وَيُرِيْكُمْ	اور وہ دکھاتا ہے تمہیں	اٰيٰتِهٖ	اپنی نشانیاں	لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم
تَعْلَمُوْنَ (73)		تم سمجھ جاؤ۔			

قاتلوں کا جرم صرف یہی نہیں تھا کہ انہوں نے مال و دولت کے لالچ میں آکر اپنے چچا کو قتل کر ڈالا تھا۔ بلکہ ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ لاش کو کسی دوسرے شخص کے دروازے پر پھینک دیا تھا تا کہ ان پر شبہ نہ ہو سکے اور تیسرے یہ کہ خود شبہ سے بچنے کی خاطر اس قتل کا الزام دوسروں پر تھوپ رہے تھے۔ گائے ذبح ہونے کے بعد اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر اس مقتول کی میت پر مارا گیا تو اس کے زخم سے خون بہنے لگا۔ جسم میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس لاش نے بول کر قاتل یا قاتلوں کا نام اور پتا بتا دیا۔ اس کے بعد پھر سے اس پر موت طاری ہو گئی۔ اس طرح جن جرائم کو یہ قوم چھپائے کھنا چاہتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہر کر دیا۔ چنانچہ قصاص میں یہ دونوں بھتیجے مارے گئے

اور انہیں اپنے چچا کے ورثہ میں سے بھی کچھ نہ ملا۔ مقتول کے دوبارہ جی اٹھنے سے استدلال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ روز قیامت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کا اعلان فرما رہا ہے۔

انسان کا دوبارہ زندہ قرآن کی مثالیں

قیامت کے دن دوبارہ مردوں کا زندہ ہونا، منکرین قیامت کے لئے ہمیشہ حیرت و استعجاب کا باعث رہا ہے اور قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے تعجب کو ذکر کیا ہے۔ یہ منکرین اس بات پر یقین کرنے سے قاصر تھے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندگی کیسے دی جاسکتی ہے، منکرین سمجھتے تھے کہ مٹی میں مل جانے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن نہیں، انہوں نے کبھی مسردوں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ اسے افسانہ سمجھتے تھے، جسے قرآن نے قدرت الہی کے کھلے ثبوتوں کے ذریعے رد کیا ہے، قرآن فرماتا ہے کہ جس نے پہلی بار انسان کو عدم سے وجود بخشا، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ جوڑنا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں، یہ حیرت و استعجاب محض علم کی کمی اور منکرین کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا، جبکہ حق تعالیٰ کے لیے دوبارہ زندہ کرنا بالکل آسان ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف اسلوب اور پیرائے میں بیان فرمایا ہے سورہ بقرہ میں ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی پانچ مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک مثال: ثُمَّ بَعَثْنَا كُوفً مِّنْ بَعْدِ مَوْتِهِمْ (البقرہ: 56) میں گزر چکی ہے۔ دوسری مثال یہی قصہ ہے۔ تیسری مثال دوسرے پارے کی آیت نمبر 243 مَوْتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ چوتھی آیت نمبر 259 فَأَمَّا تِلْكَ الْمَائِدَةُ الَّتِي كَانَتْ تُرَىٰ لَهُمْ فَمِنْ أَجْلِ آلِ هَارُونَ الَّتِي حَقَّتْ عَلَيْهِمْ الْكُفْرُ فَسَوَّيْنَاهُم نَجَمًا مِّنْ سَوَابِغٍ يَّجْعَلُ لِّلْكَافِرِينَ لَظْمًا بَاسًا (البقرہ: 249) اور پانچویں مثال اس کے بعد والی آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بطور اربعہ (چار چڑیوں) کی ہے۔ قَالَ فَخُذْ أَوْ بَعَتْهُ مِّنَ الظَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ بلا لے پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں بلا وہ تیرے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے اور جان رکھ کہ اللہ

غالب حکمت والا ہے۔ (البقرة: 260)

قاتل وراثت سے محروم، اور اس پر اہل علم کا اجماع

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے (1۔ احکام القرآن للجصاص ج 1 ص 26) "لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا" "قاتل (مقتول کی) کسی شے کا وارث نہ ہوگا۔" اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت نے اس حکم کے ذریعے سے ایک خطرناک دروازہ بند کیا ہے اور وہ یہ کہ کبھی دنیوی مال کی محبت وراثت کو آمادہ کرتی ہے کہ اپنے مورث کا مال جلدی حاصل کرنے کی خاطر اسے قتل کر دے ایسی صورت میں شریعت نے اسے محروم قرار دیا۔ عسلا وہ از میں قاعدہ مشہور ہے کہ جو شخص کسی چیز کو اس کے (مشروع) وقت سے پہلے (ناجائز طور پر) حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اسی سے محروم کر دیا جائے۔ قاتل کو میراث سے محروم رکھنے پر اہل علم کا اجماع ہے، البتہ ان میں اختلاف یہ ہے کہ قتل کی وہ کون سی نوعیت اور صورت ہے جو مانع ہے اور کون سی مانع نہیں ہے۔

وہ دل، جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت

تُـمَّ قَسَتْ	پھر سخت ہو گئے	قُلُوبُكُمْ	تمہارے دل
مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ	اس کے بعد	فَهِیَ	پس وہ
أَوْ	یا (اس سے بھی)	أَشَدُّ قَسْوَةً	بہت زیادہ سخت
وَأَنَّ	اور بیشک	لَهَا	البتہ جو
يَتَفَجَّرُ	وہ پھوٹ پڑتی ہیں	مِنْهُ الْأَمَلُ	اس سے نہریں
وَأَنَّ	اور بیشک	مِنْهَا	ان میں سے (بعض)
يَشَقُّ	وہ پھٹ جاتے ہیں	فَيَخْرُجُ	پس وہ نکل آتا ہے
مِنْهُ الْمَاءُ	اُس سے پانی	وَأَنَّ	اور بیشک
		مِنْهَا	ان میں سے (بعض)

لہا	البتہ جو	یہیٹ	وہ گر پڑتے ہیں
مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ	اللہ کے ڈر سے	وَمَا اللَّهُ	اور نہیں اللہ
بِغَائِلٍ	ہرگز غافل	عَمَّا	(اس) سے جو
		تَعْمَلُونَ (74)	تم کرتے ہو۔

یعنی یہ معجزہ اور کئی سابقہ معجزات دیکھنے کے بعد تمہارے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہوا۔ بلکہ تمہارے دل سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ کچھ پتھر (پہاڑ) ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور وہ عام لوگوں کے لیے نفع کا سبب بنتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن سے کوئی چشمہ ہی جاری ہو جاتا ہے یہ پہلے کی نسبت گو کم نفع بخش ہیں تاہم نفع بخش ضرور ہیں، اور گرنے والے پتھروں میں اللہ کا خوف اور تاثر موجود ہوتا ہے مگر تم جیسے نافرمان لوگوں سے دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر قطعاً مفقود ہے۔ اور یہ تازہ واقعہ کہ مقتول دوبارہ زندہ ہو گیا، دیکھ کر بھی تمہارے دلوں کے اندر ”إِنَّا بَلِّغُكُمْ إِلَى اللَّهِ“ کا داعیہ اور توبہ و استغفار کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس تمہارے دل پتھر کی طرح سخت، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

دلوں کی سختی افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کن

دلوں کا سخت ہو جانا یہ افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کن، اور اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دلوں سے اثر پذیری کی صلاحیت سلب اور قبول حق کی استعداد ختم ہو گئی ہے، اس کے بعد اس کی اصلاح کی توقع کم اور مکمل فنا اور تباہی کا اندیشہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اہل ایمان کو خاص طور پر تاکید کی گئی ہے: وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (الحمدید: 16) ”اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب دی گئی، لیکن مدت گزرنے پر ان کے دل سخت ہو گئے۔“ اس آیت میں بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں موجود تھے، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ بڑی بڑی نشانیاں اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات

دیکھ کر بھی انہوں نے عبرت حاصل نہ کی، ان کے دل پتھروں کی طرح ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت کیونکہ پتھر بھی اثر قبول کرتے ہیں کہ ان میں کسی سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں، کوئی پتھر پھٹ جاتا ہے تو اس سے پانی بہتا ہے اور کوئی خوفِ الہی سے گر جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے لیکن انسان جسے بے پناہ ادراک و شعور دیا گیا ہے، جو اس قوی ہیں، عقل کامل ہے، دلائل ظاہر ہیں، عبرت و نصیحت کے مواقع موجود ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی طرف نہیں آتا۔ دل کی سختی کا مطلب ہوتا ہے کہ نصیحت دل پر اثر نہ کرے، گناہوں سے رغبت ہو جائے، گناہ کرنے پر کوئی شرمندگی نہ ہو اور توبہ کی طرف توجہ نہ ہو۔

قساوتِ قلبی کے اسباب، اور علاجِ نبوی ﷺ

قساوتِ قلبی کا پہلا سبب پیٹ بھر کر کھانا ہے چنانچہ حضرت سیدنا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: ”جو پیٹ بھر کر کھانے کا عادی ہو جاتا ہے اس کے بدن پر گوشت بڑھ جاتا ہے اور جس کے بدن پر گوشت بڑھ جاتا ہے وہ شہوت پرست ہو جاتا ہے اور جو شہوت پرست ہو جاتا ہے اس کے گناہ بڑھ جاتے ہیں اور جس کے گناہ بڑھ جاتے ہیں اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اور جس کا دل سخت ہو جاتا ہے وہ دنیا کی آفتوں اور رنگینوں میں غرق ہو جاتا ہے۔

حضور نبی کریم، رءوف رحیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں ایک شخص نے سخت دلی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: اِنْ اَرَدْتَ اَنْ يَلِدَ لَكَ قَلْبُكَ، فَاطْعِمِ الْمُسْكِينِ وَاَمْسَحْ رَاسَ الْيَتِيمِ یعنی اگر تم دل کی نرمی چاہتے ہو تو مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ اس حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل کی سختی کے دو علاج عطا فرمائے ہیں، علاج کی خوب صورتی پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک اللہ پاک کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور رحمتِ الہی دل کی نرمی کا سبب ہے۔ دل کی سختی کوئی چھوٹی بیماری نہیں بلکہ اس کی وجہ سے انسان سے بڑے بڑے گناہ ہو جاتے ہیں، چوری، ڈکیتی اور قتل وغیرہ جیسے چھوٹے بڑے ظلم اور حق تلفی کے واقعات دل کی

سختی کی وجہ سے ہوتے ہیں، دل سخت ہونے کی وجہ سے انسان بڑے سے بڑا گناہ بھی کر جاتا ہے حتیٰ کہ کفر تک جا پہنچتا ہے، یہ بیماری اللہ پاک کی رحمت سے دور اور عبادت کی لذت ختم کر دیتی ہے، سخت دل شخص گناہ کرنے میں دلیر ہو جاتا ہے، یہی وہ بیماری ہے کہ جس کی وجہ سے نصیحت بھی بالکل بے اثر ہو جاتی ہیں۔ دل کی سختی کتنی بڑی سزا ہے؟ اس کا اندازہ حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کے اس فرمان سے بھی ہوتا ہے: اللہ کی طرف سے دلوں اور جسموں میں کچھ سزائیں ہیں مثلاً: روزی میں تنگی اور عبادت میں سستی اور بندے کے لئے دل کی سختی سے بڑی کوئی سزا نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دل کی سختی کے جو علاج عطا فرمائے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (1) تلاوت قرآن اور موت کی یاد بھی دل کی سختی دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے چنانچہ فرمان مصطفیٰ ہے: دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو پانی پہنچنے سے زنگ لگ جاتا ہے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! اس کی صفائی کس چیز سے ہوگی؟ فرمایا: موت کی بکثرت یاد اور تلاوت قرآن سے۔ اللہ کریم ہمارے دلوں کو نرمی کی نعمت سے نوازے۔ آمین

نبی آخر الزمان ﷺ سے متعلق آیات کو چھپانا اور ان میں تحریف/حق کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
أَفْتَضَبَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُخَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ④ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا
آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَا بِعَضُفُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ
لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ⑤ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
يُسرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ⑥ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِي وَإِنَّهُمْ
إِلَّا يُظُنُّونَ ⑦

تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف

کے وہ ایمان لے آئیں گے		أَنْ يُؤْمِنُوا		کیا پس تم توقع رکھتے ہو		أَفْتَضَبَعُونَ	
تھا ایک گروہ	كَانَ فَرِيقٌ	ہالانکہ یقیناً	قَدْ	تم پر	وَقَدْ	لَكُمْ	مِّنْهُمْ
وہ سنتے (تھے)	يَسْمَعُونَ		ان میں سے		مِّنْهُمْ		
پھر بدل ڈالتے اسے	ثُمَّ يُخَرِّفُونَهُ		اللہ کا کلام		كَلِمَ اللّٰهِ		

وَمِنْ بَعْدِ	اس کے بعد کہ	مَا عَقَلُوهُ	وہ سمجھ لیتے آسے
وَهُمْ	حالانکہ وہ	يَعْلَمُونَ (75)	وہ سب جانتے ہیں۔

یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ یہود سے ایمان کی توقع بے سود ہے، ان کے پہلے بزرگ یہ ہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے کلام یعنی تورات میں تحریف کر ڈالتے تھے۔ تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آج خود یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی اس کا اعتراف ہے، دوسرے مذاہب کے پیروی کرنے والوں اور ان کی مذہبی کتابوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے، نہ قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب ہے جو محفوظ ہو اور نہ مسلمانوں کے سوا کوئی امت ہے جو اپنی آسمانی کتاب کے محفوظ ہونے کی دعویٰ دار ہو۔ مدینہ کے مسلمان جو یہود سے کئی باریہ سن چکے تھے کہ ایک نبی آخر الزمان ﷺ آنے والا ہے اور جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ اب یہ لوگ تو ایمان لے آئے مگر یہود نے یہ کام کیا کہ تورات میں جو علیہ نبی آخر الزمان ﷺ کا مذکور تھا۔ اس میں تحریف کر ڈالی اور ایمان نہ لانے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کا حلیہ تورات میں مذکور حلیہ سے مختلف ہے انصار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس بات کی بہت حرص تھی کہ یہودی اسلام قبول کر لیں کیونکہ وہ یہودیوں کے حلیف تھے اور ان کے پڑوسی بھی تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہ یہودی تمہارا یقین کریں گے یا تمہاری تبلیغ کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ وہ تھا جو صرف علماء پر مشتمل تھا، وہ اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی تورات سنتے تھے اور پھر اسے سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر بدل دیتے تھے، اسی طرح ان یہودیوں نے بھی تورات میں تحریف کی اور رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کی سیرت کو بدل ڈالا تو ایسے لوگ کہاں ایمان لائیں گے؟ لہذا تم ان کے ایمان کی امید نہ رکھو۔ (قرطبی،

باطل پرست علماء کی تحریف

آج کل کے باطل پرست علماء بھی اپنے خود ساختہ مسائل کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے حوالہ جات قرآن و حدیث سے تراش رہے ہیں اور شریعت میں تحریف کا ارتکاب کر رہے

ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم کا بگڑنا عوام کے بگڑنے سے زیادہ تباہ کن ہے کیونکہ عوام علماء کو اپنا ہادی اور رہنما سمجھتے ہیں، وہ علماء کے اقوال پر عمل کرتے اور ان کے افعال کو دلیل بناتے ہیں اور جب علماء ہی کے عقائد و اعمال میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو عوام راہ ہدایت پر کس طرح چسل سکتی ہے، اور کئی جگہ پر شاید یہ عالم کہلانے والوں کی بد عملی کا نتیجہ ہے کہ آج لوگ دیندار طبقے سے متنفر ہو رہے ہیں اور ان کے خلاف اپنی زبان طعن دراز کر رہے ہیں۔ اے گروہ علماء! اگر تم محتبات چھوڑ کر مباحات کی طرف جھکو گے (تو) عوام مکروہات پر گریں گے، اگر تم مکروہ کرو گے (تو) عوام حرام میں پڑیں گے، اگر تم حرام کے مرتکب ہو گے (تو) عوام کفر میں مبتلا ہوں گے۔ للہ اپنے اوپر رحم کرو، اپنے اوپر رحم نہ کرو (تو) اُمّت مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پر رحم کرو، چرواہے کہلاتے ہو بھیڑ نیسے نہ ہو۔ بہر حال علم بہت اہم اور عالی چیز ہے اور یہ حقیقت ہے کہ علم، دین کا ہی علم ہے، جو لوگ علم دین میں لگتے ہیں اس کو حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں اس کی نشر و اشاعت میں محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں ان کیلئے دنیا میں سربلندی و سرداری ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بہت معزز اور اعلیٰ مقام ہے لیکن ان کی عزت و تکریم اور ان کا مقام و مرتبہ جب ہی ہے جب وہ علم کے ساتھ علم کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔

یہودیوں کے دس بڑے عالم

الغرض! اہل ایمان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہ راست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا (1۔ بخاری ج 1 ص 562) کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ ان سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پراڑ سے رہے۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ کا ارشاد ہے (2)

بخاری ج 1 ص 490، مسلم ج 1 ص 87) کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح (علیہ السلام) قرب قیامت میں نازل ہوں تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔

منافق یہودی جب صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ سے ملتے

وَاِذَا	اور جب	لَقُوا	وہ ملتے ہیں	الَّذِينَ اٰمَنُوا	جو ایمان لائے
قَالُوا	وہ کہتے ہیں	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے ہیں	وَاِذَا	اور جب
حَلَا	اکیلے ہوتے ہیں	بَعْضُهُمْ	اُن کے بعض	اِلٰی بَعْضٍ	بعض کی طرف
قَالُوا	وہ کہتے ہیں	اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ	کیا تم بتاتے ہو انہیں	ہمنا	وہ (جو)
فَتَبَحَّ اللّٰهُ	کھول دیا ہے اللہ نے	عَلَيْكُمْ	تم پر		
لِيُحَاجُّوْكُمْ	تاکہ وہ حجت پیش کریں تم پر	بِه	اس کے ذریعے		
عِنْدَ رَبِّكُمْ	تمہارے رب کے پاس	اَفَلَا	تو کیا نہیں		
تَعْقِلُوْنَ (76)	تم عقل رکھتے۔				

حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ فرماتے ہیں: یہودی منافق جب صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ سے ملتے تو ان سے کہتے کہ جس پر تم ایمان لائے اس پر ہم بھی ایمان لائے، تم حق پر ہو اور تمہارے آقا محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سچے ہیں، ان کا قول حق ہے، ہم ان کی صفات اپنی کتاب توریت میں پاتے ہیں۔ جب یہ اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو وہ ان منافقوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتے: کیا تم مسلمانوں کے سامنے ان کے آقا محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے بارے وہ باتیں بیان کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری کتاب میں بیان فرمائی ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعے دنیا و آخرت میں تمہارے اوپر حجت قائم کر دیں کہ جب ہمارے آقا محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا نبی برحق ہونا تمہاری کتابوں میں موجود ہے تو تم نے ان کی پیروی کیوں نہ کی؟ کیا تمہیں عقل نہیں کہ تمہیں یہ کام نہیں کرنا چاہئے۔ (غازن، البقرة)

ضرورت کے وقت علم حق کو چھپانا

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: بڑا جرم یہ ہے کہ حق و باطل میں تلبیس کی بجائے سرے سے حق ہی کو چھپا لیا جائے۔ یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔ زوال کے زمانے میں رجعت پرند مذہبیت اس مرض کا بھی شکار ہوتی ہے اور وہ دین کی سچی تعلیمات کو ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے عام لوگوں سے چھپاتی ہے۔ یہودیوں میں بھی زوال کے زمانے میں یہ مرض لاحق ہو چکا تھا۔ اس لیے قرآن حکیم نے خاص طور پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو چھپانے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ حق کو چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”جس آدمی سے کسی ایسے علم کے بارے میں سوال کیا گیا، جسے وہ جانتا ہے، پھر اُس نے اُسے چھپایا تو قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔“ (مشکوٰۃ: 223) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ”ضرورت کے وقت علم حق کو چھپانا حرام ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا دین کی توہین ہے۔ یہ شریعت کو بھلا دینے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کرنے سے علم کا بڑا حصہ مٹ جاتا ہے۔“ (حجتہ اللہ البالغہ، من ابواب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) حقیقت یہ ہے کہ جب دین کے نااہل نمائندے دنیاوی لذات اور خواہشات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور دین کے غلبے کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ اُس کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ اس پر ٹھیک طرح سے عمل کرتے ہیں، نیکیوں اور معروفات کا نظام نہیں بناتے، منکرات سے نہیں روکتے تو آہستہ آہستہ دین کے خلاف رسومات اور نظام ہائے حیات قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ سچے علم کو چھپانے اور اُسے پڑھنے پڑھانے سے رک جانے کے نتائج ہوتے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر حق و باطل کی تلبیس اور سرے سے حق کو چھپانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس کو بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کو پہچاننے کے لیے تورات وغیرہ میں خاصا مواد موجود تھا۔ جسے یہ لوگ نبی آخر الزمان ﷺ کے مدینہ آنے سے پہلے لوگوں میں مشہور کر چکے تھے اور ان میں کچھ لوگ نبی آخر الزمان ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد بھی بیان

کردیتے تھے اور ان سے کہہ دیتے کہ ہم بھی اس پیغمبر پر ایمان لاتے ہیں۔ مگر وہ جب اپنے گرو گھنٹالوں کے ہاں جاتے تو وہ انہیں یہ کہتے کہ تم مسلمانوں کو تورات کی ایسی باتیں کیوں بتاتے ہو جو تمہارے اپنے خلاف جاتی ہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے حضور مسلمان تم پر حجت قائم کر دیں کہ یہ لوگ پورا علم ہونے کے باوجود بھی ایمان نہ لائے تھے۔ مسلمانوں سے بات کرنے سے پہلے کچھ سوچ کر لیا کرو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سرکارِ دو عالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اوصاف کو چھپانا اور ان کے کمالات کا انکار کرنا یہودیوں کا طریقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی معرفت

اَوَّلًا	اور کیا نہیں	يَعْلَمُونَ	وہ جانتے ہیں	أَنَّ اللَّهَ	کہ بیشک اللہ
يَعْلَمُ	وہ جانتا ہے	مَا يُسِرُّونَ	جو وہ چھپاتے ہیں	وَمَا	اور جو
يُعْلِنُونَ (77)			وہ سب ظاہر کرتے ہیں۔		

بالفاظِ دیگر ان یہود علماء کا یہ خیال تھا کہ بس مسلمانوں کے بتانے سے ہی اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن اس حقیقت کا پتہ چلے گا ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی معرفت اتنی کمزور ہے کہ انہیں یہ بھی یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کھلی اور چھپی سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے اور ان باتوں کو بھی جو یہ اب اپنے ساتھی یہودیوں سے کر رہے ہیں۔

بے بنیاد اور غلط قسم کی آرزوئیں

وَمِنْهُمْ	اور ان میں سے (بعض)	أُمِّيُونَ	ان پڑھ ہیں
لَا يَعْلَمُونَ	نہیں وہ جانتے	الْكِتَابِ	کتاب
أَمَانِيٍّ	آرزوؤں کے	وَأَنَّ هُمْ	اور نہیں وہ سب
لَا يَطْنُونَ (78)		مگر وہ گمان کرتے ہیں۔	

بنی اسرائیل کے عناد اور سرکشی کو بیان کرنے کے بعد اب ان کے مختلف طبقوں کا بیان ہو رہا

ہے، اس آیت میں عوام کی حالت بیان کی گئی ہے۔ (رازی) اُحیٰ وہ ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور ”اَمَانِیَّ“ ”اُمْنِیَّۃ“ کی جمع ہے، ”اُمْنِیَّۃ“ کا ایک معنی تلاوت بھی آتا ہے، فرمایا: (اَلَا اِذَا تَمَتَّیَ اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ) [الحج: 52] اس کا ایک ترجمہ تلاوت بھی کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ وہ غالی تلاوت کر سکتے ہیں مگر انھیں اس کے مطلب کی کچھ خبر نہیں، جیسا کہ آج کل اکثر مسلمان، خواہ حافظ قرآن ہوں، محض تلاوت کر سکتے ہیں، مگر مفہوم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ جس کے معنی آرزوؤں یا من گھڑت روایات کے ہیں، یعنی یہود میں ایک طبقہ جو عوام کا ہے اور ان پڑھ ہے، انھیں ”الکتاب“ یعنی تورات کا تو کچھ علم نہیں، مگر وہ اپنے سینوں میں بعض بے بنیاد قسم کی آرزوئیں پالے ہوئے ہیں، یعنی علماء یہود اپنی عوام کو یقین دلاتے تھے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے اور چوں کہ ہمارے آباء و اجداد اللہ کے پیغمبر تھے، اس لئے وہ بہر حال ہماری مغفرت کرا لیں گے، اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کر کے ان کو اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے، قرآن نے اسی خوش خیالی اور خود فریبی کی تردید کی ہے۔ مختلف قسم کی خرافات کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی غلط آرزوئیں ہیں یا من گھڑت قصے ہیں جو انھوں نے سن رکھے ہیں۔

بے بنیاد اور غیر حقیقت پسندانہ آرزوؤں (خواہشات) کا تعلق عموماً ایسی سوچ سے ہوتا ہے جو زمینی حقائق، انسانی صلاحیتوں یا اخلاقی حدود سے ماورا ہو۔ ایسی خواہشات اکثر انسان کو ذہنی تناسل اور مایوسی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ایسی بے بنیاد آرزوئیں انسان کو موجودہ نعمتوں کی قدر کرنے سے روکتی ہیں، ذہنی سکون غارت کرتی ہیں اور مستقل بے چینی کا سبب بنتی ہیں۔ ہمیں اس سے سبق حاصل کر کے ان بے بنیاد خواہشات کی جگہ حقیقت پسندانہ اہداف مقرر کیے جائیں، اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا جائے، اور قناعت (جمل گیا ہے اس پر شکر) کو اپنایا جائے، جس سے زندگی میں حقیقی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

غلط فتوؤں کی کمائی / باطل عقائد کی بنیاد مسلمانوں کے باطل عقائد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
فَوَيْلٌ لِلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ؕ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لّٰهُمَّ ؕ مَا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَوَيْلٌ لّٰهُمَّ ؕ مِمَّا
يَكْسِبُوْنَ ۝ ۴۰ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ۴۱ بَلٰى مَنْ كَسَبَ
سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَخْتٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ۴۲
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ۴۳

تورات کے احکام رد و بدل کرنے والے

فَوَيْلٌ	پس ہلاکت ہے	لِلَّذِيْنَ	(اُن) کے لئے جو
يَكْتُبُوْنَ	وہ لکھتے ہیں	الْكِتٰبَ	اپنے ہاتھوں سے
ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ	پھر وہ کہتے ہیں	هٰذَا	یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	لِيَشْتَرُوْا	تاکہ وہ حاصل کریں

یہ	اس کے ذریعے	ثَمَنًا قَلِيلًا	معمولی قیمت	فَوَيْلٌ	پس ہلاکت ہے
لَهُمْ	اُن کے لئے	يٰۤهٰذَا كَتَبْتُ	(اس) سے جو لکھا		
اَيَّدِيْهِمْ	ان کے ہاتھوں نے	وَوَيْلٌ	اور ہلاکت ہے	لَهُمْ	اُن کیلئے
يٰۤهٰذَا	(اس) سے جو	يَكْسِبُوْنَ (79)	وہ کماتے ہیں۔		

گذشتہ آیت میں عوام کا ذکر تھا اور اس آیت میں علماء یہود کا ذکر ہے، جو معمولی پیسے لے کر تورات کے احکام رد و بدل کے ساتھ بتایا کرتے تھے۔ جب سرکارِ دو جہاں صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو علماء توریت اور سردارِ ان یہود کو قوی اندیشہ ہو گیا کہ ان کی روزی جاتی رہے گی اور سرداری مٹ جائے گی کیونکہ توریت میں حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا حلیہ اور اوصاف مذکور ہیں، جب لوگ حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو اس کے مطابق پائیں گے تو فوراً ایمان لے آئیں گے اور اپنے علماء اور سرداروں کو چھوڑ دیں گے، اس اندیشہ سے انہوں نے توراۃ میں تحریف و تغیر کر ڈالا۔ علماء یہود کا یہ حال تھا کہ انہوں نے تورات کی شروح اور علماء کے فتاویٰ کو بھی تورات میں ہی غلط ملط کر ڈالا تھا۔ پھر عام لوگوں سے اسے یوں بیان کرتے تھے گویا یہ سب کچھ ہی منزلِ من اللہ ہے۔ اور اس سے غرض محض دنیوی مال و دولت کا حصول ہوتا تھا اور ان کے مفسروں کی تاویلات، مفکروں کے فلسفیانہ خیالات اور فقہاء کے قانونی اجتہادات اور اپنے قومی تاریخی واقعات، یہ سب چیزیں بائبل میں شامل کر دی تھیں اور اس سب کچھ پر ایمان لانا فرض قرار دیا گیا تھا۔ ایسے مجموعہ میں سے انہیں کسی بھی قسم کا فتویٰ دینے یا لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی اور جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے فتوؤں کے منہ مانگے دام وصول کرتے تھے۔

اس پر فرمایا گیا کہ بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے تورات میں من گھڑت باتیں لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ تو ان لوگوں کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کی وجہ سے اور ان کی کمائی کی وجہ سے تباہی و بربادی

ہے۔ اس آیت میں یہود کے علما کی جرات اور خوف الہی سے بے نیازی کی وضاحت ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مسئلے گھڑتے ہیں اور بہ بانگ دہل یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ (وَيْلٌ) کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے، اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ بڑی ہلاکت کیا گیا ہے۔ حدیث کی رو سے (وَيْلٌ) جہنم میں ایک وادی بھی ہے جس کی گہرائی اتنی ہے کہ ایک کافر کو اس کی تہ تک گرنے میں چالیس سال لگیں گے۔ (احمد، ترمذی، ابن حبان والحاکم بحوالہ فتح القدیر) بعض علما نے اس آیت سے قرآن مجید کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں۔ آیت کا مصداق صرف وہی لوگ ہیں جو دنیا کمانے کے لئے کلام الہی میں تحریف کرتے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیتے ہیں۔

یہود کا من گھڑت عقیدہ اور اس کے تین جواب

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	لَنْ	ہرگز نہیں	نَمَسِّنَا	چھوئے گی ہمیں
النَّارِ	آگ	إِلَّا آيَاتِنَا	مگر چند دن	مَعْدُودَةً	گنتی کے
قُلْ	آپ کہہ دیں	أَتَتَّخِذُكُمْ	کیا تم نے لے رکھا ہے	عِنْدَ اللَّهِ	اللہ کے پاس
عَهْدًا	کوئی وعدہ	فَلَنْ	تو ہرگز نہیں	يُخْلِفَ اللَّهُ	وہ خلاف کرے گا اللہ
عَهْدَةً	اپنے وعدے کے	أَمْ تَقُولُونَ	یا تم کہتے ہو		
عَلَى اللَّهِ	اللہ پر	مَا لَا	جو نہیں	تَعْلَمُونَ (80)	تم جانتے۔

یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد اور اللہ کے محبوب ہیں لہذا ماسوائے چند دن کے انہیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ان کے اس باطل عقیدہ کا جواب اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے دیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ اس عقیدہ کی اصل کیا ہے؟ کیا اللہ نے تم سے کوئی ایسا وعدہ لے رکھا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو دکھاؤ تو سہی۔ یا بس تم اللہ پر ایسی ہی جھوٹی باتیں جو دیتے ہو؟ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اے یہود! اگر تم فی الواقع اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور ماسوائے چند دن کے

تمہیں دوزخ کی آگ چھو بھی نہیں سکے گی تو پھر تم مرنے کی آرزو کیوں نہیں کرتے یا بالفاظ دیگر ان دنیا کے جھنجٹوں سے نکل کر جنت میں جانے کی آرزو کیوں نہیں کرتے؟ اور چونکہ یہود مرنے کے لیے مطلقاً آمادہ نہیں بلکہ طویل مدت تک دنیا میں ہی رہنا چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہود اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں اور تیسرا جواب انہیں یہ دیا گیا کہ اللہ کا قانون جزاء و سزا سب کے لیے یکساں ہے۔ یہاں نسبی رشتے کچھ کام نہیں آئیں گے جس شخص کو اس کی بد اعمالیوں نے گھیر لیا وہ یقیناً دوزخ میں ہی جائے گا۔ پھر ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس قانون میں اسے یہود! تمہارے لیے کوئی تخصیص نہیں۔ اس آیت میں یہود کی ہمہ گیر گمراہی کا بیان ہے، جس میں عوام اور علماء سبھی مبتلا تھے، یعنی ہم اللہ کے محبوب اور پیارے ہیں، ہم چاہے کتنے بھی گناہ کریں جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن وہاں رکھ کر نکال لیے جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے خلیسہ کے یہودیوں سے کئی سوال کیے، ان میں سے ایک یہ تھا: (مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟) ”آگ میں جانے والے کون لوگ ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر اس میں تم ہماری جگہ لے لو گے۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: (إِخْسَؤْا فِيهَا، لَا تَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا) ”تمھی اس میں دفعہ دور رہو ہم اس میں کبھی تمہاری جگہ نہیں لیں گے۔“ [بخاری، الجزیۃ والموادع، باب إذا غدر المشركون۔۔۔ 3169] اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائد باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم و عمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزوئیں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) انہیں دوزخ سے بچالیں گے۔ اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔

شفاعت کا مسئلہ اور قرآن پاک کی وضاحت

شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پر ”یا شفیع المذنبین“ کے نعرے مارے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہے کرتے پھر میں۔ حضور ﷺ ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ ”لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ“۔ ”اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کریگا اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ روز قیامت انبیاء اور فرشتے بھی صرف انہی لوگوں کی سفارش کر سکیں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور ان کے عمل سے راضی ہوگا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ فلاں ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے ضروری قبول فرماے گا یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے۔ محض میلاد منعقد کر لینا۔ جلوس نکال لینا یا گیارہویں منالینا کافی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے شیعہ بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت حسینؑ کا نام لے لو۔ ماتم برپا کر لو۔ بس بخشے جاؤ گے، کبھی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب علم و عمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ساری عمر لوگ اسی ڈھول کو پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ کہ خدا چاہے راضی ہو یا ناراض، نبی، ولی، جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہیں سے ٹھوکر کھائی۔ اور ہم بھی اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ گیا ہے۔

گناہ کا احاطہ کا مفہوم و مطلب

بلی	ہاں کیوں نہیں	مَنْ كَسَبَ	جس نے کمائی	سَيِّئَةً	برائی
وَاحَاطَتْ	اور گھیر لیا	بِهِ	اس کو	حَاطَتْهُ	اس کے گناہ نے
فَأُولَٰئِكَ	تو وہی لوگ	أَصْحَابُ النَّارِ	دوزخ والے ہیں۔		

ہمیشہ رہیں گے۔	خُلِدُونَ ⑧	وہ اس میں	هُمْ فِيْهَا
----------------	-------------	-----------	--------------

فرمایا اے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔ ”بلی“ بلکہ قانون نجات یہ ہے کہ ”مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهُ“ جس شخص نے بھی گناہ کمایا اور اس کے گناہوں نے اسے گھیر لیا۔ ”فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ“ یہی لوگ دوزخی ہیں۔ ”هُمْ فِيْهَا خُلِدُوْنَ“ جو ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا۔ جو سب سے بڑا ہوگا۔ اور چاروں طرف چھایا ہوگا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ اس آیت میں گناہ سے شرک و کفر مراد ہے اور احاطہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ نجات کی تمام راہیں بند ہو جائیں اور کفر و شرک ہی پر اس کو موت آئے کیونکہ مومن خواہ کیسا بھی گنہگار ہو گناہوں سے گھرا نہیں ہوتا مومن کس قدر بھی گناہ میں مبتلا ہو، ہم سے کم ایمان قلبی سے محروم نہ ہوگا اور وہی چیز انشاء اللہ اس کو انجام کار دوزخ سے نجات دلائے گی اور جنت میں لے جائے گی۔

مؤمنین کے ایمان اور عمل صالح پر بشارت

وَالَّذِيْنَ	اور جو (لوگ)	اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَعَمِلُوْا	انہوں نے عمل کئے
الصّٰلِحٰتِ	نیک	اُولٰٓئِكَ	وہی لوگ	اَصْحَابُ الْجَنَّةِ	جنت والے ہیں
هُمْ فِيْهَا	وہ اس میں	خُلِدُوْنَ (82)	ہمیشہ رہنے والے ہیں		

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”اَيُّ الْعَمَالِ اَفْضَلُ؟“ حضور! کونسا عمل افضل ترین ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا (1۔ مسلم ج 1 ص 62) اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی لیے فرمایا ”وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ جو لوگ ایمان لائے ”وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ“ اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے،

ان کے متعلق فرمایا ”أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ“ یہی لوگ جنت والے ہیں۔ جنت کی چابی ان کے پاس ہے اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہوگا۔ بلکہ ”هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔ (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ) کفر پر وعید کے بعد ایمان اور عمل صالح پر بشارت ہے اور یہ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ بشارت و نذارت دونوں اٹھی ذکر ہوتی ہیں۔ الغرض! یہاں اصول بتا دیا گیا کہ جنت و دوزخ میں داخل ہونا رنگ و نسب اور نسل و خاندان سے متعلق نہ ہوگا، کہ حضرت ابراہیم یا حضرت اسحاق یا حضرت اسماعیل علیہم السلام کی اولاد جنت ہی میں جائے گی، دوزخ میں نہ جائے گی؛ بلکہ اس کا تعلق ایمان و عمل سے ہوگا، جو صاحب ایمان ہو اور عمل صالح کرتا ہو وہ جنتی ہوگا اور جو کفر و نافرمانی کا راستہ اختیار کرے گا، وہ دوزخی ہوگا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ۔

دین میں عبادات کا مقام/ عبادت کا ناقص تصور خون ناحق اور جلاوٹی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا
وَّذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَآتُوا الزَّكَاةَ ۖ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٣٧﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا
مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٣٨﴾

اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے

وَإِذْ	اور جب	أَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيثَاقَ	پختہ عہد
بَنِي إِسْرَءِيلَ	بنی اسرائیل سے	لَا تَعْبُدُونَ	نہیں تم عبادت کرو گے	وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	احسان کرنا
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ	اور یتیموں	وَالْيَتَامَىٰ	اور یتیموں	وَالْيَتَامَىٰ	اور یتیموں
وَالْمَسْكِينِ	اور مساکین (کے ساتھ)	وَقُولُوا	اور تم کہو	وَقُولُوا	اور تم کہو

لِلنَّاسِ	لوگوں سے	حُسْنًا	اچھی بات	وَاقِيْمُوْا	اور قائم کرو	الصَّلَاةَ	نماز
وَأَنْتُمْ	اور ادا کرو	الزَّكَاةَ	زکوٰۃ	ثُمَّ	پھر	تَوَلَّيْتُمْ	تم پھر گئے
إِلَّا	سوائے	قَلِيْلًا	تھوڑے سے	مِنْكُمْ	تم میں سے		
وَأَنْتُمْ	اور تم	مُعْرِضُوْنَ	سب پھر جانے والے ہو۔	(83)			

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَ يَلْ: اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ یعنی اے یہودیو! وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے تورات میں یہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی عبادت کا متحق نہیں اور اپنے مال باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو لیکن اسے قبول کرنے کے بعد ان میں سے چند آدمیوں کے علاوہ سب اس عہد سے پھر گئے اور تم بھی اپنے آباء اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے ہو۔ (جلالین مع صاوی، البقرة، تحت الآیۃ: ۸۳، ۱/ ۸۱-۸۲، ملخصاً) اب یہاں اس آیت میں پھر ان کو وہ عہد یاد دلایا جا رہا ہے جو بنیادی احکام (عبادات و معاملات) دیتے وقت ان سے لیا گیا تھا اور بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کی پابندی نہ کی اور اس سے سراسر بے پروائی اختیار کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کی عادت ہی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کرنا اور اس کے عہد سے پھر جانا ہے۔ چنانچہ تورات میں جا بجا توحید پر قائم رہنے کی اور لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید موجود ہے۔

عبادت کی چار قسمیں

لَا تَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ: عبادت کی چار قسمیں ہیں: 1 بدنی عبادت، جیسے طواف، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ 2 مالی عبادت، جیسے صدقہ و خیرات کرنا اور نذر و نیاز ماننا۔ 3 لسانی عبادت (یعنی زبان سے)، جیسے کسی کے نام کا وظیفہ چینا، یا ٹھٹھے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی کا نام لینا۔ 4 قلبی عبادت (یعنی دل سے)، جیسے کسی پر پھر و سار کھنا، کسی سے خوف کھانا یا امید رکھنا۔ یہ سب عبادتیں اللہ کے لیے ہیں،

ان میں جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا وہ شرک کا مرتکب ہو گیا۔

عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل

عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل ہے: (۱) پرستش، (۲) غلامی، (۳) اطاعت، خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکر گزار ہو، اسی سے دعائیں مانگے اور اسی کے آگے عقیدت و محبت سے سر جھکائے، یہ عبادت کا پہلا مفہوم ہے۔ انسان خدا کا بندہ و غلام بن کر رہے، اس کے مقابلے میں خود مختار اندر وہ یہ نہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی غلامی قبول نہ کرے یہ عبادت کا دوسرا مفہوم ہے، انسان خدا کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے نہ خود اپنا حکمراں بنے اور اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے یہ عبادت کا تیسرا مفہوم ہے۔

عبادت ایک جامع لفظ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ ”عبادت ایک ایسا جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری و باطنی اقوال و افعال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور اس کی خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، راست گوئی، امانت داری، اطاعت والدین، ایفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں، مسکینوں اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک، جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ، دعاء، ذکر الہی، تلاوت قرآن اور اس قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت، رحمت خداوندی کی امید و ارغذاب الہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت میں شامل ہیں۔

دین میں عبادات کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہیں، عبادات کے بغیر دین کو صحیح صورت پر باقی رکھنا ممکن نہیں، اگرچہ دین کے تمام احکام کی تعمیل کو اللہ عبادت ہے مگر عام طور پر مشہور عبادتیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے اندر جو ملاً اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی تاثیر اور

انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی خاصیت ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں، ان کو عبادات میں وہی مقام حاصل ہے جو اعضاء جسم میں قلب و دماغ کو ہے اسی بنا پر ان کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور ان پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اسلام کی بنیادی پانچ چیزیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ، عَلَى أَنْ يُعْبَدَ اللَّهُ، وَيُكْفَرَ بِمَا دُونَهُ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ، وَحَجُّ الْبَيْتِ، وَصَوْمُ رَمَضَانَ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس پر کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا ہر کسی کی عبادت سے انکار کیا جائے، یعنی اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں نماز قائم کرنے، زکاۃ دینے، بیت اللہ کا حج کرنے اور رمضان کے روزے رکھنے پر" [صحیح مسلم/ کتاب الایمان/ حدیث: 112]

یہ بنیادی عبادات ہیں؛ لیکن ان کا دائرہ محدود نہیں ہے؛ بلکہ بے حد وسیع ہے، انسان کے لیے ضروری ہے کہ اہم عبادات کے ذریعے اپنی ساری زندگی کو کامیاب بنائے اور پھر اصل مقصود جو رضاء الہی ہے وہ حاصل کرے، بقول آزاد قسراں کہتا ہے: "اصل دین خدا پرستی اور نیک عمل ہے" اسلام میں عبادات کا ایک رخ داغی قلبی ہے اور دوسرا خارجی و جسمانی و مجلسی۔ ان دونوں رخوں کے بارے میں قرآن وحدیث اور کتب فقہ میں مفصل احکام موجود ہیں۔ اسلام میں عبادات صرف وہی نہیں جو خدا سے مناجات و مکالمے کا روپ دھارتی ہے؛ بلکہ وہ بھی ہے جو اندر کی طہارت کے ذریعے خارجی اجتماعی افعال و اعمال انسانی کے بارے میں بھی صدق و اخلاص، حسن نیت اور حسن عمل کے اوصاف پیدا کرتی ہے، داغی عبادات کے بغیر عبادت کے ظاہری رخ ناقص رہتے ہیں۔ شریعت کے ظاہری اعمال بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصد حاصل ہو۔ پس ہمیں پوری زندگی کو عبادت کے سانچے میں ڈالنا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے تمام ظاہری اور باطنی اعمال و اقوال جو اللہ کو پسند ہیں، اس کی خوشنودی کا ذریعہ ہیں انہیں پورے خلوص و دیانت داری کے ساتھ ادا کریں۔

چند اعمال اور مراسم عبودیت کا ہمارا تصور

آج ہمارے یہاں عبادت کا علیہ بگڑا ہوا ہے، اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے عبادت کو صرف چند اعمال اور مراسم عبودیت کے ساتھ خاص کر لیا ہے اور یہ سمجھ لیا کہ بس ان کی ادائیگی پر عبادت منحصر ہے، بقیہ زندگی اس سے بالکل خالی ہے، نماز کو ہم عبادت سمجھتے ہیں اور صحیح سمجھتے ہیں، روزہ عبادت ہے، زکوٰۃ عبادت ہے، حج عبادت ہے۔ بلاشبہ یہ سب عبادت ہیں، لیکن جب دین کو ان میں منحصر کر لیا جائے اور یہ تصور قائم کر لیا جائے کہ بس ان کو بحال لانے سے ہم حق عبودیت سے عہدہ برا آہو گئے یہ بالکل غلط تصور ہوگا، ”اگر صرف ان عبادت کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا، تو تصور دین محدود ہی نہیں؛ بلکہ مسخ ہو جائے گا“

عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے؛ زندگی کے ہر معاملے اور ہر گوشے کو اللہ کے حکم کا مطیع بنادینا اور اپنی آزادی، اپنی خود مختاری، اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ کی مرضی کے تابع بنادینا اسی رویہ اور طرز عمل پر کاربند ہونا، زندگی کے تمام افعال و اعمال میں تسلیم خم کرنا ہی عبادت ہے۔ الغرض! معلوم ہوا کہ عبادت کے معنی بندگی اور طاعت کے ہیں، عبادت صرف کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں بلکہ ہر وہ کار خیر اور مباح عمل بھی عبادت میں داخل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے اور شریعت کے مطابق کیا جائے، پس سنت پر عمل کرنا بھی عبادت ہے، اور ۲۳/ گھنٹے کی زندگی میں کھانا، پینا، اٹھنا بیٹھنا، والدین کی خدمت کرنا اور تجارت وغیرہ کرنا یہ سب کام عبادت بن سکتے ہیں بشرطیکہ سنت و شریعت کے مطابق انجام دئے جائیں، درود شریف بھی عبادت ہے، ذکر بھی عبادت ہے اور حجر اسود کو بوسہ دینا بھی عبادت ہے۔

خون ناحق اور جلا وطنی

وَإِذْ	اور جب	أَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيثَاقَكُمْ	تم سے پختہ عہد
لَا تَسْفِكُونَ	نہ تم بہاؤ گے	دِمَاءَكُمْ	اپنوں کے خون		
وَلَا تُخْرِجُونَ	اور نہ نکالو گے	أَنْفُسَكُمْ	اپنے نفسوں کو		

مِن دِیَارِکُمْ	اپنے گھروں سے	تُمْ	پھر	أَقْرَرْتُكُمْ	تم نے اقرار کیا
وَأَنْتُمْ	اور تم	تَشْهَدُونَ	گواہ ہو۔ (84)		

خون ناحق اور جلاوطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو برائیوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے ”وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ“ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا۔ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ ”کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے۔ جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورہ نساء سورہ بنی اسرائیل اور سورہ فرقان میں آئے گا کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطع حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔ توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا ”وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ“ یعنی تم اپنے ہم مسلک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فرمایا ”تُمْ أَقْرَرْتُكُمْ“ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفاء کریں گے اور توراۃ کے احکام کی پابندی کریں گے۔ ”وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ“ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلاوطن کرو گے۔

ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت

الحاصل! ان آیات میں پھر وہ عہد بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا لیکن اس سے بھی انہوں نے اعراض ہی کیا۔ اس عہد میں اولاً صرف ایک اللہ کی عبادت کی تاکید ہے جو ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت رہی ہے (جیسا کہ سورۃ الانبیاء آیت اور دیگر آیات سے واضح ہے) اس کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اللہ کی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر والدین کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید سے واضح کر دیا گیا کہ جس طرح اللہ کی

عبادت بہت ضروری ہے، اسی طرح اس کے بعد والدین کی اطاعت بھی بہت ضروری ہے اور اس میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر والدین کی اطاعت کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے، اس کے بعد رشتہ داروں، یتیموں اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور حسن گفتار کا حکم ہے، اسلام میں بھی ان باتوں کی بڑی تاکید ہے، جیسا کہ احادیث رسول (ﷺ) سے واضح ہے۔ اس عہد میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا بھی حکم ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عبادتیں پچھلی شریعتوں میں بھی موجود رہی ہیں جن سے ان کی اہمیت واضح ہے۔ اسلام میں بھی یہ دونوں عبادتیں نہایت اہم ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار، یا اس سے اعراض کو کفر کے مترادف سمجھا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے عہد خلافت میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے سے واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک راہوں پر چلائے اور یہود کی اختیار کردہ راہوں سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں اپنی اطاعت و بندگی اور اپنے محبوب کریم (ﷺ) کی اطاعت و اتباع میں اخلاص عطا کرے۔ آمین

دور نبوی میں یہود کا انجام / مسلمانوں کی حالت زار

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
 ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ
 دِيَارِهِمْ يَت ظَاهِرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَإِن يَأْتُواكُمْ أُسْرَىٰ تَقْدُواهُمْ
 وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۖ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
 بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ
 الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۖ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
 الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
 يُنصَرُونَ ۝

مدینہ میں یہود کے مشہور قبائل اور ان کے مذموم افعال

ثُمَّ أَنْتُمْ	پھر تم	هُؤُلَاءِ	وہی (لوگ ہو)	تَقْتُلُونَ	تم قتل کرتے ہو
أَنْفُسَكُمْ	اپنوں کو	وَتُخْرِجُونَ	اور تم نکالتے ہو	فَرِيقًا	ایک گروہ کو
مِنْكُمْ	اپنوں میں سے	مِنْ دِيَارِهِمْ	ان کے گھروں سے		
تَظَاهَرُونَ	تظاہر کر رہے ہیں	تَمَّ	تم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو		

تظاہرون علیہم “سے مخالفین کی مدد کرنا“ مراد ہے، اور قرآن میں مختلف مواقع پر یہ لفظ

اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: الفرقان: ۵۵، التحریم: ۴)

عَلَيْهِمْ	ان کے خلاف	بِالْإِثْمِ	گناہ کے ساتھ	وَالْعُدْوَانِ	اور زیادتی کے ساتھ
وَإِنْ	اور اگر	يَأْتُواكُمْ	وہ آئیں تمہارے پاس	أُسَارَى	قیدی بن کر
تُفَادُوهُمْ	تم انہیں فدیہ دیکر	چھڑاتے ہو	وَهُوَ فَحْرٌ	حالانکہ حرام کیا گیا	
عَلَيْكُمْ	تم پر	إِخْرَاجُهُمْ	ان کا نکالنا	أَفْتَوْ مُنُونٌ	تو کیا تم ایمان لاتے ہو
بِبَعْضِ الْكِتَابِ	کتاب کے کچھ حصے پر	وَتَكْفُرُونَ	اور تم انکار کرتے ہو		
بِبَعْضِ	بعض کا	فَمَا جَزَاءُ	پس نہیں بدلہ	مَنْ يَفْعَلُ	جو وہ کرے
ذَلِكَ	یہ	مِنْكُمْ	تم میں سے	إِلَّا خِزْمِي	سوائے رسوائی (کے)
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	دنیا کی زندگی میں	وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ	اور قیامت کے دن		
يُرْدُّونَ	وہ لوٹائے جائیں گے	إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ	سخت عذاب کی طرف		
وَمَا اللَّهُ	اور نہیں اللہ	بِغَافِلٍ	بے خبر	عَمَّا	اس سے
تَعْمَلُونَ (85)			جو تم عمل کرتے ہو۔		

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد سے بیشتر مشرکین مدینہ کے دو مشہور قبائل اوس اور خزرج مدینہ میں آباد تھے اور یہ آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور یہود مدینہ کے دو قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر ان عرب قبائل کے حلیف بن کر ان کو باہم لڑاتے رہنے کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ بنو قریظہ تو قبیلہ اوس کے حلیف تھے اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے۔ یہود کو تعداد میں کم تھے مگر یہ مالدار قوم تھی اور اوس و خزرج کو لڑا کر اپنا سیاسی تفوق بھی برقرار رکھتے تھے اور اسلحہ بھی بیچتے تھے۔ جس کے یہ تاجر تھے۔ ان یہود کی بالکل وہی مثال سمجھئے جو آج سے کچھ مدت پیشتر روس اور امریکہ کی تھی۔ اور آج کل امریکہ اور اسرائیل کی ہے یہ دونوں طاقتیں اسلام کی دشمن تھیں اور آپس میں بھی ان میں اختلاف تھا لیکن اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہو کر مسلمان ممالک کو آپس میں لڑاتی رہتی تھیں۔ بنو قریظہ اوس کے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے، اس طرح یہود کئی طرح کے فوائد اٹھاتے تھے۔ ان کا اسلحہ بھی

فروخت ہوتا تھا اور سیاسی تفوق بھی برقرار رہتا تھا۔ جب جنگ ہوتی تو یہ دونوں یہودی قبائل بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ برسرِ بیکار ہوتے اور اپنے ہی ہم مذہب دوسرے قبیلہ کو قتل بھی کرتے اور شہر سے نکال بھی دیتے؛ لیکن جب ان میں سے کوئی قید ہو کر آتا تو فدیہ ادا کر کے اس کو رہا کر لیتے اور کہتے کہ مذہب کی رو سے اپنے یہودی بھائی کو رہا کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہود سے چار عہد ان کا اس کے برعکس طرزِ عمل

قرآن مجید نے اس رویہ پر تنقید کی ہے کہ ان کو تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا: آپس میں خونی نہ کرنے کا، اپنے ہی بھائیوں کو گھر سے باہر نہ نکالنے کا، اور کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کرنے کا تو دو احکام کو تم نے نظر انداز کر دیا اور پس پشت ڈال دیا، صرف ایک حکم کو یاد رکھا: گویا اللہ کے جس حکم پر جی چاہا، عمل کر لیا اور جس کو چاہا، چھوڑ دیا، یہودیوں کا یہ طرزِ عمل کچھ ان ہی احکام کے ساتھ نہ تھا؛ بلکہ ان کا مزاج یہی بن چکا تھا کہ تورات کے جس حکم کو چاہتے لے لیتے اور جس کو چاہتے چھوڑ دیتے، پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانا بھی اس کی ایک مثال ہے؛ حالانکہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کے بارے میں واضح پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود سے چار عہد لیے تھے (1) وہ ایک دوسرے کا خون نہ کریں گے (2) ایک دوسرے کو جلاوطن نہ کریں گے (3) ظلم اور زیادتی پر مدد نہ کریں گے (4) اور فدیہ دے کر قیدیوں کو چھڑایا کریں گے۔ اب قبیلہ اوس و خزرج کی جنگ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر بھی آپس میں حلیف ہونے کی حیثیت سے لڑتے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے تھے۔ اب ایک جنگ میں مثلاً اوس اور بنو قریظہ کو فتح ہوئی تو لازماً بنو نضیر کے قیدی بھی ان کے ہاتھ آتے تھے اور بنو نضیر ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے تھے۔ جب ان سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو کہتے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا اللہ کا حکم ہے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ ان سے جو جنگ کرتے ہو تو وہ اللہ کے کس حکم کے تحت کرتے ہو؟ تو کہتے کیا کریں اپنے دوستوں (حلیفوں) کو ذلیل نہیں کر سکتے۔ گویا تین کام تو اللہ کے حکم کے خلاف کرتے تھے اور ایک کام اللہ کے حکم کے مطابق جس کا سبب بھی وہ خود ہی

ہنتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی ایسی حرکات پر گرفت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم اللہ کی کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے کا انکار کر دیتے ہو؟ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تعمیل کرے اور جو حکم اس کی طبیعت یا عادت یا مرضی کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دے تو بعض احکام کی تعمیل اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی اور ایسا انکار دراصل پوری کتاب اللہ کا انکار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حقیقتاً اپنے نفس کے پیروکار ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ کے نہیں ہوتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ شریعت کے تمام احکام پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور تمام ضروری احکام پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کوئی شخص کسی وقت بھی شریعت کی پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا اور خود کو طریقت کا نام لے کر یا کسی بھی طریقے سے شریعت سے آزاد کہنے والے کافر ہیں۔

دنیا میں ہی یہود کا عبرتناک انجام

دنیا میں یہ یہود عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بنو نضیر تو 4ھ میں اس ذلت سے دوچار ہوئے جس کا تفصیلی ذکر سورہ حشر میں کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے بعض باغات کو نذر آتش کر دیا۔ اور وہ قلعہ بند ہو کر اپنے گھروں کو خود بھی برباد اور توڑ پھوڑ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب جلاوطنی ان کا مقدر بن چکی ہے اور وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان ان کے تعمیر شدہ مکانات سے فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح لڑائی کے بغیر ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں فوری جلاوطنی کا حکم دیا گیا تو انہوں نے شام کا رخ کیا اور جزیرہ حاکم نازل ہونے کے بعد ان سے جزیرہ وصول کیا جاتا رہا اور بنو قریظہ پر جنگ خندق (احزاب 5ھ) کے فوراً بعد چڑھائی کی گئی اور ان کے مردوں کو یہ تیغ کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیا گیا، اور آخرت کو جو عذاب انہیں ہو گا وہ تو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ بنی اسرائیل کی دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ بنی قریظہ 3 ہجری میں مارے گئے اور بنی نضیر اس سے پہلے ہی جلاوطن کر دیئے گئے۔ دنیا میں یہودیوں کی جو رسوائی ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بدر کئے جاتے رہے ہیں، جن لوگوں نے تاریخ پڑھی ہے، وہ اس سے ناواقف نہیں ہیں، آج بھی مغربی ممالک

میں اکثر لوگ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں، یہ بھی رسوائی ہی کی ایک صورت ہے۔ دنیا و آخرت کی رسوائی سے مراد انسان کا اللہ کی نافرمانی اور بد اخلاقی کی وجہ سے دونوں جہانوں میں ذلیل اور نامراد ہونا ہے۔ اس میں دنیا کی بدنامی اور ناکامی کے ساتھ ساتھ آخرت کا عذاب شامل ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی طرفداری میں دین کی مخالفت کرنا خدای عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ذلت و رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے معاملات کو اس آیت کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی گناہوں کی شامت سے دنیاوی آفات بھی آجاتی ہیں۔

یہودیوں کے جزوی ایمان کا نقشہ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت

یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن پاک نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو آجکل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے کہ قرآن پاک کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے جو حکم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جوان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و طلاق کا ہو یا سیاسی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ عدل، احسان اور تقویٰ کو فراموش کر دیا ہے۔ محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا حشر بھی یہودیوں سے مختلف نہیں ہے۔ جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ تم اپنے معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل چاہتے ہو۔ کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ ہم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادات تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں مگر

تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لئے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یہودی اور مسلمان برابر ہیں نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دورخی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہوگا۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ: اور اللہ غافل نہیں، اس طرح کی آیات جن میں یہ مفہوم ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ان میں نافرمانوں کے لئے شدید وعید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے افعال سے بے خبر نہیں ہے، تمہاری نافرمانیوں پر شدید عذاب دے گا۔ یونہی ایسی آیات میں مؤمنین و صالحین کے لئے خوشخبری ہوتی ہے کہ انہیں اعمال حسنة کی بہترین جزاء ملے گی۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے: فرمایا "وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اس لیے وہ اسی کے مطابق جزا دے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (تفسیر کبیر، البقرة تحت الآية: ۱۸۵، ۱/۵۹۴، روح البیان، البقرة تحت الآية: ۱۸۵، ۱/۱۷۵-۱۷۶، ملقط)

بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کی دعا

اُولَئِكَ	یہی لوگ ہیں	الدِّیْنِ	جنہوں نے	اَشْتَرُوا	خریدی
اَلْحَيَاةَ الدُّنْيَا	زندگی دنیا کی	بِاِلٰ حِزْبٍ	آخرت کے بدلے		
فَلَا يُخَفَّفُ	پس نہ ہلکا کیا جائے گا	عَنْهُمْ	ان سے		
اَلْعَذَابِ	عذاب	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يُنْصَرُّوْنَ	مدد کیے جائیں گے (86)

یہ شریعت کے کسی حکم کے مان لینے اور کسی کو نظر انداز کر دینے کی سزا بیان کی جا رہی ہے۔ اس کی سزا دنیا میں عزت و سرفرازی کی جگہ (جو مکمل شریعت پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے) ذلت و رسوائی اور آخرت میں ابدی نعمتوں کے بجائے سخت عذاب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں وہ

اطاعت مقبول ہے جو مکمل ہو، بعض بعض باتوں کا مان لینا، یا ان پر عمل کر لینا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ آیت ہم مسلمانوں کو بھی دعوت غور و فکر دے رہی ہے کہ کہیں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کی وجہ بھی مسلمانوں کا وہی کردار تو نہیں جو مذکورہ آیات میں یہودیوں کا بیان کیا گیا ہے؟ یعنی اس آیت میں فرمایا گیا اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوْا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هُمْ فِيْهَا يَكْفُرُوْنَ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ جب وہ عذاب میں جسکڑے جائیں گے فَلَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ ”تو ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی“ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک راہوں پر چلائے اور یہود کی اختیار کردہ راہوں سے بچائے۔ بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کے لیے یہ پڑھے: اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِيْ الْاُمُوْر كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ۔ اے اللہ! ہمارے سارے کاموں کا انجام بہتر کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب ہمیں بچا اور ہماری حفاظت فرما۔

بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاء / یہود کا قول کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَلَقَدْ اَتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهِۦ بِالرُّسُلِ ۚ وَاتَيْنَا عِيْسٰى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۚ اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَنْفَعُوْا
اَنْفُسَكُمْ اَسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ ۚ وَفَرِيقًا تَقْتُلُوْنَ ۙ وَقَالُوْا اَقْلُوْبُنَا
غُلْفٌ ۙ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۙ

انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ قرآن کریم میں

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اَتَيْنَا	ہم نے دی	مُوسٰى الْكِتٰبَ	موسیٰ کو کتاب
وَقَفَّيْنَا	اور ہم نے پے درپے بھیجے	مِنْۢ بَعْدِهِۦ	اس کے بعد	بِالرُّسُلِ	(کئی) رسول

یعنی موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والے جن انبیاء و رسل کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ ہارون، ذوالکفل، الیاس، الیسع، داؤد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، حدیث میں یوشع بن نون علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر بھی آیا ہے۔ لقمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ بہت سے رسولوں کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا، قرآن پاک میں

حضرت زکریا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا تذکرہ موجود ہے۔ حدیث شریف میں تو ایسے سینکڑوں نبیوں کا ذکر آتا ہے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔

وَآتَيْنَا	اور ہم نے دیں	عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ	علی بن مریم کو	الْبَيِّنَاتِ	کھلی نشانیاں
------------	---------------	-----------------------	----------------	---------------	--------------

عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ عیسیٰ بن مریم کو عیسیٰ عسبرانی زبان کا لفظ ہے، عیسیٰ، یسوع یا یسوع کا معنی مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی والدہ کا نام مریم تھا۔ آپ کی نانی نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے بیٹا عطا کریگا تو وہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ ہم نے اسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت

حضرت مریم کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے۔ ”يُمَرِّئُهَا إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ“ یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔ اس آیت میں حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے فضائل کیلئے منتخب فرمایا مثلاً: عورت ہونے کے باوجود بیت المقدس کی خدمت کے لیے انہیں نذر میں قبول فرمایا حالانکہ صرف مردوں کو ہی منتخب کیا جاتا تھا۔ لہذا یہ بات ان کے سوا کسی عورت کو میسر نہ ہوئی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیلئے جتنی رزق بھیجا گیا، حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان کا قیل بنایا گیا، نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ فضیلتیں فرشتوں کی زبان سے سنائی گئیں۔ مزید حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے اور مردوں کے ان پر قدرت پانے سے پاکیزہ بنایا اور انہیں سارے جہان کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی کہ بغیر باپ کے بیٹا دیا اور ملائکہ کا کلام

سنوایا۔ عفت و پارسائی: آپ کی پوری زندگی پاک دامن تقویٰ اور عبادت میں گزری۔ آپ کو اللہ کی طرف سے ”صدیقہ“ (سچی) کا بلند ترین درجہ عطا ہوا۔ بے مثال معجزہ: بغیر کسی مرد کے چھوئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنا اور گوارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کی پارسائی کی گواہی دینا آپ کے عظیم معجزات میں شامل ہے۔ حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت بخشی۔ آپ وہ واحد خاتون ہیں جن کا نام قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور آپ کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ایک مکمل سورت (سورۃ مریم) نازل فرمائی گئی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورہ مائدہ میں آئے گا کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے۔ اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خود خدا تصور کرتے تھے، بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے۔ کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) خود خدا، خدا کے بیٹے یا تینوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات

فرمایا اَلْبَيْتُ کَھلی نشانیاں ’نشانیاں‘ سے وہ کھلے ہوئے معجزات مراد ہیں جو حضرت مسیح کو دیئے گئے تھے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ کوڑھی اور اندھے کو فقط ہاتھ لگا کر تندرست کر دیتے تھے۔ مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ اڑنے لگتا تھا اور آپ لوگوں کو یہ بھی بتا دیتے تھے کہ وہ کیا کچھ کھا کر آئے ہیں اور کیا کچھ گھر میں چھوڑ کر آئے ہیں اور ان تمام کاموں میں روح القدس یعنی جبریل (علیہ السلام) کی تائید آپ کے شامل حال رہتی تھی۔

وَ اٰیٰتُہٗ	اور ہم نے اس کی مدد کی	بِرُّوْحِ الْقُدُسِ ط	روح القدس کے ذریعے
-------------	------------------------	-----------------------	--------------------

(بِرُّوْحِ الْقُدُسِ) اس سے مراد جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ ایک اور آیت میں حضرت

جبریل (علیہ السلام) کو «الرُّوحُ الْأَمِينُ» فرمایا گیا ہے اور آنحضرت (ﷺ) نے حضرت حسان! کے متعلق فرمایا: «اللَّهُمَّ! أَيَّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ»۔ ”اے اللہ روح القدس سے اس کی تائید فرما“ ایک دوسری حدیث میں ہے «وَجِبْرِيلُ مَعَكَ»۔ ”جبریل (علیہ السلام) تمہارے ساتھ ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے (2)۔ تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 112، معالم التنزیل ج 1 ص 38) کہ روح القدس سے مراد اسم اعظم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے انسان کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور اسی اسم اعظم کی برکت سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر معجزے کا اظہار ہوتا تھا۔ جب آپ مردے کو زندہ کرتے تھے۔ یا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے تو یہ اسم اعظم کی برکت سے ہوتا تھا۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ روح القدس سے مراد حضرت جبریل (علیہ السلام) ہی ہیں، یوں تو حضرت جبریل علیہ السلام ہر نبی کے لئے تائید و تقویت کا باعث تھے؛ کیوں کہ آپ ہی وحی الہی لے کر آیا کرتے تھے؛ لیسکن اللہ کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ روح القدس کی تائید کا خصوصی معاملہ رہا، جب حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تو ”مسیح شیطانی“ (شیطان کے چھونے) سے حفاظت کی، جو ہر پیدا ہونے والے کو پیش آتا ہے اور آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ آپ علیہ السلام کو اس سے محفوظ رکھا گیا، حضرت مریم علیہا السلام کو دم کیا تو حمل ٹھہرا اور اس سے حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور جب یہودی آپ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے تو حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو اٹھا کر آسمان پر لے گئے، روح القدس سے تائید کا عیسائیوں کے اس عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں کہ خدا تین اکائیوں کے مجموعہ کے نام ہے، جن میں ایک روح القدس ہیں۔ (العیاذ باللہ)

احکام الہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینے والے

أَفْكَلْنَا	کیا پھر جب	جَاءَكُمْ	آیا تمہارے پاس	رَسُولٌ	کوئی رسول
يَمَّا	اس کے ساتھ جو	لَا تَهْوَى	نہیں چاہتے تھے		
أَنْفُسَكُمْ	تمہارے نفس	اسْتَكْبَرْتُمْ	تم نے تکبر کیا		

بِمَا لَا يَتَّقُوْنَ تہارے دل پسند نہیں کرتے۔ یہودی لوگ پیغمبروں کے احکام اپنی خواہشوں کے خلاف پا کر انہیں جھٹلاتے اور موقع پاتے تو ان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قتل کر ڈالتے تھے جیسا کہ انہوں نے حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے علاوہ بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کیا، حتیٰ کہ ہمارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بھی درپے رہے، بھی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا، بھی زہر دیا اور ان کے علاوہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کیلئے طرح طرح کے فریب کرتے رہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احکام الہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینا یہودیوں جبکہ حکم الہی کے سامنے اپنے نفس کو کچل دینا کامل الایمان لوگوں کی نشانی ہے۔

أَنفُسُكُمْ اسْتَکْبَرْتُمْ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ”تکبر“ تمام گناہوں، نافرمانیوں اور اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ گستاخوں اور زیادتیوں کی جڑ ہے؛ اس لئے اس برائی سے اپنی خوب حفاظت کرنی چاہئے۔

یہود کا پیغمبروں کے ساتھ عام طرز عمل

فَفَرِّقْنَا	ایک گروہ کو	كَذَّبْتُمْ	تم نے جھٹلایا
وَفَرِّقْنَا	اور ایک گروہ کو	تَقْتُلُونَ ۝۵	تم قتل کرتے ہو۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تذکرے کے بعد بنی اسرائیل کے اپنے پیغمبروں کے ساتھ عام طرز عمل کا ذکر کیا کہ اے بنی اسرائیل! ”أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمْ“ جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آئے جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے ”اسْتَکْبَرْتُمْ“ تو تم نے تکبر کیا۔ تکبر کی بیماری اسرائیلیوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ احکام کی نافرمانی تکبر اور سرکشی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ فرمایا اے بنی اسرائیل! تم نے اسی تکبر کی وجہ سے ”فَفَرِّقْنَا كَذَّبْتُمْ“ (انبیاء علیہم السلام) کے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا۔

انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کرنے والا گروہ

وَفَرِيقًا تَقْتُلُوْنَ” اور ایک گروہ کو قتل کیا۔ جیسے ان لوگوں نے سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی جھٹلایا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اور سیدنا زکریا اور سیدنا یحییٰ (علیہما السلام) کو قتل کر دیا۔ سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کو مروا ڈالنے کے درپے ہو چکے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے انہیں اوپر اپنے ہاں اٹھالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگ نفسانی خواہشات کی اتباع اور خدائی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔ یہ دراصل بنی اسرائیل (یہودیوں) کی ہٹ دھرمی، سرکشی اور نافرمانی کی طرف اشارہ ہے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سچائی ان کی اصلاح کے لیے آتا اور ایسے احکامات سناتا جو ان کی ذاتی خواہشات یا خود ساختہ نظریات کے خلاف ہوتے، تو وہ حق کو تسلیم کرنے کے بجائے التماکبر کرتے۔ بات صرف یہیں تک نہیں رہتی تھی، بلکہ ان انبیاء علیہم السلام کو جھوٹا قرار دیتے اور بعض کو شہید (قتل) بھی کر دیتے تھے۔

دین سے دوری کا بہانہ، قرآنی جواب اور حقیقت

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	قُلُوبُنَا	ہمارے دل	عُغْلِفْ ط	غلاؤں میں ہیں
بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ	بلکہ لعنت کر دی ہے اُن پر اللہ نے	بِكُفْرِهِمْ	بوجہ ان کے کفر کے		
فَقَلِيلًا	پس تھوڑے ہیں	مَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥﴾	جو ایمان لاتے ہیں۔		

عُغْلِفْ یہ ”أُغْلِفْ“ کی جمع ہے، جیسے ”أَحْمَرُ“ کی جمع ”حُمْرٌ“ ہے، یعنی جو چیز غلاف (پردے) میں ہو، جیسے: ”رَجُلٌ أَعْلَفٌ“ ”وہ آدمی جس کا ختنہ نہ ہوا ہو“ اور ”سَيْفٌ أَعْلَفٌ“ وہ تلوار جو غلاف میں ہو۔ یہود کہا کرتے تھے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، ان پر تمہاری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا، فرمایا: (وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا اِلَيْهِ) [حم السجدة: 5] ”اور انہوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔“ بعض

علمائے تفسیر نے ”غُلْف“ کے یہ معنی کیے ہیں کہ ہمارے دل علم و حکمت سے پر ہیں، کسی دوسرے علم کی ان میں گنجائش نہیں ہے۔ اس پر قرآن نے فرمایا کہ حق سے متاثر نہ ہونا فخر کی بات نہیں ہے، یہ تو اللہ کی لعنت کی نشانی ہے۔ (ابن کثیر) انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی بری صفات کو بھی خوبصورت بنا کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور حقیقت کا اعتراف کر لینا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ الاما شاء اللہ یہی حالت یہودیوں کی تھی۔ یہودیوں کو غلط زعم یہ تھا کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعویٰ تھا

وَقَالُوا اقْلُوبُنَا غُلْفًا ”کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔ یہ ان کی خود ساختہ تھی کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی بات ہمارے دلوں میں اترتی نہیں ہے کیونکہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں (ہمیں سمجھ نہیں آتی)؛ بعض مفسرین کے مطابق اس سے ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے دل پہلے ہی الہامی علوم اور شریعت کے غلافوں سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں آپ کی نئی تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں، مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاسکتا ان کا یہ نظریہ واقعی بلند پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کر سکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی وہ تو خود اپنا دین بگاڑ چکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات لے کر انبیاء (علیہم السلام) آتے۔ وہ انہیں جھٹلا دیتے یا قتل کر دیتے۔ وہ دین اسلام کو برحق سمجھ لینے کے باوجود اسے قبول تو اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اس طرح ان کا مذہبی تفوق و اقتدار خطرہ میں پڑ جاتا تھا بلکہ چھن جاتا تھا مگر بظاہر اسے یوں پیش کرتے تھے کہ ہمارے عقائد اتنے مضبوط ہیں کہ وہ کوئی نیا عقیدہ قبول نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دجل و فریب کی قلعی کھولتے ہوئے فرمایا: بات یوں نہیں بلکہ یہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ملعون بن چکے ہیں اور یہ اس لعنت کا اثر ہے کہ ان

کے دل حق بات کو قبول نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ ﴿۱﴾ یعنی ان کے دلوں پر پردے نہیں ہیں بلکہ ان کے کفر اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ چونکہ ان کے اعمال درست نہ تھے، اس لیے ان کی حق قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی ”ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ ان کے قلب معکوس ہو چکے ہیں۔ اور فہم الٹ گئے ہیں۔ یہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے“ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ”ان کی بہت قلیل تعداد ایمان لائی ہے۔ سورہ مائدہ میں اسی چیز کو فرمایا“ وَأَن أَكْثَرُكُمْ فَسِقُونَ ”یعنی تم میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔ اگرچہ سارے کے سارے نافرمان نہیں تھے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید کی سورہ آل عمران (آیت 113) کی یہ خوبصورت اور معنی خیز قرآنی عبارت لَيْسُوا سَوَاءً ہے اس کا مطلب ہے: ”یہ سب برابر نہیں ہیں یعنی“ لَيْسُوا سَوَاءً ”مگر اکثریت ملعون ہی تھی۔ ایمان کی دولت چند لوگوں کے پاس ہی ہوتی تھی۔ جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے عقیدت مندوں کی جماعت، یعنی کہ تمام اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ایک جیسے نہیں تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ حق پر قائم تھے، جو رات کی تنہائیوں میں اللہ کی آیات پڑھتے تھے اور سجدے کرتے تھے۔ اور بعض علماء فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب تورات میں سے بھی بہت تھوڑی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اکثر احکام کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہود اور نزول قرآن / نظریہ توسل کی حقیقت

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
 وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۖ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ
 يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۖ فَلَعْنَةُ
 اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ⑧ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَرْوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا
 أَنْ يَنْزِلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ فَبَاءُؤُا بِغَضَبٍ عَلَى
 غَضَبٍ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ⑩ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ قَالُوا
 نُوْمِنُ بِمَا أَنزَلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۖ
 قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ⑨ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ
 مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ⑨

مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے

وَلَمَّا	اور جب	جَاءَهُمْ	ان کے پاس آئی	كِتَابٌ	کتاب
مِّنْ عِندِ اللّٰهِ	اللہ کے پاس سے	مُصَدِّقٌ	تصدیق کرنے والی	لِّمَا	اس کی جو
مَعَهُمْ	ان کے پاس ہے	وَكَانُوا	اور وہ تھے	مِّنْ قَبْلُ	اس سے پہلے
يَسْتَفْتِحُونَ	فتح مانگتے	عَلَى الَّذِينَ	ان پر جنہوں نے		

كَفَرُوا	كفر کیا	فَلَمَّا	تو جب جَاءَهُمْ اُکھیا انکے پاس
مَّا عَرَفُوا	جو وہ پہچانتے تھے	كَفَرُوا	انہوں نے انکار کر دیا
فَلَعَنَهُ اللَّهُ	پس اللہ کی لعنت ہے	عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۹۰	کافروں پر۔

اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے ساتھ لوگوں نے کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ”وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ“ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ ”مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ“ جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتب میں زبور، توراۃ، انجیل اور دیگر صحائف سماویہ ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا ”كَفَرُوا بِه“ تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے۔ یَسْتَفْتِحُونَ فتح و نصرت طلب کرتے تھے۔ یعنی نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے جب یہودی عرب کے مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزمان جلد ظاہر ہوں، تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔ (طبری) ”یَسْتَفْتِحُونَ“ کا دوسرا معنی ہے: ”يَفْتَحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا“ (فَتَحَ عَلَيْهِ) کا معنی ہے خبر دینا اور سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی کافروں کو خوب کھول کر بتاتے تھے۔ (زمخشری)

نظریہ توسل کی حقیقت

نظریہ توسل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے ہمیں اس سے محبت ہے لہذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے ہاں شرک اس وقت ہو گا۔ جب اس کے توسل کی بجائے خود اسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح محتار مطلق سمجھے کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرانے کا اختیار حاصل ہے مطلب

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگتے وقت اس کے نیک اور برگزیدہ بندوں کا واسطہ دینا تو سب کہلاتا ہے اور یہ تب جائز ہے جب اللہ سے ہی مانگا جائے۔ باقی کسی کے مزار پر جا کر اس سے مانگنا یا اس کے مزار کے گرد چکر لگانا اور سجدہ کرنا سراسر حرام اور شرک کے زمرے میں آتا ہے اس کا تو سب سے کوئی تعلق نہیں ہے، مزید تفصیل درکار ہو تو اس کے لئے ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے اختلاف امت اور صراطِ مستقیم کے نام سے کتاب لکھی ہے، اس میں دیگر اختلافی مسائل کے ساتھ ساتھ تو سب کے مسئلے کو بھی مناسب و مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔۔۔ بہر حال جب تک پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت نہیں ہوئی تھی، یہودیوں کو مشرکین سے کوئی اذیت پہنچتی تو کہتے تھے کہ عنقریب آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے، ان کی تشریف آوری کے بعد ہم ان کی پیروی کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا، انصارِ مدینہ چوں کہ بار بار یہودیوں سے یہ سن چکے تھے؛ اسی لئے انھوں نے بلا تا مل آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہو گئے؛ (سیرت ابن ہشام: ۲/۱۸۳) لیکن جب آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہوئی تو یہود مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے؛ بلکہ مخالفت میں بھی پیش پیش رہے، اسی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ

بُنُسَمَا اُشْتَرَوْا	براہے جو انہوں نے بیچ ڈالا	یہ	اسکے بدلے
اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ کو	اَنْ يَّكْفُرُوا	یہ کہ انہوں نے انکار کیا
بِمَا	اس سے جو	اَنْزَلَ اللّٰهُ	نازل کیا اللہ نے
بَغْيًا	خدا میں آکر	اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ	کہ نازل کرتا ہے اللہ
مِنْ فَضْلِهِ	اپنے فضل سے	عَلٰی مَنْ يَّشَاءُ	جس پر وہ چاہتا ہے
مِنْ عِبَادِهِ	اپنے بندوں میں سے	فَبَا۟ءُوْ	پس وہ لوٹے
يَغْضَبُ	غضب کے ساتھ	عَلٰی غَضَبٍ	غضب پر

وَلِلْكَافِرِينَ	کافروں کے لئے	عَذَابٌ	عذاب ہے
مُهِينٌ ۙ	رُسا کرنے والا۔ (90)		

یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ سنی و خاندانی تعصب تھا، یہ حضرت اسحاق بن ابراہیم کی نسل سے تھے اور حضرت اسحاق سے حضرت مسیح تک جتنے پیغمبر آئے سب اسی خاندان سے تھے، جب کہ عرب حضرت اسماعیل کی اولاد تھے، اس طرح نبوت کے سلسلۃ الذہب کا اختتام ایک ایسے نبی پر ہوا جو حضرت اسماعیل کی نسل سے تھا، اسی خاندانی تعصب اور تنگ نظری کے باعث یہود ایمان سے محروم رہے، قرآن اسی کی تردید کر رہا ہے کہ نبوت ایک فضل خداوندی ہے اور یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے اس فضل سے نواز دے۔ یہود کے جرائم کی فہرست تو بہت طویل ہے جن میں سرفہرست ایک نبی کی موجودگی میں پچھڑے کی پرستش، انبیاء کا قتل اور دیدہ دانستہ نبی آخر الزمان ﷺ کی رسالت کا انکار ہے اور ایسے جرائم کی سزا تو جتنی بھی ہو وہ کم ہے۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر عذاب ذلت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہو گا وہ انہیں گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہو گا۔ ذلیل و رسوا کرنے کے لیے نہ ہو گا۔ البتہ کافروں کو جو عذاب دیا جائے گا وہ بغرض تذلیل ہو گا۔

حد کی تعریف اور اس کی مذمت

اس آیت سے معلوم ہوا کہ منصب و مرتبہ کی طلب انسان کے دل میں حد پیدا ہونے کا ایک سبب ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حد ایسا غیث مرض ہے جو انسان کو کفر تک بھی لے جاسکتا ہے۔ حد کی تعریف یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو ملنے والی نعمت چھین جانے کی آرزو کی جائے، اور ایسی آرزو کی برائی محتاج بیان نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”آدمی کے دل میں ایمان اور حد جمع نہیں ہوتے۔“ (سنن نسائی، کتاب الجہاد، فضل من عمل فی سبیل اللہ۔۔۔ الخ ص ۵۰۵، الحدیث: ۳۶۱۰) حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ

فَالِهَ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”حسد ایمان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسے صَدِیر (یعنی ایک درخت کا انتہائی کڑوا نچوڑ) شہد کو تباہ کر دیتا ہے۔ (جامع صغیر، حرف الحاء، ص ۲۳۲، الحدیث: ۳۸۱۹) صَدِیر کا معنی ہے کڑوا، سخت، تلخ چیز، اور وسیع تر معنی میں روک دینا، ضبط کرنا، تکلیف میں قابو پانا۔ حدیث میں ”صَدِیر“ سے مراد وہ کڑوا مادہ ہے جو شہد کو خراب کر دیتا ہے، یعنی حد بھی ایمان کو اسی طرح برباد کرتا ہے جیسے صبر شہد کو۔ یاد رہے کہ حسد حرام ہے اور اس باطنی مریض کے بارے میں علم حاصل کرنا فرض ہے۔ اس سے متعلق مزید تفصیل جاننے کے لئے امام غزالی رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی مشہور کتاب ”احیاء العلوم“ کی تیسری جلد میں موجود حسد سے متعلق بیان مطالعہ فرمائیں۔ [فَبَآءُ وَیَغْضَبُ عَلٰی غَضَبٍ تَوِیْلُ لُغٍ غَضَبٍ پَر غَضَبٍ کے مستحق ہو گئے۔] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: یہودی تورات کو ضائع کرنے اور اس کے احکامات کو تبدیل کرنے کی وجہ سے پہلے غضب کے مستحق ہوئے اور حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ فَاوَلَمَ وَسَلَّم کے ساتھ کفر کرنے کی وجہ سے دوسرے غضب کے حقدار ٹھہرے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور انجیل کا انکار کرنے کی وجہ سے یہودی پہلے غضب کے مستحق ہوئے اور نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ فَاوَلَمَ وَسَلَّم اور قرآن مجید کا انکار کر کے دوسرے غضب کے مستحق ہو گئے۔ (خازن، البقرة تحت الآیة: ۱۰۹۰/۶۹)

ایمان لانے میں بڑی رکاوٹ نسلی و خاندانی تعصب

وَإِذَا	اور جب	قِيلَ لَهُمْ	کہا جاتا ہے انہیں	أَمِنُوا	تم ایمان لاؤ
يَمَّا	اس پر جو	أَنْزَلَ اللَّهُ	نازل کیا اللہ نے	قَالُوا	وہ کہتے ہیں
نُؤْمِنُ	ہم ایمان لاتے ہیں	يَمَّا	اس پر	أُنْزِلَ	جو نازل کیا گیا
عَلَيْنَا	ہم پر	وَيَكْفُرُونَ	اور انکار کرتے ہیں	يَمَّا	اس سے جو
وَرَاءَهُ	اس کے علاوہ	وَهُوَ الْحَقُّ	حالانکہ وہی حق ہے		
مُصَدِّقًا	تصدیق کرنے والا	لِّمَا	اسکی جو	مَعَهُمْ	ان کے پاس ہے

قُلْ	کہہ دو	فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ	تو کیوں قتل کرتے رہے
اَنْبِيََاءَ اللّٰهِ	اللہ کے نبیوں کو	مِنْ قَبْلُ	اس سے پہلے
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	مُؤْمِنِيْنَ ⑨۱	مومن۔ (91)

یہود کہتے تھے کہ ہم نبوت و وحی کے منکر نہیں ہیں؛ لیکن ہم صرف ان ہی انبیاء پر ایمان لائیں گے، جو ہماری قوم یعنی بنی اسرائیل میں آئیں، یہاں اُن کی منکر کی کوتاہی کو واضح کیا گیا ہے کہ اول تو ایمان لانے میں نسلی و خاندانی تعصب نہ ہونا چاہئے، حق اور سچائی جہاں بھی ہو، اس کو قبول کرنا چاہئے، اور قرآن کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ تورات کی تصدیق و تائید کرتی ہے نہ کہ تکذیب و تردید، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں ایک ہی سرچشمہ سے تعلق رکھتی ہیں، دوسرے: اگر تم اور تمہارے آباء و اجداد انبیاء بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے تھے تو پھر تم لوگ انہیں انبیاء و رسل میں بعض کے قتل تک کے مرتکب ہوئے، کیا انبیاء پر ایمان رکھنے والا ان کے قتل کا مرتکب ہو سکتا ہے؟

گستاخوں کو اچھا سمجھنے والا خود بھی گستاخ ہی ہے

(1)..... اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمانی کتابوں پر اور حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے فرمانوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے ایک کا بھی انکار کفر ہے، یونہی تمام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوٰۃُ وَ السَّلَام پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے ایک کا بھی انکار کفر ہے۔

(2)..... انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوٰۃُ وَ السَّلَام کی تعظیم ایمان کا رکن اعلیٰ ہے اور ان کی توہین کرنا کفر ہے۔

(3)..... اللہ تعالیٰ کے نبی عَلَیْہِ الصَّلٰوٰۃُ وَ السَّلَام کو شہید کرنا کفر ہے۔

(4)..... کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے کیونکہ حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے زمانے کے بنی اسرائیل نے انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوٰۃُ وَ السَّلَام کو شہید نہ کیا تھا مگر چونکہ وہ قاتلوں کی اس حرکت سے راضی تھے اور ان کو اپنا بڑا مانتے تھے اور انہیں عظمت سے یاد کرتے تھے اس لئے

انہیں بھی قاتلوں میں شامل کیا گیا۔ آج کل بھی اگر کوئی بذاتِ خود گستاخی نہ بھی کرے لیکن گستاخوں کو اچھا سمجھے، انہیں اپنا بڑا مانے تو وہ انہیں میں شامل ہے اور وہ بھی گستاخی ہی ہے۔ حضرت عرس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”جب زمین میں گناہ کیا جائے تو جو وہاں موجود ہے مگر اسے برا جانتا ہے، وہ اس کی مثل ہے جو وہاں نہیں ہے اور جو وہاں نہیں ہے مگر اس پر راضی ہے، وہ اس کی مثل ہے جو وہاں حاضر ہے۔“ (ابوداؤد)

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	جَاءَكُمْ	آئے تمہارے پاس	مُوسَى	موسیٰ
بِالْبَيِّنَاتِ	کھلی نشانوں کے ساتھ	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ	پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (معبود)		
مِنْ بَعْدِهِ	اس کے بعد	وَأَنْتُمْ	اور تم	ظَلِمُونَ ﴿٩٢﴾	ظالم ہو۔ 92

یہ واضح معجزات صرف عصائے موسیٰ اور ید بیضا ہی نہ تھے۔ بلکہ بیشمار دوسرے معجزات بھی تھے جیسے سمندر کا پھٹ جانا، اور فرعون کی غرقابی۔ چٹان سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا، جنگل میں من و سلوی کا نزول وغیرہ وغیرہ۔ اتنے واضح معجزات دیکھنے کے بعد بھی تم اللہ کی الوہیت پر ایمان نہ لائے اور موسیٰ کی غیر حاضری میں تمہیں تھوڑا سا موقع ملا تو فوراً پھر سے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسرائیل کے پاس روشن معجزات لے کر تشریف لائے اور جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد بنی اسرائیل نے سامری کے بہکانے سے گائے کو معبود بنالیا اور گائے کی پوجا کر کے انہوں نے کفر کیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روشن نشانیاں دیکھ کر بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا میں مبتلا ہو گئے تو ان یہودیوں کا سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کرنا ان کے لئے کوئی بڑی بات ہے؟ (جلالین)۔

ایمانی قوت معلوم کرنے کا طریقہ / موت کی آرزو / یہود کی جینے کی ہوس

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ط خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ
وَأَسْمِعُوا ط قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۖ وَأَشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ط
قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۖ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ
الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ
صَادِقِينَ ۖ ۞ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمْت أَيْدِيَهُمْ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۙ ۞
وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ ۖ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ
لَوْ يُعَمَّرَ أَلْفَ سَنَةٍ ۖ وَمَا هُوَ بِمُرَزَّحٍ مِنْهُ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ط وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا
يَعْمَلُونَ ۙ ۞

کفر و انکار کی انتہا

وَإِذْ	اور جب	أَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيثَاقَكُمْ	تم سے پختہ عہد
وَرَفَعْنَا	اور ہم نے بلند کیا	فَوْقَكُمُ الطُّورَ	تمہارے اوپر کوہ طور (پہاڑ)		

خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ	پکڑو جو ہم نے تمہیں دیا ہے	يَقُوَّةٍ	مضبوطی سے
وَأَسْمَعُوا	اور سنو	قَالُوا سَمِعْنَا	وہ بولے ہم نے سن لیا
وَعَصَيْنَا	اور ہم نے نافرمانی کی	وَأُشْرِبُوا	اور پلا دیئے گئے
فِي قُلُوبِهِمْ	اپنے دلوں میں	الْعَجَلِ	بجھڑے (کی محبت)
بِكُفْرِهِمْ	ان کے کفر کے سبب		

یہ کفر و انکار کی انتہا ہے کہ زبان سے تو اقرار کہ سن لیا، یعنی اطاعت کریں گے اور دل میں یہ نیت کہ ہم نے کون سا عمل کرنا ہے؟ ایک تو محبت خود ایسی چیز ہوتی ہے، کہ انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ دوسرے، اس کو اُشْرِبُوا (پلا دی گئی) سے تعبیر کیا گیا، کیوں کہ پانی انسان کے رگ و ریشہ میں خوب دوڑتا ہے جب کہ کھانے کا گزر اس طرح نہیں ہوتا۔ (فتح القدیر) یعنی عصبیان اور بجھڑے کی محبت و عبادت کی وجہ وہ کفر تھا جو ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

قُلْ	کہہ دیں	بِئْسَمَا	کیا ہی برا ہے جو	يَأْمُرُكُمْ	تمہیں حکم دیتا ہے
يَّةَ	اس کا	إِيْمَانُكُمْ	ایمان تمہارا	إِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم
مُؤْمِنِينَ ②	ایمان لانے والے۔				

گو سالہ پرستی کے جراثیم

یعنی جب تم سے تمہارے سروں پر طور پہاڑ کو جھکا کر تورات کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا عہد لیا جا رہا تھا۔ جس کا پہلا اور بنیادی حکم یہی تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو گے اور نہ کسی کو اللہ کا شریک بناؤ گے تو تمہارے اسلاف نے کہا تھا کہ ہم نے یہ احکام سن لیے ہیں، اس وقت بھی تمہارے دل میں چور موجود تھا۔ کیونکہ گو سالہ پرستی کے جراثیم تمہارے دلوں میں موجود تھے۔ اور تم نے تورات کے احکام کو دل سے قطعاً تسلیم نہیں کیا تھا۔ یعنی ایمان کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ انسان مشرکانہ اعمال و عقائد کو یکسر چھوڑ کر نیکی اور بھلائی کے کاموں کی طرف سبقت کرے۔ مگر

تمہارا یہ ایمان کس قسم کا ایمان ہے جو مشرکانہ افعال، بدعہدیوں اور نافرمانیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ تمہارے اسلاف بھی یہی کچھ کرتے رہے اور تم بھی انہی کی ڈگر پر چل رہے ہو۔ (اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ) یہ ان کے اس دعویٰ پر مزید چوٹ ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی حقیقت میں تم تو رات پر بھی ایمان نہیں رکھتے، ورنہ تو رات پر ایمان تمہیں ”سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا“ کہنے کا اور پچھڑے کی عبادت جیسے صریح شرک کا حکم کیسے دے سکتا ہے اور اگر دیتا ہے تو تمہارا ایمان تمہیں بہت بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔

قرآن مجید پر ایمان لانے کا مطلب

قرآن مجید پر ایمان لانے کا مطلب اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام احکام اور سب تقاضوں پر عمل کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اس چیز کو سامنے رکھتے ہوئے ہر مسلمان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ اپنی زبان سے قرآن مجید پر ایمان لانے کا جو دعویٰ کر رہا ہے، کیا اس کی عملی حالت اس دعوے کی تصدیق کر رہی ہے یا نہیں۔ ذرا غور کریں کہ قرآن مجید میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے، رمضان کے روزے رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آج مسلمانوں کی اکثریت نمازوں سے دور ہے، فرض روزے نہ رکھنے کے مختلف حیلے بہانے تراش رہی ہے اور اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا ان پر بہت بھاری ہے۔ قرآن پاک میں مسلمانوں کو باطل اور ناجائز طریقے سے کسی مسلمان کا مال کھانے سے منع کیا گیا لیکن آج مال بٹورنے کا کونسا ایسا ناجائز طریقہ ہے جو مسلمانوں میں کسی نہ کسی طرح رائج نہیں۔ قرآن حکیم نے کسی کو ناحق قتل کرنے سے منع کیا لیکن آج مسلمانوں میں ناحق قتل و غارت گری ایسی عام ہے کہ نہ مرنے والے کو پتا ہے کہ مجھے کیوں مارا گیا اور نہ مارنے والے کو پتا ہے کہ میں نے کیوں مارا۔ قرآن شریف میں مسلمان عورتوں کو گھروں میں رہنے اور پردہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آج ہمارے معاشرے کا وہ کونسا طبقہ ہے جس میں مسلمان عورت سب سنور کر اجنبی مردوں کے سامنے نہیں آ رہی بلکہ آج مسلمانوں میں ہی کچھ لوگ عورت کے پردہ کرنے کو دقیقہ سی سوچ اور تنگ ذہنی قرار دے

رہے ہیں۔ اے کاش کہ ہم بھی اپنے زبانی ایمان و محبت کے دعووں اور بے عملی و بد عملی کے درمیان کا تضاد اور فرق سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں اور ہمیں بھی اس بات پر غور کرنا نصیب ہو جائے کہ ہمارے جیسے اعمال ہیں کیا ہمارا ایمان ہمیں ان اعمال کا حکم دیتا ہے یا ہمارے ایمان کے تقاضے کچھ اور ہیں؟

برائی کی لذت و حلاوت / ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک دل میں برائی کی لذت و حلاوت موجود رہتی ہے تب تک ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی اس میں داخل نہیں ہو سکتی اور گناہوں پر اصرار ایمان کی مٹھاس اور عبادت کی لذت محسوس نہیں ہونے دیتا۔ یاد رہے کہ نیکوں اور نیکوں سے محبت ایمان کی علامت ہے جبکہ بروں اور برائیوں سے محبت ایمان کی کمزوری کی علامت ہے، لہذا ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی ایمانی قوت کو اپنے قلبی میلان سے معلوم کرے کیونکہ جن دلوں میں فلموں، ڈراموں، بے حیائیوں اور گانوں کی محبت ہو ان دلوں میں نماز، ذکر، درود اور تلاوت کی محبت نہیں سما سکتی۔

موت کی محبت اور اللہ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ

قُلْ	آپ کہہ دیجئے	إِنْ كَانَتْ	اگر ہے	لَكُمْ	تمہارے لئے
الدَّارِ الْآخِرَةِ	آخرت کا گھر	عِنْدَ اللَّهِ	اللہ کے پاس	خَالِصَةً	خاص طور پر
مِّنْ دُونِ النَّاسِ	لوگوں کے سوا	فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ	تو تم تمنا کرو موت کی		
إِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	صَادِقِينَ ﴿٩٤﴾	سچے۔ (94)		

یہ یہودی دنیا سے محبت پر ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں تعریف ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کو آخرت سے لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر اس قدر ریجھے ہوئے نہیں ہوتے اور نہ ہی موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے بالکل برعکس تھا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دلیل سے یہود کے اس غلط دعویٰ کا رد فرمایا جو وہ کہتے تھے کہ آخرت کا گھر ہمارے ہی لیے مخصوص ہے۔ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ

موت کی تمنا کرو۔

اس کے برعکس موت کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ہر نماز کے بعد) دعا فرماتے: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِيْ فِيْ بَلَدٍ رَّسُوْلِكَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم، 'یارب مجھے اپنی راہ میں شہادت اور اپنے رسول کے شہر میں مجھے وفات نصیب فرما۔' (بخاری، کتاب فضائل المدینۃ، ۱۳-باب، ۱ / ۶۲۲، الحدیث: ۱۸۹۰) عمومی طور پر تمام اکابر صحابہ اور بالخصوص شہدائے بدر و احد و اصحاب بیعت رضوان رضی اللہ تعالیٰ عنہم راہ خدا میں موت سے محبت رکھتے تھے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایران والوں کو جو خط بھیجا اس میں تحریر فرمایا تھا: "یعنی میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جانے کو اتنا محبوب رکھتی ہے جتنا ایرانی لوگ شراب سے محبت رکھتے ہیں۔" (معجم الکبیر، باب من اسمہ خالد، ۴ / ۱۰۵، الحدیث: ۳۸۰۶) اس میں لطیف اشارہ تھا کہ شراب کی ناقص مستی کو محبت دنیا کے دیوانے پسند کرتے ہیں اور اللہ والے موت کو محبوب حقیقی کے وصال کا ذریعہ سمجھ کر محبوب جانتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اہل ایمان آخرت کی رغبت رکھتے ہیں اور اگر لمبی عمر کی تمنا بھی کریں تو وہ اس لیے ہوتی ہے کہ نیکیاں کرنے کے لیے کچھ اور عرصہ مل جائے جس سے آخرت کے لیے ذخیرہ سعادت زیادہ کر سکیں اور اگر گزشتہ زندگی میں گناہ ہوئے ہیں تو ان سے توبہ و استغفار کر لیں البتہ دنیوی مصائب سے تنگ آکر وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کرتے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کوئی دنیوی مصیبت سے پریشان ہو کر موت کی تمنا نہ کرے اور اگر موت کی تمنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو یوں دعا کرے کہ اے اللہ! عَزَّ وَجَلَّ، جب تک زندہ رہنا میرے لئے بہتر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے وفات بہتر ہو اس وقت مجھے وفات دیدے۔" (بخاری، کتاب المرضی، باب تمنی الموت، ۴ / ۱۳، الحدیث: ۵۶۷۱) اور درحقیقت دنیوی پریشانیوں سے تنگ آکر موت کی دعا کرنا صبر و رضا و تسلیم و توکل کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔

دعوتِ مباہلہ / اور اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب

وَلَنْ	اور ہرگز نہیں	يَتَمَنَّوْاْ	تمنا کریں گے اس کی	اَبَدًا	کبھی بھی
يَمُتَا	(اس) وجہ سے جو	قَدَّ مَتَّ	آگے بھیجا	اَيَّدِيْہِمْ	ان کے ہاتھوں نے
وَاللّٰہُ	اور اللہ	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے	بِالظُّلُمٰتِیْنَ ۝۹۵	ظالموں کو۔ (95)

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے اس کی تفسیر دعوتِ مباہلہ سے کی ہے، (مباہلہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا بنیادی معنی "ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا" یا "بارگاہِ الہی میں گڑگڑا کر بددعا کرنا" ہے، اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب یہ ہے کہ جب دو فریقین کے درمیان کسی مسئلہ ہی، عقیدتی یا تاریخی مسئلے پر شدید اختلاف ہو اور دلائل و بحث سے فیصلہ نہ ہو رہا ہو، تو دونوں فریق اپنے اہل و عیال اور پیاروں کو ساتھ لے کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوں اور یہ دعا مانگیں کہ، یا اللہ! ہم میں سے جو فریق حق پر ہے اسے فتح و کامرانی عطا فرما اور جو جھوٹا ہے، اس پر تیری لعنت ہو اور وہ تیری رحمت سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔)

یعنی یہودیوں کو کہا گیا کہ اگر تم نبوتِ محمدیہ کے انکار اور اللہ سے مجبوبیت کے دعوے میں سچے ہو تو مباہلہ کرلو، یعنی اللہ کی بارگاہ میں مسلمان اور یہودی دونوں مل کر یہ عرض کریں کہ یا اللہ دونوں میں سے جو جھوٹا ہے، اسے موت سے ہمکنار کر دے، یہی دعوت انہیں سورتِ جمعہ میں بھی دی گئی ہے۔ نجسِ ران کے عیسائیوں کو دعوتِ مباہلہ دی گئی تھی، جیسا کہ آلِ عمران میں ہے۔ لیکن چونکہ یہودی بھی، عیسائیوں کی طرح، جھوٹے تھے، اس لئے عیسائیوں ہی کی طرح یہودیوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہرگز موت کی آرزو (یعنی مباہلہ) نہیں کریں گے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی یہود کہتے تھے کہ جنت ان ہی کے لئے مخصوص ہے، اسی پر ان کو چیلنج کیا گیا کہ پھر تو موت کی تمنا کر کے دیکھ لو، قرآن مجید کے اس چیلنج کے جواب میں یہود کو کم سے کم ظاہری طور پر بھی موت کی آرزو کرنے کی ہمت نہ ہوئی: اس لئے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن مجید کی صداقت کا یقین رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اگر ایسا کیا گیا تو فوراً اللہ

کی طرف سے پکڑا ہو سکتی ہے۔

قرآنی پس منظر

(مابلہ کا حکم قرآن مجید کی سورہ آل عمران (آیت 61) میں نازل ہوا۔ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ بحث کے دوران نازل ہوئی تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ آپ اپنے اہل خانہ (حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم) کو ساتھ لائیں اور عیسائی بھی اپنے پادریوں اور عورتوں کو بلا لیں تاکہ خدا کی بارگاہ میں جھوٹے پر عذاب کی دعا کی جائے۔ یہ تاریخی واقعہ 24 ذوالحجہ کو پیش آیا۔)

یہود کو دنیا کی زندگی کی ہوس

وَلَتَجِدَنَّهُمْ	اور البتہ آپ ضرور پائیں گے انہیں	آخَرُ صَ النَّاسِ	زیادہ حریص لوگوں میں سے
عَلَى حَيَوةٍ	زندگی پر	وَمِنَ الَّذِينَ	اور (ان) میں سے جنہوں نے
أَشْرَكُوا	شرک کیا	يَوَدُّ أَحَدُهُمْ	چاہتا ہے ان کا ہر ایک
لَوْ	کاش	أَوْ	اور نہیں وہ
يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ	وہ عمر پائے ہزار سال	وَمَا هُوَ	عذاب سے
بِمَرْحُوحَةٍ	بچاکنے والا	مِنَ الْعَذَابِ	خوب دیکھنے والا
أَنْ يُعَمَّرَ	یہ کہ وہ عمر دیا جائے	وَاللَّهُ	اور اللہ
بِمَا	(اس) کو جو	يَعْمَلُونَ ﴿٦١﴾	وہ عمل کرتے ہیں۔

مشرکین نہ آخرت کے قائل تھے نہ عذاب و ثواب کے اور نہ جنت و دوزخ کے لہذا ان کو مرنے کے بعد کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ جب کہ یہود روز جزا کے قائل تھے، اور اپنی بدکرداریوں کا حال بھی انہیں خوب معلوم تھا لہذا وہ تادیر دنیا میں زندہ رہنے کے لیے مشرکوں کی نسبت بہت زیادہ حریص تھے اور آیت علی حَیَوةٍ کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو بس دنیا کی زندگی کی ہوس ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودیوں میں موت کا غیر معمولی خوف پایا جاتا ہے، اگرچہ یہودی

بھی مارے جائیں تو پوری قوم بے چین ہوا اُٹھتی ہے اور ان کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ وہ زندگی خواہ عزت کی ہو یا ذلت کی۔ اس سے انہیں کچھ غرض نہیں۔ حالانکہ یہی لمبی زندگی آخرت میں انہیں بچانا تو درکنار ان کے لیے اور زیادہ عذاب کا سبب بن جائے گی۔ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ: یعنی لمبی سے لمبی عمر بھی کسی کے اعمال کو خدا سے نہیں چھپا سکتی۔ خدا ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا ہے جو یہ کر رہے ہیں اور جب دیکھ رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کا بدلہ نہ دے۔

زندگی کی اصل قدر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے اعمال اچھے ہوں۔“ پھر پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے برا کون ہے؟ فرمایا: ”وہ جس کی عمر لمبی ہو لیکن اس کے اعمال برے ہوں۔“ حوالہ: جامع ترمذی، حدیث نمبر: 2330

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زندگی کی اصل قدر کو واضح فرمایا ہے۔ یعنی لمبی عمر بذات خود فضیلت نہیں بلکہ اس کی اصل خوبی نیک اعمال میں ہے، اگر کسی کو زیادہ عمر ملے اور وہ اسے عبادت، خدمتِ خلق اور تقویٰ میں گزارے تو وہ اللہ کے نزدیک بہترین انسان بن جاتا ہے، لیکن اگر وہی عمر گناہوں، ظلم یا غفلت میں گزاری جائے تو وہی لمبی زندگی وبال بن سکتی ہے، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اصل کامیابی وقت کے صحیح استعمال میں ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ساڑھے یا ستر سال کی عمر تک پہنچ کر نماز، صدقہ، حسن اخلاق اور خدمت میں لگا رہے تو اس کی لمبی عمر اس کے درجات کو بلند کرتی ہے، جبکہ اگر کوئی شخص لمبی عمر پا کر بھی برے اعمال میں مبتلا رہے تو اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہ حدیث ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے اور اصل بھلائی نیک اعمال کے ساتھ لمبی عمر پانے میں ہے۔

یہود کی جبریل دشمنی کی وجہ / مقربین کا عنادی لعنتی ہے کتاب اللہ سے روگردانی

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرٰی لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ
وَجِبْرِیْلَ وَمِيْكَلَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۖ
وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفٰسِقُونَ ۝ أَوْ كَلَّمَا عَهْدًا وَعَهْدًا تَبَدَّلَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ طَبْلًا
أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ
تَبَدَّلَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۖ كَتَبَ اللّٰهُ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَاتِبُهُمْ لَا
يَعْلَمُونَ ۝

نزول وحی کی مختلف صورتیں

قُلْ	آپ کہہ دیجئے	مَنْ كَانَ	جو ہے	عَدُوًّا لِجِبْرِیْلَ	دشمن جبریل کا
فَإِنَّهُ	تو بیشک اس نے	نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ	نازل کیا ہے آپ کے دل پر		

نزول وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ

السلام حضور نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے تو حضور ﷺ کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل موبائل یا ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رو ہوتی تھی جس کے ذریعے پیغمبر (علیہ السلام) اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اسے خوب سمجھتے تھے اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت ﷺ کو بذریعہ خواب بتادی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الہی پیش کرتا تھا تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے جبرائیل (علیہ السلام) سے فرمایا (1۔ بخاری ج 2 ص 691) کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل (علیہ السلام) نے فرمایا: وَمَا نَنْتَظِرُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ہم تو صرف آپ کے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے ہم حاضر ہو جاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔

ضد حسد اور فرقہ سازی کا جنون

بِأَذْنِ اللَّهِ	اللہ کے حکم سے	مُصَدِّقًا	تصدیق کرنا والا ہے
لِّمَا	اس کی جو	بَيْنَ يَدَيْهِ	اس سے پہلے ہے
وَبُشْرَى	اور خوشخبری ہے	لِلْمُؤْمِنِينَ ۝۹۵	ایمان والوں کے لئے۔

یہودیوں کے ایک گروہ نے حضور سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے کہا: آپ کے پاس آسمان سے کون فرشتہ آتا ہے؟ نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ”میرے پاس حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام آتے ہیں۔ ابن صویر یا یہودی پیشوا نے کہا: وہ ہمارا دشمن ہے، عذاب، شدت اور زمین میں دھنسا نا وہی اتارتا ہے اور پہلے بھی کئی مرتبہ ہم سے دشمنی کر چکا ہے اگر آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے پاس حضرت میکائیل عَلَیْہِ السَّلَام آتے تو ہم آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پر ایمان لے آتے۔ (قرطبی، البقرة تحت الآية: ۱۰۹۷ / ۲۸، الجزء الثاني، خازن،

البقرة تحت الآية: ۱۹۷/۷۱

یہودیوں کی یہ بات سراسر جہالت تھی کیونکہ حضرت جبریل علیہ السلام تو جو چیز بھی لائے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھی تو حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی تھی، بلکہ اگر یہودی انصاف کرتے تو حضرت جبریل امین علیہ السلام سے محبت کرتے اور ان کے شکر گزار ہوتے کہ وہ ایسی کتاب لائے جس سے ان کی کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود، قرآن اور نبی ﷺ کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب یہ اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو کہیں متاثر نہ کر دے تو انہوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہو کہ محمد ﷺ کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لاسکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتہ سے ساز باز ہے۔ اگرچہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہود حماقت کی اس حد کو پہنچ جائیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگ جائیں لیکن انسان جب ضد، حسد اور فرقہ سازی کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں رہ جاتی۔ روافض کے ایک فرقہ کا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن دراصل اترنا تو تھا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لیکن جبریل غلطی سے محمد ﷺ کے پاس اس کو لے کر چلے گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اس گناہ پر نعوذ باللہ، حضرت جبریل امین پر لعنت بھی کرتے ہیں۔

فرشتہ رحمت اور فرشتہ عذاب

مَنْ كَانَ	جو ہے	عَدُوًّا لِلَّهِ	دشمن اللہ کا	وَمَلِيكَتِهِ	اور اس کے فرشتوں کا
وَرُسُلِهِ	اور اس کے رسولوں کا	وَجَبْرِيْلَ	اور جبریل	وَمِيْكَلَ	اور میکائیل کا
فَيَاِنَّ اللّٰهَ	تو بیشک اللہ	عَدُوٌّ	دشمن ہے	لِلْكَافِرِيْنَ ۝۸	کافروں کا۔

یہودی حضرت میکائیل کو حضرت جبریل سے افضل جانتے تھے اور کہتے تھے کہ میکائیل فرشتہ

رحمت میں اور جبریل فرشتہ عذاب، ان کا خیال تھا کہ بنی اسرائیل پر جو کچھ ابتلا میں اللہ کی طرف سے آئیں، وہ حضرت جبریل ہی لے کر آتے، اس لئے بہانہ کرتے کہ اگر محمد ﷺ پر جبریل کے بجائے میکائیل وحی لے کر آتے تو ہم ایمان لانے کے بارے میں غور کرتے، یہاں اسی باطل خیال کی تردید ہے کہ فرشتہ کوئی بھی ہو اور وہ رحمت لے کر آیا ہو یا عذاب، جب وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے اور جو کچھ لایا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے لایا ہے، تو اس پر اعتراض بے معنی ہے، پھر قرآن مجید نے ایک اصول بتایا کہ اللہ، اس کے رسول، اس کے ملائکہ، جن میں جبریل بھی ہیں، میکائیل بھی، سے محبت و عداوت ایک دوسرے سے مربوط ہے، یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ایک سے نفرت و عداوت ہو اور دوسرے سے محبت و دوستی؛ اس لئے کسی فرشتہ یا رسول کے دشمن دراصل خود اللہ کے دشمن ہیں اور اس لئے اللہ بھی ان کا دشمن ہے۔

فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضب الہی کا سبب

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضب الہی کا سبب ہے اور محبوبان حق سے دشمنی خدائے جلّٰی سے دشمنی کرنا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خادم ہیں، ان کا دشمن رب تعالیٰ کا دشمن ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک فرشتے سے عداوت سارے فرشتوں سے عداوت ہے۔ یہی حال انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاء عظام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم سے عداوت رکھنے کا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اسے میں نے لڑائی کا اعلان کر دیا۔“ (بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۴/ ۲۴۸، الحدیث: ۶۵۰۲)، گویا اللہ کے کسی ایک ولی سے دشمنی سارے اولیاء اللہ سے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی دشمنی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کی تعظیم نہایت ضروری اور ان سے بغض و عناد اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف اعلان جنگ فرماتا ہے۔

محبت اور تعظیم کا صحیح مطلب

لیکن محبت اور تعظیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں پر گنبد اور قبے بنائے جائیں، ان کی قبروں پر سالانہ عرس کے نام پر میلوں ٹھیلوں کا اہتمام کیا جائے، ان کے نام کی نذر و نیاز اور قبروں کو غسل دیا جائے اور ان پر چادر میں چسڑھائی جائیں اور انہیں حاجت روا، مشکل کشا، نافع و ضار سمجھا جائے، ان کی قبروں پر دست بستہ قیام اور ان کی چوکھٹوں پر سجدہ کیا جائے وغیرہ، جیسا کہ بدقسمتی سے ”اولیاء اللہ کی محبت“ کے نام پر یہ کاروبارلات و منات فساد پر غیر ہے۔ حالانکہ یہ ”محبت“ نہیں ہے، ان کی عبادت ہے، جو شرک اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ عبادت کو برے محفوظ رکھے۔

معجزات اور واضح نشانیاں

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اَنْزَلْنَا	ہم نے نازل کیں	اِلَيْكَ	آپ کی طرف
اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ	نشانیاں واضح	وَمَا يَكْفُرُ	اور نہیں وہ انکار کرتے		
بہا	اس کا	اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾	مگر نافرمان۔		

یعنی کھلی نشانیاں، جن میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت موجود ہے، واضح نشانوں میں قرآن مجید بھی ہے، قرآن کی فطرت انسانی سے مطابقت اور عقل و دانش سے ہم آہنگ تعلیمات بھی، اور وہ بہت سے معجزات بھی جو آپ ﷺ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ ابن صوریانے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم پہچاننے ہوں اور آپ پر ایسی کوئی روشن آیت نازل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے ہم آپ کی پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں نازل فرمائی ہیں جن میں حلال، حرام اور حدود وغیرہ کے احکام واضح اور تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور ان آیتوں کا انکار وہی کرتا ہے جو ہمارے احکامات کی اطاعت نہیں کرتا۔ (خازن، البقرۃ تحت الآیۃ: ۱، ۹۹/۷۲)

فسق کا اصلی مفہوم

فسق کا اصلی مفہوم خدا کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے، بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بڑی سے بڑی نافرمانیوں کے لئے استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کا یہی مفہوم یہاں بھی ہے سیاق سابق سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مطلب ہے کہ اگر بات دلائل و شواہد کی ہو تب قرآن کی صداقت واضح ہے لیکن جو لوگ خدا کے عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کے نزدیک دلائل و شواہد کی کیا اہمیت ہے۔

یہودیوں کا تورات پر ایمان ہی نہیں

اَوْ كَلَّمَا	اور کیا جب بھی	عَهْدُوا	انہوں نے عہد کیا	عَهْدًا	کوئی عہد
تَبَذَّاهُ	توڑ دیا اس کو	فَرِيقٌ	ایک گروہ نے	مِنْهُمْ	ان میں سے
بَلْ أَكْثَرُهُمْ	بلکہ اکثر ان کے	لَا يُؤْمِنُونَ ۝۱۵	ایمان نہیں رکھتے۔		

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: جب حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کے وہ عہد یاد دلائے جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے متعلق تھے تو مالک بن صفیث نے کہا: خدا کی قسم! آپ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ یہودیوں نے جب کبھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اس عہد کو ویسے ہی پیٹھ پیچھے پھینک دیا بلکہ ان میں سے اکثر یہودیوں کو تورات پر ایمان ہی نہیں اسی لئے وہ عہد توڑنے کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس بات کی کوئی پرواہ کرتے ہیں۔ عہد سے عام باتوں کے علاوہ خاص طور پر وہ عہد بھی مراد ہے، جو آئندہ پیغمبر پر ایمان لانے سے متعلق لیا جاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر کے یہود نے اس عہد کی خلاف ورزی کی تھی۔ یعنی ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کو اس کا بھی یقین نہیں کہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ضروری ہے، یا یہ کہ ان سے تورات کے ذریعہ جو عہد لیا گیا، اسی کا یقین نہیں ہے، تو جو لوگ عہد و پیمان کے معاملہ میں اتنے کمزور ہیں، ان سے وعدہ پورا

کرنے کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے؟

کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینے والا گروہ

وَلَبَّآ	اور جب	جَاءَهُمْ	آیا ان کے پاس	رَسُولٌ	کوئی رسول
مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ	اللہ کی طرف سے	مُصَدِّقٌ	تصدیق کرنے والا	لِّمَّا	اسکی جو
مَعَهُمْ	ان کے پاس ہے	نَبَذَ	پھینک دیا	فَرِيقٌ	ایک فریق نے
مِّنَ الَّذِينَ	(ان لوگوں) سے جو	أَوْثُوا الْكِتَابَ	دیئے گئے کتاب		
كُتِبَ اللَّهُ	اللہ کی کتاب کو	وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ	اپنی پیٹھ پیچھے		
كَأَنَّهُمْ	گویا کہ	لَا يَعْلَمُونَ ②	وہ جانتے ہی نہیں۔		

وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ ”پس پشت یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے تو خاتم النبیین ﷺ کی تصدیق کرتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا۔ یا الفاظ کے معنی الٹ دے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا “كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ” گویا وہ جانتے ہیں نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول (علیہ السلام) کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا! تو وہ دونوں چیزوں کو بلا شک و شبہ پہچان لیتے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اہل کتاب کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں؛ اس لئے کہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کا انکار اور جان بوجھ کر انجان بن جانا ان کا پدانا وصف ہے اور کتنے ہی پیغمبر ہیں جو ان کی بے توجہی و بے رخی کا زخم کھا چکے ہیں اور دکھ اٹھا چکے ہیں بعض مفسرین نے اس آیت میں رسول سے خاص طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات مراد لی ہے، اس کی بھی گنجائش ہے۔

جادو کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی ڈالنا / جادو کی حقیقت قرآن و سنت کی روشنی میں اور اُس کا علاج

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلٰكِنَّ
الشَّيْطَانُ كَفَرٌ ۖ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۖ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ
هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۖ وَمَا يُعَلِّمُونَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا
تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۖ وَمَا هُمْ
بِضَارِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۖ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ
وَلَقَدْ عَلِمُوا الْمَنَاسِكَةَ الَّتِي إِلَى الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرُّوْا بِهِ
أَنفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَآتَقُوا الْمُنْجِبَةَ ۖ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾

یہودیوں میں جادو ٹونا کرنے کی بیماری

وَاتَّبِعُوا	اور انہوں نے پیروی کی	مَا تَتْلُوا	اس کا جو پڑھتے تھے
الشَّيْطَانُ	شیاطین	عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ	سلیمان کی بادشاہت میں

وَمَا كَفَرُ	حالانکہ نہیں کفر کیا	سُلَيْمُنُ	سلیمان نے
وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ	اور لیکن شیاطین	كَفَرُوا	انہوں نے کفر کیا
يُعَلِّمُونَ	وہ سکھاتے ہیں	النَّاسَ السِّحْرَ	لوگوں کو جادو

یہودیوں میں جادوؤں نے کا بڑا ذوق تھا، بابل میں اسی لئے کثرت سے جادو اور جادو گروں کا ذکر ملتا ہے، حضرت سلیمان کے زمانہ میں یہودیوں میں یہ فاسد ذوق بہت پروان چڑھ گیا تھا؛ اس لئے خاص طور پر اس عہد کا ذکر کیا گیا، شیاطین سے مراد جنات شیاطین بھی ہو سکتے ہیں، جن کو جادو گر عام طور پر اپنی فاسد اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں اور شیاطین انسان یعنی بدکارو بدطینت اور فن جادو گری کے ماہر انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

وَمَا أُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا	عَلَى الْمَلَائِكِينَ	دو فرشتوں پر
بِبَابِلَ	بابل (شہر) میں	هَارُوتَ	ہاروت
		وَمَارُوتَ	اور ماروت

شہر بابل کا جغرافیائی محل وقوع

قدیم اور تاریخی شہر بابل (Babylon) موجودہ دور کے عراق میں دریائے فرات کے کنارے واقع تھا۔ اس کا جغرافیائی محل وقوع کچھ اس طرح ہے، یہ دار الحکومت بغداد سے تقریباً 90 کلومیٹر جنوب میں اور جدید شہر حلبہ سے 10 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ یہ شہر دریائے فرات کے زرخیز میدانی علاقے میں آباد تھا، جس نے اسے زراعت اور تجارت کا مرکز بنایا۔ بابل ایک زمانہ میں علاقہ کا بڑا متمدن اور ترقی یافتہ شہر رہا تھا، یہیں بنی اسرائیل کی بڑی تعداد قیدی بنائی گئی تھی، ان پر فن جادو گری کا ایسا غلبہ تھا کہ اپنے قید ہونے کے زمانہ میں بھی وہ اس سے باز نہ تھے اور جادو سیکھنے سکھانے میں سرگرم تھے، جادو بعض اوقات پیغمبروں کے معجزات کو بھی مشتبہ کر دیتا ہے؛ کیوں کہ ظاہر میں نگاہوں میں دونوں صورتیں خلافِ عادت ہوتی ہیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو یہاں انسانی صورت میں بھیجا، ان کو جادو کا علم دیا گیا؛ تاکہ لوگوں کو ایک ماہر فن کی طرح جادو کی حقیقت اور اصول بتا کر جادو اور معجزہ کا فرق بتائیں، ان فرشتوں کا مقصد تو صرف اس

خاص غرض کے لئے جادو کے بارے میں اصول و قواعد کا بتلانا تھا؛ لیکن بعض کج فکر لوگ جادو کے اصول اور طریقے پوچھ کر اس کا استعمال اپنی فاسد اغراض کے لئے کیا کرتے تھے؛ اس لئے یہ فرشتے جادو کی تفصیل بتاتے ہوئے لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہمیں خدا نے امتحان و آزمائش کے لئے بھیجا ہے، ہم بتا دو دیں گے؛ لیکن اگر تم اس کو غلط استعمال کی نیت سے سیکھو گے تو اپنے آپ ہی کو برباد کرو گے، ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں تفسیر کی کتابوں میں بعض اور واقعات بھی ذکر کئے گئے ہیں، وہ سب اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں، غیر معتبر ہیں اور اسلامی تعلیمات سے مناسبت نہیں رکھتے۔ لفظی معنی میں ہاروت و ماروت پر اتارا گیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل کی جاتی ہے، اسی طرح ان پر فن جادو گری نازل کیا گیا ہو، مقصد صرف اتنا ہے کہ من جانب اللہ فرشتوں کو اس کا علم دیا گیا، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر انزال کا لفظ محض عطا کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق

وَمَا يُعَلِّمَنِ	اور نہیں وہ سکھاتے تھے	مِنْ أَحَدٍ	کسی ایک کو
حَتَّىٰ	یہاں تک کہ	يَقُولَا	وہ کہہ دیتے
إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ	ہم صرف آزمائش ہیں	فَلَا تَكْفُرْ	تو مت کہہ کہ تو

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق تھے؛ لیکن یہودیوں نے ان کی طرف مختلف بے ہودہ باتیں منسوب کر دی تھیں، انہیں میں سے یہ تھا کہ وہ جادو کا علم بھی ان کی طرف منسوب کرتے؛ حالانکہ جادو گر عہد سلیمان کے شیاطین تھے نہ کہ خود حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے بھی بڑا بہتان یہ تھا کہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی غیر اسرائیلی بیویوں سے متاثر ہو کر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرنے لگے تھے، بائبل کے صحیفہ سلاطین کے باب نمبر: ۱۱ میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے، قرآن مجید نے ایک نبی معصوم کی حیات طیبہ پر بنی اسرائیل کی طرف سے ڈالے جانے والے اس غبار کو یہاں صاف کر دیا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان تفریق کرنا گناہِ کبیرہ ہے

فَيَتَعَلَّمُونَ	پھر وہ سیکھ لیتے تھے	مِنْهُمَا	ان دونوں سے
مَا يُفَرِّقُونَ	وہ جدائی ڈالتے تھے	بِهِ	اسکے ذریعے سے
بَيْنَ الْمَرْءِ	درمیانِ خاوند	وَزَوْجِهِ	اور اس کی بیوی کے

شیطان کو شوہر و بیوی کے درمیان تفریق بہت محبوب ہے؛ اس لئے کہ معاشرہ کا استحکام اور اس کا صحیح خطوط پر قائم رہنا اور چلنا ازواجی زندگی کے استحکام پر مبنی ہے، حدیث میں بھی آیا ہے کہ شیطان اپنے اُن کارندوں سے بہت خوش ہوتا ہے جو میاں بیوی میں تفریق کرادیں؛ (مسلم، باب تحریش الشیطان الخ، حدیث نمبر: ۷۱۰۶) اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے۔“ (ابوداؤد ج: ۱ ص: ۲۹۶) اس سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان منافرت پھیلانا اور ایک دوسرے سے بدظن کرنا گناہِ کبیرہ ہے، اور ایسا کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ: ”وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں“ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یہ فعل مسلمانوں کا نہیں۔ اس آیت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرنے کو یہودی جادو گروں کا فعل بتایا ہے۔

جادو ایک حقیقت ہے

وَمَا هُمْ	اور نہیں تھے وہ	بِضَارٍّ يَرِي	نقصان پہنچانے والے
بِهِ	اس جادو کے ساتھ	مِنْ أَحَدٍ	کسی ایک کو
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ	مگر اللہ کے حکم سے	وَيَتَعَلَّمُونَ	اور وہ سیکھتے ہیں
مَا يَضُرُّهُمْ	جو انہیں نقصان پہنچائے	وَلَا يَنْفَعُهُمْ	اور انہیں نفع نہ دے

بے شک جادو ایک حقیقت ہے، اور بعض بد بخت لوگ جادو کرتے بھی ہیں، اور سبب کے درجے میں اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے، لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات کے خالق و

مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں، ان کے حکم کے بغیر دنیا میں ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا، اسباب کے خالق بھی وہی ہیں اور اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے بھی وہی ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا: وَمَا هُمْ بِضَآئِرٍ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: وہ لوگ کسی کو جادو کے ذریعے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے حکم سے۔

عموماً شیطانی وسوساں، انسانی نفیات، نظر بد اور حسد کے اثرات وغیرہ اور بعض اوقات پیشہ ور حضرات لوگوں کو جادو کے وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان شیطانی حملوں سے بچنے کے لئے درج ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس کی تعلیم ہمیں دین نے دی ہے:

1۔ سب سے بنیادی بات کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور ان کی صفات پر کامل ایمان اور یقین ہو، اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہو تو قوتِ ایمانی سے ہی ان شاء اللہ بہت سی شیطانی قوتیں اور نفسیاتی حملے پسپا ہو جاتے ہیں۔

2۔ پنج وقتہ نمازوں کی پابندی، ان کی شرائط و احکام کی رعایت رکھ کر ادا کرنے کا اہتمام، جو درحقیقت خالق و مالک سے تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے، اور جب بندے کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوتا ہے تو شیطان کا بس اس پر نہیں چلتا۔

3۔ ہر وقت پائی کا اہتمام کرنا، با وضو ہنا، اور تلاوتِ قرآن کریم کی کثرت، نیز ذکر کی پابندی۔
4۔ صبح و شام کی حفاظت کی مسنون دعائیں پڑھنے کا اہتمام، (جو مختلف مستند علماء کرام نے جمع کر کے شائع کر دی ہیں، کبھی بھی دینی کتب خانے سے حاصل کی جاسکتی ہیں) نیز درج ذیل اذکار صبح و شام سات سات مرتبہ پابندی سے یقین کے ساتھ پڑھ کر دنوں ہاتھوں میں تھکا کر کمر سے پیر تک اپنے پورے جسم پر پھیر دیں ان شاء اللہ ہر قسم کے سحر، آسیب اور نظر بد کے اثرات بد سے حفاظت رہے گی:

درد و شریف، سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، سورہ الم نشرح، سورہ کافرون، سورہ اخلاص، سورہ فلق، سورہ ناس اور درد شریف

ایک روایت میں ہے کہ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ جو پہلے یہود کے بڑے علماء میں سے تھے

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے بیان کیا کہ اگر میں یہ چند کلمات نہ پڑھا کرتا تو یہود جادو سے مجھے گدھا بنا دیتے وہ الفاظ یہ ہیں:

أَعُوذُ بِوَجْهِ اللَّهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ، وَبِكَلِمَاتِ اللَّهِ الثَّمَنَاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ، وَبِأَسْمَاءِ اللَّهِ الْحُسْنَى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَالَهَا أَعْلَمُ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ.

سزائیں دینا صرف اسلامی حکومت کا کام ہے

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَلِمُوا	جان لیا انہوں نے	لَمَن	البتہ جس نے
اشْتَرَاهُ	خریدا اس (جادو) کو	مَالَهُ	نہ ہوگا اس کیلئے	فِي الْآخِرَةِ	آخرت میں
مِنْ خَلْقٍ	کوئی حصہ	وَلَيْسَ	اور البتہ برا ہے	مَا شَرُّوا	جو انہوں نے بیچ دیا
يَهٍ	اس کے بدلے	أَنْفُسَهُمْ	اپنی جانوں کو	لَوْ	کاش کہ
كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾			وہ جانتے ہوتے۔		

شیطان انسان کو جن راہوں سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، ان میں جادو وہ ذریعہ اور عمل ہے، جسے خالصتاً شیطانی عمل قرار دیا گیا۔ جادو کے لیے عربی زبان میں ”سحر“ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، قرآن و سنت میں سحر (جادو) ایسے امر کو کہا جاتا ہے جس میں شیطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر و شرک کے کلمات ہوں اور شیطین کی مدح سرائی کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا ناپاکی و نجاست کی حالت میں رہنا وغیرہ۔ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ”شریعت میں سحر، جادو ہر اس کام کے ساتھ مخصوص ہے جس کا سبب مخفی ہو، اسے اس کی اصل حقیقت سے ہٹ کر پیش کیا جائے اور دھوکا دہی اس میں نمایاں ہو“۔ غرض سحر جادو گراور شیطان کے درمیان ہونے والے ایک معاہدے کا نام ہے، جس کی بناء پر جادو گر کچھ حرام اور شرکیہ امور کا

ارتکاب کرتا ہے اور شیطان اس کے بدلے جادو گر کی مدد کرتا اور اس کے مطالبات پورے کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتہ لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے جو دوسری حدیث کی کتابوں میں بھی درج ہے کہ ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ بھی جادو کے اثر میں رہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے نبی اکرم ﷺ پر جادو کیا، جب آپ ﷺ نے اس کے اثرات کو اپنے اوپر محسوس کیا تو جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس جن کو ”معوذتین“ کہتے ہیں، وحی کی گئیں۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا: ”یقیناً ایک یہودی نے آپ ﷺ پر جادو کیا ہے اور اس کا طلسم فلاں کنوئیں میں رکھا ہوا ہے۔“ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ وہاں سے طلسم لے آئیں۔ جب وہ اسے لے کر واپس آئے تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس کی گرہوں کو ایک ایک کر کے کھولیں اور ہر گرہ کے ساتھ ان سورتوں میں سے ایک ایک آیت پڑھیں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو آپ ﷺ یوں اٹھ کھڑے ہوئے، گویا وہ پہلے بندھے ہوئے تھے۔ (صحیح بخاری) آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص نجومی کے پاس جا کر اس سے کوئی بات پوچھے، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی۔“ (صحیح مسلم) صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان اپنے امیگنوں کے بڑے بڑے کارناموں پر خوش نہیں ہوتا، لیکن اس بات پر بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کا کوئی پیروکار میاں بیوی کے درمیان تفریق کروادے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی کا تہن کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی۔“ (سنن ابوداؤد) اسلام میں جادو سیکھنا اور جادو کرنا دونوں کو کفر قرار دیا گیا ہے، اس لیے جو کوئی بھی جادو کرتا ہو، اس کے لیے شریعت میں بہت سخت سزا رکھی گئی ہے۔ اگر کوئی جادو پر عمل کرتا ہوا پکڑا جائے اور وہ توبہ نہ کرے اور جادو کرنا نہ چھوڑے تو اس کی سزا موت ہے۔ اس قانون کی بنیاد اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث ہے جس کے راوی حضرت جندب ابن کعب رضی اللہ عنہ ہیں۔ نبی

اکرم ﷺ نے فرمایا: ”جادو گر کے لیے مقرر کردہ سزایہ ہے کہ اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے۔“ اس قانون پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے سختی سے عمل کیا۔ یاد رہے کہ یہاں جادو گر کے بارے میں جو سزائیں بیان کی گئیں یہ سزائیں دینا صرف اسلامی حکومت کا کام ہے، عوام الناس کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں، البتہ ہر ایک کو چاہئے کہ جادو کرنے والوں سے دور رہے۔ جادو کا اثر تب واقع ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو۔ کیونکہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی محتاج ہے۔ جادو حضور اکرم ﷺ پر بھی کیا گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس کے شر سے محفوظ رکھا اور امت کے لیے یہ آسانی ہوئی کہ آپ ﷺ کے طفیل امت کو جادو کا علاج بتا دیا گیا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا، ایک شخص پر اگر جادو ہو یا اس کی بیوی تک پہنچنے سے اسے باندھ دیا گیا ہو، اس کا دفعیہ کرنا اور جادو کے باطل کرنے کے لیے عمل کرنا درست ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جادو کا توڑ کرنے والوں کی نیت تو اچھی ہوتی ہے اور اللہ پاک نے اس بات سے منع نہیں فرمایا جس سے فائدہ ہو۔ (صحیح بخاری) انسان جادو کی وجہ سے بڑے بڑے خطرات سے دوچار ہو سکتا ہے، اس لیے کسی بھی دن معوذات اور مننون دعاؤں سے سستی اور کاہلی نہ برتی جائے حتیٰ کہ بعض اوقات انسان کو جادو کے ذریعے قتل تک کر دیا جاتا ہے۔ کالے جادو کرنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیتے جاگتے انسان کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اسی وقت مقررہ پر ہی آئے گی، لیکن جس طرح ظاہری طور پر انسان کا قتل ہو جانا سبب کا درجہ رکھتا ہے، اسی طرح جادو کے ذریعے بھی سبب کے درجے میں قتل کیا جاسکتا ہے۔

از روئے شریعت جادو کرنا یا کرنا کفر ہے

از روئے شریعت کسی پر جادو کرنا یا کرنا کفر ہے اور اس کا کرنے والا اور کرانے والا دونوں دائرۃ اسلام سے خارج ہیں۔ اگر کسی مسلمان نے یہ عمل کیا یا کرایا تو اسے چاہیے کہ فوراً اپنے ایمان کی تجدید کرے اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو اپنے نکاح کی بھی تجدید کرے۔ مختصر یہ کہ جادو

خالصتا ایک شیطانی عمل ہے، جس سے بچنا، دور رہنا اور مکمل اجتناب کرنا ایمان اور شریعت دونوں کا بنیادی تقاضا ہے۔

دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل

وَلَوْ	اور اگر	أَتَّهَمُوا	بیشک وہ	أَمِنُوا	ایمان لاتے	وَأَتَّقُوا	اور پرہیزگار بن جاتے
لَمَثُوبَةً	البتہ ثواب پاتے	مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ	اللہ کی طرف سے	حَيِّرٌ	بہتر ہے		
لَوْ	کاش کہ	كَانُوا يَعْلَمُونَ	وہ جانتے ہوتے۔				

فرمایا گیا کہ اگر یہودی حضور، سید کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اور قرآن پاک پر ایمان لاتے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ثواب ان کیلئے بہت اچھا ہوتا کیونکہ آخرت کی تھوڑی سی نعمت دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے اعلیٰ ہے۔ دوستو! کھانے پینے کے لیے ہمیں نہیں پیدا کیا گیا، یہ کھانا پینا تو ہماری زندگی کے لیے دیا ہے، مگر زندگی اپنی بندگی کے لیے دی، بعض لوگ اپنے جسم کو امپورٹ ایکسپورٹ کا آفس سمجھتے ہیں، یعنی ادھر سے روٹی ڈالی اور نیچے سے صبح لیٹرین میں ایکسپورٹ کر دیا تو گویا آپ لوگ دفتر ہیں، نعوذ باللہ! امپورٹ ایکسپورٹ آفس بنے ہوئے ہیں، ارے بھائی! یہ جو کھارہے ہو اس رزق روٹی سے جو خون بنے اور خون سے جو طاقت بنے اُس طاقت کو اللہ پر فدا کر دو، آنکھوں میں جو روشنی آئی خدا پر فدا کر دو، اُس سے نامحرموں اور مردوں کو مت دیکھو، کان میں جو سننے کی طاقت آئی قرآن شریف سنو، اللہ والوں کی باتیں سنو، زبان میں جو طاقت آئی سبحان اللہ پڑھو، اللہ کے گیت گاؤ، ٹانگوں میں جو طاقت آئی اس سے مسجد جاؤ، عمرہ کرو، روضہ مبارک کی زیارت کرو، ہاتھوں میں جو طاقت آئی علماء سے مصافحہ کرو، اللہ والوں اور حجرِ اسود کا بوسہ دو، یعنی ہر چیز کا حق ادا کرو، سر میں جو طاقت آئی سر کو اللہ کے قدموں میں رکھ دو۔ قرآن مجید میں واضح طور پر ارشاد ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف بہتر اور پائیدار ہے، بلکہ سورۃ الاعلیٰ کے مطابق اس کا موازنہ دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل سے ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔

مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت / تنسیخ آیات کی وجوہات

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوْا اَنْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۚ وَلِلْكَافِرِيْنَ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ مَا يُوْذُوْا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ
يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو
الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلَهَا ۚ
اَلَمْ تَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

رَاعِنَا کے بجائے ”اَنْظُرْنَا“ کہنے کا حکم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو	لَا تَقُوْلُوْا	مت تم کہو
رَاعِنَا	ہماری رعایت کیجئے	وَقُوْلُوْا	اور تم کہو	اَنْظُرْنَا	ہمیں دیکھئے
وَاسْمَعُوْا	اور تم سنو	وَلِلْكَافِرِيْنَ	اور کافروں کے لئے		
عَذَابٌ	عذاب ہے	اَلِيْمٌ ۝	دردناک۔		

جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کچھ تسلیم و تلقین فرماتے تو وہ کبھی کبھی درمیان میں عرض کیا کرتے۔ رَاعِنَا یَا رَسُولَ اللہ اس کے یہ معنی تھے کہ یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، ہمارے حال کی رعایت فرمائیے یعنی کلام اقدس کو

اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیکھئے۔ راعنا“ کے معنی میں ہمارے رعایت کیجئے! اس معنی کے اعتبار سے یہ کوئی گستاخانہ لفظ نہیں؛ لیکن یہود اس لفظ کو ایک خراب معنی میں بھی استعمال کرتے تھے اور جب آپ ﷺ کو درمیان گفتگو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا تو اسی بدینتی کے ساتھ آپ ﷺ کو مخاطب کرتے تھے، بھولے بھالے مسلمانوں کو ان کی اس بدتمیزی کا علم نہیں تھا؛ اس لئے دیکھا دیکھی ایسے مواقع پر وہ بھی ”راعنا“ کہہ کر آپ ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے، اسی پس منظر میں قرآن مجید نے یہودیوں کی اس بے ہودہ حرکت کا پردہ فاش کیا اور ہدایت کی کہ اگر حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو تو بجائے ”راعنا“ کے بجائے ”انظرنا“ کہیں، اس کے معنی بھی وہی ہیں ہمارا لحاظ فرمائیے!؛ مگر اس میں گستاخانہ معنی مراد لینے کی گنجائش نہیں اور فرمایا گیا کہ خوب احترام سے آپ ﷺ کے ارشادات کو سنا کریں، اس سے معلوم ہوا کہ خدا، رسول اور دین و شریعت کے ذکر میں ایسے الفاظ سے بھی احتیاط برتنی چاہئے، جس کے گو درست معنی بھی ہوں اور نیت بھی بولنے والے کی بری نہ ہو؛ لیکن اس میں خلافِ ادب معنی کی بھی گنجائش نکلتی ہو، اسی طرح ایسے مباح کام سے بھی منع کیا جائے گا، جس کے بارے میں خطرہ ہو کہ دوسرے فاسد فکر و ذہن کے لوگ اس کو اپنی غلط کاریوں کے لئے ڈھال بنالیں گے۔ ایسے الفاظ جن میں بے ادبی یا گستاخی کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہو، وہ استعمال کرنا درست نہیں۔

یہودیوں کی ایک اور کینگی

یہودیوں کی اسی طرح کی ایک اور کینگی کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ وہ ”السلام علیکم“ کے بجائے ”اَلْسَلَامُ عَلَیْکُمْ“ کہتے؛ جس کا معنی ہے تم پر موت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے جواب میں صرف ”عَلَیْکَ“ کہنے کا حکم دیا کہ وہ تمہیں پر ہو۔ (مسلم) اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم و توقیر اور ان کی جناب میں ادب کا لحاظ کرنا فرض ہے اور جس کلمہ میں ترکِ ادب کا معمولی سا بھی اندیشہ ہو وہ زبان پر لانا ممنوع ہے۔ ایسے الفاظ کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ جس لفظ کے دو معنی ہوں اچھے اور برے اور لفظ بولنے میں اس برے

معنی کی طرف بھی ذہن جاتا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ اور حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے لئے استعمال نہ کئے جائیں۔

کلمہ کفر کہنے والوں کیلئے دردناک عذاب

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی بارگاہ کا ادب رب العالمین خود سکھاتا ہے اور تعظیم کے متعلق احکام کو خود جاری فرماتا ہے۔ الغرض فرمایا کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرو جو آپ کی شان کے خلاف ہو اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یاد رکھو "وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ"۔ کلمہ کفر کہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی جو یہودی سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی توہین کر رہے ہیں اور ان کے بارے میں بے ادبی والے الفاظ استعمال کر رہے ہیں ان یہودیوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (روح البیان، البقرة تحت الآية: ۱۰۴، ۹۷) یاد رہے کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ السَّلَامُ وَاٰلِہٖمُ السَّلَام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے۔

رحمت سے مراد نبوت

مَا يَوْذُ الَّذِينَ	نہیں چاہتے جنہوں نے	كَفَرُوا	کفر کیا
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	اہل کتاب میں سے	وَلَا الْمُشْرِكِينَ	اور نہ شرک کرنے والے
أَنْ يُنْزَلَ	یکہ نازل کی جائے	عَلَيْكُمْ	تم پر
مِنْ رَبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے	وَاللَّهُ	اور اللہ
بِرَحْمَتِهِ	اپنی رحمت کے ساتھ	مَنْ يَشَاءُ	جس کو وہ چاہتا ہے
وَاللَّهُ	اور اللہ	ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝۵	بڑے فضل والا (ہے)

وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ مُشرکین عرب کے نزدیک رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم ایک عام آدمی تھے اور وہ اپنے کسی عظیم سردار کے بجائے ایک عام آدمی پر وحی کا نزول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دیکھیے الزخرف (31) اور اہل کتاب اللہ کی اس رحمت کو اپنی نسل سے باہر نہیں دیکھ سکتے

تھے۔ فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے خاص کرے۔ یہاں رحمت سے مراد نبوت ہے، جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، وہ کسی کی عظمت کی بنیاد پر ملتی ہے، نسل پر اور نہ کسی کے کسب، محنت اور چہل قدمی پر، یہودیوں کو اصل تکلیف تو یہ تھی کہ نبی آخر الزمان ﷺ ان میں کیوں مبعوث نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ اولاد اسماعیل سے اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے جنہیں یہود اپنے سے بہت کمتر اور حقیر سمجھتے تھے اور مشرکوں کو یہ تکلیف تھی کہ آپ خالصتاً ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے۔ جس کی زدان پر، ان کے معبودوں پر، ان کے آباء و اجداد پر اور ان کی چودھراہٹ پر پڑتی تھی۔ لہذا یہود اور مشرکین دونوں ہی پیغمبر اسلام، اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے کوئی بھلائی کی بات کیسے گوارا کر سکتے تھے، اور یہاں بھلائی اور رحمت سے مراد بالخصوص وہ احکام الہی ہیں جو مسلمانوں کی طرف نازل کئے جا رہے تھے۔ لہذا یہ دونوں فسرلیق مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔ یہودیوں کو اصل حد اس بات سے تھا کہ نبوت کا شرف بجائے بنو اسحاق کے بنی اسماعیل کو کیوں حاصل ہو رہا ہے؟ اس آیت میں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ نبوت سے سرفراز کیا جانا اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل سے سرفراز فرمائیں۔

نسخ کا معنی و مفہوم اور نسخ کے منکر لوگ

مَا نُنَسِّخْ	جو ہم منسوخ کرتے ہیں	مِنْ آيَةٍ	کوئی آیت
أَوْ نُنَسِّهَا	یا ہم بھلا دیتے ہیں اسے	نَأْتِ	ہم لے آتے ہیں
بِخَيْرٍ مِنْهَا	بہتر اس سے	أَوْ مِثْلَهَا	یا اس جیسی
أَلَمْ تَعْلَمْ	کیا نہیں تو جانتا	أَنَّ اللَّهَ	کہ بیشک اللہ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ	ہر شے پر	قَدِيرٌ ﴿۱۶﴾	خوب قدرت والا ہے۔

نسخ کا معنی ہے بعد میں آنے والے حکم کے ساتھ پہلے کسی حکم کو ختم کر دینا، جیسے پہلے بیت المقدس قبلہ مقرر ہوا، پھر بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا اور جیسے ہماری شریعت میں پہلی

شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ کر دیے گئے۔ یہودی نسخ کے منکر تھے، اسی لیے انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جھٹلایا کہ انھوں نے تورات کے بعض احکام کیوں منسوخ کیے۔ قرآن پر بھی انھوں نے اعتراض کیا کہ جب پہلا حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اور درست تھا تو وہ منسوخ کیوں ہوا؟

نسخ کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے حکم غلط تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم ایک مقررہ وقت تک نافذ تھا، بعد میں نئی حکمت کے تحت دوسرا حکم دیا گیا۔ یہ تبدیلی اللہ کے علم اور حکمت کے مطابق ہوتی ہے اور شریعت کی لچک کو ظاہر کرتی ہے۔

یعنی نسخ کا لغوی معنی ختم کرنا، زائل کرنا، یا بدل دینا ہے۔ اصطلاح میں، اس سے مراد کسی پہلے سے موجود شرعی حکم کو بعد میں آنے والے شرعی حکم کے ذریعے منسوخ (ختم) کرنا ہے۔ یہ عمل قرآن یا حدیث میں ایک حکم کی جگہ بہتر یا مناسب حکم لانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سابقہ حکم کو کسی بعد والی دلیل شرعی سے اٹھا دینا۔ (غازن، البرقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۰۶، ۱/۷۷) اور یہ حقیقت میں سابقہ حکم کی مدت کی انتہاء کا بیان ہوتا ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ قرآن کریم نے گزشتہ شریعتوں اور کتابوں کو منسوخ فرمایا تو کفار بڑی وحشت ہوئی اور انہوں نے اس پر اعتراضات کئے، اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ منسوخ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ناسخ بھی، دونوں عین حکمت ہیں اور ناسخ کبھی منسوخ سے زیادہ آسان اور نفع بخش ہوتا ہے لہذا قدرت الہی پر یقین رکھنے والے کو اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہیں۔ کائنات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دن سے رات کو، گرما سے سرما کو، جوانی سے بچپن کو، بیماری سے تندرستی کو، بہار سے خزاں کو منسوخ فرماتا ہے۔ یہ تمام نسخ و تبدیل اس کی قدرت کے دلائل ہیں تو ایک آیت اور ایک حکم کے منسوخ ہونے میں کیا تعجب؟ نسخ حقیقت میں سابقہ حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے کہ وہ حکم اس مدت کے لیے تھا اور اب وہ مدت پوری ہو گئی۔ صرف یہ تھا کہ ہمیں وہ مدت معلوم نہ تھی اور ناسخ کے آنے سے معلوم ہو گئی۔ کفار کا اعتراض تو جہالت و نا سمجھی کی وجہ سے تھا لیکن اہل کتاب کو تو کسی بھی صورت یہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت کے بہت سے احکام تو وہ بھی

منسوخ مانتے ہیں جیسے بہن بھائی کا آپس میں نکاح، یونہی یہودیوں سے پہلے ہفتہ کے دن دنیوی کام حرام نہ تھے، ان پر حرام ہوئے، نیز توریت میں ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کے لئے تمام جانور حلال تھے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بہت سے حرام کر دیئے گئے۔ ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے نسخ کا انکار کس طرح ممکن ہے۔

نسخ کے چند احکام

(۱)..... جس طرح کوئی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوتی ہے اسی طرح حدیث متواتر سے بھی آیت منسوخ ہوتی ہے۔

(۲)..... کبھی صرف تلاوت منسوخ ہوتی ہے اور کبھی صرف حکم منسوخ ہوتا ہے اور کبھی تلاوت و حکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں۔ یہی شریف میں ہے کہ ایک انصاری صحابی رات کو تہجد کے لیے اٹھے اور سورۃ فاتحہ کے بعد جو سورت ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے صبح کو دوسرے اصحاب سے اس کا ذکر کیا تو ان حضرات نے فرمایا: ہمارا بھی یہی حال ہے، وہ سورت ہمیں بھی یاد تھی اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی۔ سب نے بارگاہ رسالت میں واقعہ عرض کیا تو حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آج رات وہ سورت اٹھائی گئی۔ اس کے حکم و تلاوت دونوں منسوخ ہوئے جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی ان پر نقش تک باقی نہ رہے۔ (دلائل النبوة للبیہقی، باب ما جاء فی آیات القسْر آن۔۔ الخ، ۷ / ۱۵، ملخصاً)

نَآتٍ مِّنْ خَيْرٍ: ہم بہتر لے آئیں گے۔ فرمایا کہ ہم کسی آیت کو منسوخ فرما دیں یا بھلا دیں تو اس کی جگہ زیادہ آسان اور زیادہ ثواب والا یا کم از کم پہلے والے حکم کے برابر حکم لے آئیں گے۔ پہلے سے زیادہ سہولت والے کی مثال ہے جیسے پہلے دس گنا تک کے لشکر سے جہاد کا حکم تھا پھر صرف دو گنا تک کے لشکر سے جہاد میں ڈٹے رہنے کا حکم نازل ہوا۔ زیادہ ثواب کی مثال ہے جیسے پہلے ایک قول کے مطابق روزے کی طاقت رکھنے والے کو بھی فدیہ دینے کی اجازت تھی لیکن بعد میں اس پر

روزے کا حکم ہی متعین کر دیا جو فدیہ سے زیادہ ثواب والا حکم ہے۔ سہولت میں برابر کے حکم کی مثال ہے جیسے بیت المقدس سے پھیر کر خانہ کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا حالانکہ دونوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں برابر درجے کی سہولت ہے۔

مختلف شرائع میں بعض اختلافات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا البتہ مختلف شرائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں، مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا ہماری شریعت میں حلال ہے۔ کسی شریعت میں دو سگی بہنیں ایک نکاح میں آسکتی تھیں ہمارے ہاں حرام ہے وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ۔ البتہ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں ہوئے۔ تنسیخ آیات کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے، کہ تکوینی امور میں جوں جوں حالات بدلتے ہیں احکام بھی بدلتے رہتے ہیں جب انسان بچہ ہوتا ہے تو اس کی ضروریات اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں جب جوان ہوتا ہے، تو اس پر دوسرے احکام نافذ ہوتے ہیں پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اقوام عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں، یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

کثرت سوالات کی ممانعت / حسد بدترین بیماری ہے

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
 أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ مِن
 وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۵۰ أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِن
 قَبْلُ ۖ وَمَن يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝۵۱ وَكَثِيرٌ مِّنْ
 أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۝۵۲ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ
 أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرٍ ۝۵۳
 إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۵۴

شرعی قانون میں بھی تبدیلی

أَلَمْ تَعْلَمْ	کیا تو نہیں جانتا	أَنَّ اللّٰهَ	کہ بیشک اللہ	لَهُ	اس کے لئے
مُلْكُ	بادشاہت ہے	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کی	وَالْأَرْضِ	اور زمین کی
وَمَا	اور نہیں	لَكُمْ	تمہارے لئے	مِّنْ دُونِ اللّٰهِ	اللہ کے سوا
مِّنْ وَلِيٍّ	کوئی دوست	وَلَا	اور نہ کوئی	نَصِيرٌ ۝۵۰	مددگار۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنے ملک
 میں جو چاہے جب چاہے قانون جاری کرے، جب کائنات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، دن جاتا ہے

رات آتی ہے اور سارے جہان میں ہر طرح تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو شرعی قانون میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے اور یہ تبدیلی مخلوق کی مصلحت کی وجہ سے ہے۔ جب وہ مالک الملک ہے، تو کیا اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے، معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے، اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا، لہذا وہ تنسیخ احکام پر پوری طرح قادر ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ فرمایا یاد رکھو! کہیں بھٹک نہ جانا وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۰﴾۔ اس کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے، ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے امام بیضاوی رحمہ اللہ (تفسیر بیضاوی ص 72-30) فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا، مگر نصیر وہ ہوتا ہے جو فی الواقع مدد کے قابل ہو، دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی وہ ہوتا ہے جو ربانی طور پر مدد کرتا ہے، اور نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو، گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے وہ قادر مطلق بھی ہے اور علیم کل بھی ہے جو نہ حکم چاہے، نافذ کر دے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مغل نہیں ہو سکتا، وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے اور اپنی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے اس پر اعتراض نامناسب ہے۔

یہود کا اسلام سے متنفر کرنے کا ایک اور طریقہ

یہ کہ تم سوال کرو	أَنْ تَسْأَلُوا	کیا تم چاہتے ہو	أَمْ تُرِيدُونَ
سوال کئے گئے	سُئِلَ	جس طرح	رَسُوْلُكُمْ
اپنے رسول سے	کَمَا	کیا تم چاہتے ہو	أَمْ تُرِيدُونَ
موسیٰ	مُوسَىٰ	موسیٰ	مُوسَىٰ
وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ	اور جو اختیار کر لے کفر	بِالْإِيمَانِ	ایمان کے بدلے
فَقَدْ ضَلَّ	تو تحقیق وہ بھٹک گیا	سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۱﴾	سیدھے راستے سے۔

اسلام سے متنفر کرنے کا ایک اور طریقہ جو یہود نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ موشگافیاں کر کے طرح

طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے اور انہیں کہتے کہ اپنے نبی سے یہ بات بھی پوچھ کر بتاؤ اور وہ بھی اور یہ بھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ یہود کی تو عادت ہی یہ رہی ہے انہوں نے تو موسیٰ (علیہ السلام) کو مسلسل سوالات اور مطالبے کر کے تنگ کر دیا تھا۔ اس طرح کی موٹگافیاں کافرانہ روش ہے اور یہ کام ایسے لوگ کرتے ہیں جو اطاعت و فرمانبرداری پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بارہا متنبہ فرمایا کہ قیل وقال اور بال کی کھال اتارنے کی وجہ سے پچھلی امتیں تباہ ہوئیں۔ لہذا تم ایسی باتوں سے پرہیز کرو اور جن باتوں کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان میں خواہ مخواہ کرید نہ کرو۔ یہود حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے ہودہ سوالات بھی کرتے اور نامناسب مطالبات بھی، اس آیت میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا کہ جیسے تم یہودیوں کا دیکھا دیکھی اپنی سادگی اور سادہ لوحی میں حضور اقدس حضور ﷺ کو راعنا کہہ کر مخاطب کرنے لگے، ایسا نہ ہو کہ انہیں کی طرح پیغمبر سے سوالات اور مطالبے بھی شروع کر دو، یہودیوں کو قرآن مجید کے الفاظ و احکام میں نسخ کے واقع ہونے پر بھی اعتراض تھا، تو ایسا نہ ہو کہ ان کے بے جا اعتراضات و شبہات کا تم بھی شکار ہو جاؤ؛ کیوں کہ وہ چاہتے ہی ہیں کہ تم کو دین کی نعمت سے محروم کر دیں، اس تشریح کے مطابق اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں، زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے۔ یعنی مشرف بہ ایمان ہونے کے بعد رسول کی شان میں کوئی گستاخی یا اعتراض کر گیا، تو یہ راہ راست پا کر پھر اس سے محروم ہو جانا ہے۔

بے مقصد اور فضول سوالات سے بچو

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر 152- ج 1) کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بہت کم سوال کیا کرتے تھے، کیونکہ سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سوال سے منع فرمادیا۔ لَا تَسْأَلُوْا عَنْ اَشْيَاءٍ اِنْ تُبَدَّلَ لَكُمْ تَسْأَلُوْكُمْ۔ وَاِنْ تَسْأَلُوْا عَنْهُمْ اَحْيٰنَ يُنْزِلَ الْقُرْآنُ تُبَدَّلَ لَكُمْ۔ یعنی نزول وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو اگر بعض چیزوں کے متعلق سوال کرو گے تو وہ ظاہر کر دیا جائے گا اور تم کو

ناگوار گزرے گا تمہارے لیے بدنامی کا باعث ہوگا، اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کثرت سوال سے اجتناب کرتے تھے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں، اور اگر تم اس وقت پوچھو گے جب قرآن نازل ہو رہا ہے، تو وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بہت سی چیزوں کو مباح (جائز) رکھا ہے یا ان کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر ان خود کھود کرید کر کے ان کے بارے میں ایسے احکامات پوچھ لے جو سختی پر مبنی ہوں، تو وہ خود اپنے لیے ننگی کا باعث بن سکتے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی کا بیان ہے وہ فرماتے ہیں کہ (تفسیر ابن کثیر ص 30) کہ میں نے اصحاب محمد ﷺ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی، وہ حضور ﷺ سے سوال نہیں کیا کرتے تھے، ایسا کرنے سے ڈرتے تھے، ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اعرابی سوال کرے تو وہ بھی مستفید ہوں، خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے، قرآن پاک میں کل بارہ (12) سوالات کا ذکر آتا ہے، جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے حضور ﷺ سے کیے، ان میں ”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ“ اور ”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى“۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ“ وغیرہ ایسے سوالات شامل ہیں، حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے (2) (مسلم ص 262 ج 2) اے لوگو! فضول اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو، کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں ”کثرت سوال کی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے، لہذا کثرت سوال سے بچو۔“

کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے سوال کرنے کی ممانعت نہیں

ہاں! کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں، زیادہ سوال کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گذرے یا بدنامی کا باعث ہو، اکثر سوال محض نکتہ چینی یا اذراسانی کے لیے کیے جاتے ہیں اس لیے منع کیا کہ اے اہل ایمان! تم یہودی روش پر نہ چلتا اور کثرت سوال سے اپنے آپ کو

بچانا۔ مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اہل کتاب مسلمانوں کو اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو! اور اس سے ان کا مقصد فتنہ پردازی ہوتا تھا اہل ایمان کو یہ بھی نصیحت ہے، کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں، پہلے گزر چکا ہے کہ یہ لوگ سحر کرتے تھے، اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں شبہ ڈالنا مقصود تھا، تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں، ان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے بے معنی سوال نہ پوچھا کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی صحیح مقصد کے بغیر سوال کرنا ممنوع ہے نیز فضول سوال کرنا بھی ممنوع ہے۔ لہذا عوام الناس کو چاہئے کہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ علماء اور مفتیانِ کرام سے وہی سوال کئے جائیں جن کی حاجت ہو، زمین پر بیٹھ کر خواہ مخواہ چاند پر ہائش کے سوال نہ کئے جائیں۔ بعض لوگ علماء کو پریشان کرنے یا ان کا امتحان لینے یا ان کی لاعلمی ظاہر کرنے کیلئے سوال کرتے ہیں، یہ سب ناجائز ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”میں تمہیں جس کام سے منع کروں اس سے رک جاؤ اور جس کام کا حکم دوں اسے اپنی طاقت کے مطابق کرو، تم سے پہلے لوگوں کو محض ان کے سوالات کی کثرت اور اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے اختلاف کرنے نے ہلاک کیا۔ (مسلم، کتاب الفضائل، باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۱۲۸۲، الحدیث: ۱۳۰) (۱۳۳۷) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسئلہ معلوم کر کے عمل کرنے کی بجائے خواہ مخواہ بال کی کھال اتارتے رہنا اور اپنے من پسند حکم کا مطالبہ کرنا یہودیوں اور مشرکوں کا طریقہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں بھی لوگوں کی ایک تعداد ایسی ہے جن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ معاملات یا عبادات میں جو صورت انہیں درپیش ہے اس میں فتویٰ ان کی مرضی اور پسند کے عین مطابق ملے اور اگر انہیں کہیں سے کوئی ایک ایسی دلیل مل جاتی ہے جو ان کے مقصد و مفاد کو پورا کر رہی ہوتی ہے تو وہ اسی پر اڑ جاتے ہیں اگرچہ اس کے خلاف ہزار دلائل موجود ہوں لیکن وہ چونکہ ان کی مراد کے خلاف ہوتے ہیں اس لئے انہیں قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کے بارے میں طرح طرح کی الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

یہودیوں کا مسلمانوں کے کفر و ارتداد کی متنا کرنا

وَدَّ كَثِيرٌ	چاہتے ہیں بہت سے	مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	اہل کتاب میں سے
لَوْ يَرُدُّونَكُمْ	کاش وہ لوٹا دیں تمہیں	مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	تمہارے ایمان لانے کے بعد
كُفَّارًا	کفر کی حالت میں	حَسَدًا	حسد (ہے)
مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ	ان کے دلوں کی طرف سے	مِّنْ بَعْدِ	(اس کے) بعد
مَا تَبَيَّنَ	جبکہ واضح ہو گیا	لَهُمُ الْحَقُّ	ان پر حق ہے
فَاعْفُوا	پس تم معاف کر دو	وَاصْفَحُوا	اور درگزر کر دو
يَأْتِي اللَّهُ	لائے اللہ	بِأَمْرِهِ	اپنا حکم
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر	قَدِيرٌ ②	قادر ہے۔

اسلام کی حقانیت جاننے کے بعد یہودیوں کا مسلمانوں کے کفر و ارتداد کی متنا کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ایمان سے محروم ہو جائیں حسد کی وجہ سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسد بہت بڑا عیب ہے اور اس کی وجہ سے انسان نہ صرف خود بھلائی سے رک جاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی بھلائی سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے لہذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس سے بچنے کی خوب کوشش کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”حسد سے دور رہو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو“ یا فرمایا: ”گھاس کو کھا جاتی ہے۔“ (ابوداؤد، باب فی الحسد، ۴/۳۷۱، الحدیث)

خفا کے نزدیک انسان فحاشی و بیجائی کے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتا

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکا لرا کا نام دیا جاتا ہے، انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی ﷺ پر بھی نکتہ چینی کی ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بظن ہو جائیں، گلیڈسٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں برملا کہا تھا کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی تلوار انسانیت کی

دشمن ہیں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے یہ دنیا مہذب نہیں بن سکتی، لہذا اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہوگی، اس کا مطلب یہی تھا کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو فحاشی سے روکتی ہے، اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی ان کفار کے نزدیک انسان فحاشی و بیحیائی کے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتا، لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے، کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے مٹا دیا جائے، مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھونے کی یہ خواہش آپ ﷺ کے عہد میں تو یہودیوں کو تھی ہی، آج تک وہ اسی سازش میں لگے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان کھل کر مرتد نہ ہوں تو کم سے کم ان میں تشکیک اور اپنے دین کی تین بے اعتمادی و بے اعتباری پیدا کر دی جائے، مستشرقین کی تمام مساعی کا خلاصہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ قرآن مجید نے متنبہ کر دیا کہ مسلمان ہمیشہ اس سازش کے بارے میں اپنے کان کھڑے رکھیں اور ان کے مکرو فریب سے اپنا دامن بچائے رکھیں۔

نماز ادا کرنے کے آداب و احکام / نیکی کا بدلہ نیکی / رجا اور اُمْنِیَّہ کی تحقیق و تفسیر

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ○
وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۖ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ
اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ
نَصْرَى ۚ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ بَلَى ۚ مَنْ
أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝

نماز اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ	اور تم قائم کرو نماز	وَآتُوا الزَّكَاةَ	اور تم ادا کرو زکوٰۃ
وَمَا تُقَدِّمُوا	اور جو آگے بھیجو گے	لِأَنفُسِكُمْ	اپنے نفسوں کیلئے
مِّنْ خَيْرٍ	کوئی بھلائی	تَجِدُوهُ	تم اسے پا لو گے
عِنْدَ اللَّهِ	اللہ کے پاس	تَعْمَلُونَ	تم عمل کرتے ہو
إِنَّ اللَّهَ	بیشک اللہ	بِمَا	جو کچھ
بَصِيرٌ ۝	خوب دیکھنے والا ہے۔		

نماز دین اسلام کی سب سے اہم عبادتوں میں سے ایک ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: **وَأَقِمْوُا الصَّلَاةَ**۔ مفسرین نے اس حکم کی مختلف جہات سے وضاحت کی ہے۔ **وَأَقِمْوُا الصَّلَاةَ** کا مطلب ہے: ”نماز کو اس کے پورے ارکان، شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرو، بعض مفسرین نے نماز کے صحیح قیام کو یوں بیان کیا ہے: ”اسے وقت پر ادا کرنا، خشوع کے ساتھ ادا کرنا، ارکان کی تکمیل کرنا اور مسلسل اسے قائم رکھنا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز قائم کرنے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: یعنی ”نماز کو قائم کرنا اس کے رکوع، سجود، تلاوت، خشوع اور پوری توجہ کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ علمائے کرام کے مطابق نماز نہ صرف بندے اور پروردگار کے درمیان ایک مضبوط تعلق کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تمام نیکیوں کو اپنے اندر سموتے ہوئے ہے۔ ابو منصور ماتریدی کے مطابق نماز میں بندگی اور عاجزی کی معراج ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ نماز میں بندہ ”اللہ کے لئے کامل خضوع اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، نماز کی شرعی حیثیت بھی واضح ہے۔ یہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے اور دین کی بنیادوں میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو ایمان اور کفر کے درمیان حد فاصل قرار دیا ہے۔ نماز کے ظاہری اور باطنی آداب دونوں اہم ہیں؛ ظاہری آداب میں طہارت، قبلہ رخ ہونا، وقت کی پابندی اور ارکان کی درست ادائیگی شامل ہے، جبکہ باطنی آداب میں خشوع، اللہ کی یاد اور دل کی حاضری شامل ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور نماز ادا کرنا فرض ہے اسی طرح ہر نمازی پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ نماز کی ادائیگی کے دوران قرآن و سنت کے احکام کی پابندی کرے۔ صلوٰۃ (نماز) کے معنی ہیں: کسی کی جانب رخ کر کے آگے بڑھنا، اس کے قریب ہو جانا اور دعاء کرنا

نماز کی لفظی و معنوی حقیقت

لہذا نماز کی لفظی و معنوی حقیقت تین نکات پر مشتمل ہے۔ ۱:- یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں شعوری طور پر بڑھ کر حاضر ہو جانا۔ ۲:- اللہ تعالیٰ کے حضور ہمتن متوجہ ہو جانا۔ ۳:- اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو جانا۔ نماز کے ان تینوں بنیادی لوازمات کے ساتھ نماز میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے طریقے

کے لئے قرآن و سنت کے احکام کی پابندی بھی لازم و واجب ہے۔ ”قَوِّلْ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ“ (الماعون: ۴) ”پس تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غفلت (عدم توجہی) برتتے ہیں۔“ یہ قرآنی فرمان انتہائی عبرت انگیز اور عبرت آموز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقررہ آداب و احکام سے غفلت والی نمازیں بیکار ہی نہیں بلکہ نمازیوں کے لئے باعث تباہی بھی ہیں مثلاً: نمازوں میں غفلت اس بات سے کہ اللہ کے حضور حاضر بھی ہیں اور اس سے مخاطب بھی ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔ غفلت اس بات سے کہ اپنے رب سے بہت کچھ مانگ رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کیا مانگ رہے ہیں۔ غفلت اس بات سے کہ اللہ کے روبرو عہد و پیمان تو باندھ رہے ہیں لیکن اس کے معنی و مفہوم سے بے خبر ہیں۔ پھر غفلت اس بات سے بھی کہ اپنے آقا کے سامنے مجسم سرنگوں اور سر بسجود تو ہیں مگر خود سپردگی کی اصل روح سے محروم ہیں۔ مختصر آئیہ کہ ایسی بے جان اور بے روح نمازیں جو غفلت اور لاپرواہی سے ادا کی جاتی ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور توہین کے مترادف ہو جاتی ہے اور بالآخر تباہی کا باعث بن جاتی ہے اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اپنی نمازوں کا جائزہ لیا جائے پھر جتنی کمی یا کسر پائی جائے اسے پورا کرنے کی کوشش فوراً شروع کی جائے تاکہ رفتہ رفتہ حق نماز پورا ادا کیا جائے صرف اس طرح ہی سارے مومنین اس دینی اور دنیوی کامیابی کے حقدار ہو سکیں گے۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن

فرمایا: وَأَتُوا الزَّكَاةَ: زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے اور دین اسلام کی بنیادی عبادات میں سے ایک اہم مالی عبادت ہے۔ کتب فقہ و حدیث میں اس کی عظمت، فرضیت اور حکمت کو بڑے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بارہا نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا، یہاں تک کہ بعض اہل علم کے مطابق یہ دونوں عبادتیں قرآن میں ”بیاسی مقامات“ میں اکٹھے آئی ہیں، قرآن میں بھی زکوٰۃ کا مقصد واضح کیا گیا ہے، جیسا کہ آیت مبارکہ میں ارشاد ہے: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ۔ یعنی زکوٰۃ انسان کے مال اور نفس دونوں کو پاک

کرتی ہے۔ اسی لیے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ مال میں برکت اور اضافہ کا ذریعہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ زکوٰۃ اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ انسان کے مال اور نفس کو پاک کرتی ہے۔ معاشرے سے غربت کم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ مسلمانوں میں محبت، تعاون اور عدل کو مضبوط کرتی ہے۔ مال میں برکت اور اللہ کی رضا کا سبب بنتی ہے زکوٰۃ کا صحیح فہم اور اس کی باقاعدہ ادائیگی ایک مسلمان کی دینی ذمہ داری بھی ہے اور اجتماعی بھلائی کا ذریعہ بھی۔ اس آیت میں اہل کتاب کی طرف سے چوکس رہنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کاربند رہنے کی تلقین بھی فرمائی **وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ** نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو، تمہاری طاقت کا منبع یہی دو چیزیں ہیں، انہیں مضبوطی سے تھام لو، تمہاری تمام تر قوت کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے، اور نماز زکوٰۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں، اسے وقت پر ادا کرتے رہو، اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرو، بخل جیسی، قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے، اسے کبھی نظر انداز نہ کرو، غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی، لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے صلوٰۃ و زکوٰۃ ہے، انہیں کے ذریعے، اندر ایمان اور روحانیت پیدا ہوگی تعلق باللہ قائم ہوگا جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت و حماقت ہے

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	لَنْ يَدْخُلَ	ہرگز نہیں داخل ہوگا	الْجَنَّةَ	جنت میں
إِلَّا مَنْ كَانَ	سوائے جو ہو	هُودًا	یہودی	أَوْ نَصْرَى	یا نصرانی
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ	یہ ان کی تمنائیں ہیں	قُلْ	آپ کہہ دیجئے		
هَآؤُنَا	تم لاؤ	بُؤْهَانَكُمْ	اپنی دلیل	إِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم
صِدِّقِينَ ③			سچے۔		

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ: ہرگز جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ یہودی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور عیسائی کہتے تھے کہ صرف وہی جنت میں داخل ہوں گے۔

یہ گفتگو مسلمانوں کو بہکانے کے لئے تھی، ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا کہ ان کی یہ بات ان کی اپنی رائے سے ہے، توریت و انجیل میں ایسا کچھ نہیں فرمایا گیا، اگر وہ سچے ہیں تو اپنی اس بات پر کوئی دلیل لائیں۔

أَمَّا زَيْبُهُمْ: ان کی من گھڑت تمنائیں۔ بغیر کسی بنیاد کے جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت و حماقت ہے۔ ایک امید ہے جسے عربی میں ”رجا“ کہتے ہیں اور ایک نام خیالی ہے جسے عربی میں ”أُمْنِيَّةٌ“ کہتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس موضوع پر بڑا پیارا کلام ارشاد فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: رجاء یعنی امید دل کی اس راحت کا نام ہے جو محبوب چیز کے انتظار سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ محبوب جس کی توقع کی جا رہی ہے اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے لہذا اگر اس کا انتظار اکثر اسباب کے ساتھ ہے تو اسے ”رجا“ یعنی امید کہتے ہیں اور اگر اسباب بالکل نہ ہوں یا اضطراب کے ساتھ ہوں تو اسے امید نہیں بلکہ دھوکہ اور بیوقوفی کہا جائے گا اور اگر اسباب کے ہونے یا نہ ہونے کا علم نہ ہو تو اس انتظار کو ”تمنا“ کہتے ہیں۔ اہل دل حضرات جانتے ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دل زمین کی طرح ہے، ایمان اس میں بیج کی حیثیت رکھتا ہے اور عبادت زمین کو الٹ پلٹ کرنے، صاف کرنے اور نہریں کھودنے اور ان زمینوں میں پانی جاری کرنے کی طرح ہیں اور دل جو دنیا میں غرق اور ڈوبا ہوا ہے اس بنجر زمین کی طرح ہے جس میں بیج کوئی پھل نہیں لاتا اور قیامت کا دن فصل کاٹنے کا دن ہے اور ہر شخص وہی کاٹے گا جو اس نے بویا ہو گا اور کھیتی کا بڑھنا ایمان کے بیج کے بغیر ناممکن ہے اور جب دل میں خباثت اور برے اخلاق ہوں تو ایمان بہت کم نفع دیتا ہے جیسے بنجر زمین میں بیج سے فصل پیدا نہیں ہوتی تو مناسب یہی ہے کہ آدمی کے مغفرت کی امید رکھنے کو کھیتی والے پر قیاس کیا جائے یعنی جو شخص اچھی زمین حاصل کرتا ہے اور اس میں عمدہ بیج ڈالتا ہے جو نہ تو خراب ہوتا ہے اور نہ ہی بدبودار اور پھر اس کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ ضروریات سے مراد وقت پر پانی دینا، زمین کو کانٹوں اور گھاس پھوس نیز ان تمام خسرانیوں سے پاک کرنا جو بیج کو بڑھنے سے روکتی ہیں یا خراب کر دیتی ہیں۔ تو جو یہ سب کام کرے پھر اللہ تعالیٰ

کے فضل کا منتظر ہو کر بیٹھ جائے کہ وہ زمین کو بجلی کی گرج اور دیگر آفات سے بچائے گا یہاں تک کہ کھیتی اپنی تکمیل کو پہنچ جائے تو اس انتظار کو رجا یعنی امید کہتے ہیں اور اگر سخت زمین میں بیج ڈالے جو شور زدہ ہو اور بلندی پر ہو جس تک پانی نہیں پہنچ سکتا اور بیج کی پروا بھی نہ کرے اور پھر اس کے کٹنے کا انتظار کرے تو اس انتظار کو بیوقوفی اور دھوکہ کہتے ہیں امید نہیں کہتے اور اگر اچھی زمین میں بیج ڈالا لیکن اس میں پانی نہیں ہے اب وہ بارش کے انتظار میں ہے اور یہ ایسا وقت ہے جس میں عام طور پر بارش نہیں برستی تو اس انتظار کو تمنا کہتے ہیں ”رجا“ نہیں کہتے تو گویا رجا کا لفظ کسی ایسی پسندیدہ چیز کے انتظار پر صادق آتا ہے جس کے لئے وہ تمام اسباب تیار کر دئیے گئے ہوں جو بندے کے اختیار میں ہیں، صرف وہی اسباب باقی رہ گئے جو بندے کے اختیار میں نہیں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کی وجہ سے تمام نقصان دہ اور فاسد کرنے والے اسباب کھیتی سے دور ہو جاتے ہیں پس جب بندہ ایمان کا بیج ڈالتا ہے اور اس کو عبادات کا پانی پلاتا ہے، دل کو بد اخلاقی کے کانٹوں سے پاک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کا مرتے دم تک منتظر رہتا ہے، مغفرت تک پہنچانے والے اچھے خاتے کا انتظار کرتا ہے تو یہ انتظار حقیقی رجا (امید) ہے یہ ذاتی طور پر قابل تعریف ہے اور اگر ایمان کے بیج کو عبادات کا پانی نہ دیا جائے یا دل کو برے اخلاق سے ملوث چھوڑ دیا جائے اور دنیاوی لذت میں منہمک ہو جائے اور پھر مغفرت کا انتظار کرے تو اس کا انتظار ایک بیوقوف اور دھوکے میں مبتلا شخص کا انتظار ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”أَلَا حَقُّ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هُوَ آهًا وَتَمَتُّعًا عَلَى اللَّهِ الْإِمَانُ“ بے وقوف وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے لاتا ہے اور (اس کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کرتا ہے (کہ وہ بڑا کریم اور غفور و رحیم ہے، اس سے اور اس کے اعمال سے بے پروا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اسے کوئی سزا نہیں دے گا بلکہ جنت میں داخل کر دے گا اور وہ اس کی من چاہی چیزیں اسے دے گا)۔

آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اصول

بکلی	ہاں کیوں نہیں	مَنْ أَسْلَمَ	جس نے جھکا دیا	وَجْهَهُ	اپنا چہرہ
------	---------------	---------------	----------------	----------	-----------

لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	وَهُوَ	اور وہ	مُحْسِنٌ	نیک کرنے والا (ہو)
فَلَهُ	تو اس کے لئے	أَجْرُهُ	اس کا اجر	عِنْدَ رَبِّهِ	اس کے پاس ہے
عَلَيْهِمْ	ان پر	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يُخْزَنُونَ ۝۲۷	غمگین ہوں گے۔

یعنی جنت میں جانے کے لیے کسی گروہ کافر نہ ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دے، چہرہ تابع ہو گیا تو پورا جسم تابع ہو گیا، پھر جو عمل کرے اسی کے لیے کرے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ عمل حسن (یعنی نیک) ہو، اس کی طرف اشارہ ”وَهُوَ مُحْسِنٌ“ کے ساتھ ہے۔ نیک عمل وہی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو۔

پہلی شرط نہ ہوگی تو منافقت اور ریاکاری ہے، دوسری نہ ہوگی تو بدعت اور گمراہی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی اور جنت میں جبکہ پانے کا اصول بیان فرما دیا کہ جو بھی اخلاص کے ساتھ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، وہ جنت میں جائے گا، اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے، یہودی حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہیں لائے اور عیسائی پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہیں لائے، تو اب اسلام کے آنے کے بعد نہ یہودیّت میں نجات باقی رہی نہ عیسائیت میں، نیز ایمان میں اخلاص، بھی ضروری ہے؛ اس لئے منافقین کا ایمان بھی معتبر نہیں کہ یہ اخلاص سے خالی اور محض دیکھا وے کے طور پر ہے، گویا اب اخلاص کے ساتھ مسلمان ہونا ہی جنت میں جانے کی کلید اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے۔

یہود و نصاریٰ آمنے سامنے / بڑا ظالم کون ہے؟ / مسجد کے آداب

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَى عَلَى شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ النَّصْرَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَى شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ
قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۖ وَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا
كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُولَّوْا فَثَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ ۚ إِنَّ
اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

تین گمراہ کن فرقے

وَقَالَتِ	اور کہا	الْيَهُودُ	یہودیوں نے	لَيْسَتِ	نہیں
النَّصَارَى	نصاری	عَلَى شَيْءٍ	کسی چیز پر	وَقَالَتِ	اور کہا
النَّصَارَى	نصاری نے	لَيْسَتِ	نہیں ہیں	الْيَهُودُ	یہودی
عَلَى شَيْءٍ	کسی چیز پر	وَهُمْ	حالانکہ وہ	يَتَّبِعُونَ	پڑھتے ہیں
الْكِتَابِ	کتاب	كَذَلِكَ	اسی طرح	قَالَ الَّذِينَ	کہا (ان لوگوں نے) جو

لَا يَعْلَمُونَ	علم نہیں رکھتے	مِثْلَ قَوْلِهِمْ	ان جیسی بات
فَاللَّهُ	تَوَالِدُ	يَحْكُمُ	وہ فیصلہ کرے گا
بَيِّنَهُمْ	ان کے درمیان	جس میں	کَاثُورًا
وہ تھے	قیامت کے دن	قِيَمًا	اختلاف کرتے۔
يَوْمَ الْقِيَامَةِ	اس میں	يَخْتَلِفُونَ ③	

تورات میں مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا ذکر موجود تھا اور یہودی اسے پڑھتے اور جانتے تھے، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا ذکر اور تورات پر عمل کا حکم موجود تھا اور نصاریٰ اسے پڑھتے اور جانتے تھے، مگر تعصب اور ضد میں آکر ہر ایک نے دوسرے کے بارے میں کہا کہ وہ سرے سے کسی بھی چیز پر نہیں۔ افسوس! مسلمان بھی جب فرقوں میں تقسیم ہوئے تو ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرے فرقے کی بات قرآن و سنت کے مطابق ہے، اسے غلط اور اپنے فرقے کی بات کو غلط جانتے ہوئے بھی درست قرار دیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

لَا يَعْلَمُونَ: علم سے مراد وحی کا علم ہے اور اس سے مراد مشرکین عرب ہیں جو وحی الہی کا کچھ علم نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ اگرچہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ تاہم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا پیروکار سمجھتے تھے، نماز، روزہ، اپنے دستور کے مطابق بجالاتے تھے صدقات و خیرات کرتے تھے، حج کرتے تھے، حاجیوں کی خدمت کرتے اور انکے لیے پانی کا بندوبست کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ تمام لوگ جو آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہیں، اس میں شامل ہیں، مثلاً دھریے اور بت پرست وغیرہ، ان سب نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے سوا سب کو سرے ہی سے غلط قرار دیا۔ آخرت کے فیصلہ سے مراد ثواب و عذاب ہے، ورنہ حق و باطل کا فیصلہ تو دنیا میں ہو چکا ہے، اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبروں کو بھیجا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ فرمایا، اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ تینوں فرقے یعنی یہود نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں یہ خود سارے کے سارے گمراہ ہیں، یہودیوں نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کو ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا اور جب

قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے، تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے علماء بھی ہوں گے اور پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ماننے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے اور اس کو مسیح سمجھیں گے یہی لوگ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پر لٹکانے کیلئے لے گئے، ان کم بختوں کا یہ حال ہے یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو بتا دے گا کہ دین میں گمراہی کے کون کون سے امور تم نے شامل کر رکھے تھے گو آج بحث اور مناظروں سے کوئی فرقہ بھی اپنی گمراہی تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں ہے۔

اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کو ویران کرنے والے

وَمَنْ	اور کون	أَظْلَمَ	بڑا ظالم ہے	مَنْ مَنَعَ	اُس سے جو روکے
مَسَاجِدَ اللَّهِ	اللہ کی مسجدوں سے	أَنْ	یہ کہ	يُنْكَرُ	ذکر کیا جائے
فِيهَا	اُن میں	اسْمُهُ	اس کا نام	وَسَخَى	اور وہ کوشش کرے
فِي خَرَابِهَا	اُن کو ویران کرنے میں	أُولَئِكَ	یہی (لوگ ہیں)		
مَا كَانَ	نہیں تھا	لَهُمْ	ان کے لئے	أَنْ يَدْخُلُوهَا	یہ کہ وہاں داخل ہوتے
إِلَّا	مگر	خَائِفِينَ	ڈرتے ہوئے	لَهُمْ	ان کے لئے
فِي الدُّنْيَا	دنیا میں	خِزْيٌ	رسوائی ہے	وَلَهُمْ	اور ان کے لئے
فِي الْآخِرَةِ	آخرت میں	عَذَابٌ عَظِيمٌ	بڑا عذاب ہے (114)		

جب نصاریٰ یہود پر غالب ہوئے تو انہوں نے یہود کو بیت المقدس میں داخل ہونے اور عبادت کرنے سے روک دیا تھا اور دور نبوی ﷺ میں مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو کعبہ میں نماز ادا کرنے سے روکتے رہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عمرہ سے روک دیا۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کی بربادی کے درپے ہوئے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو قطعاً گوارا نہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد مشرکین مکہ کی یہ پابندی ختم ہوئی اور بیت المقدس کو عہد فاروقی میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے آزاد کرالیا۔ اللہ تعالیٰ کا اس حکم سے منشا یہ

ہے کہ عبادت گاہوں کے متولی خالصتاً اللہ تعالیٰ کی پرستش کرنے والے اور اسی سے ڈرنے والے ہونے چاہئیں تاکہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں تو انہیں خوف ہو کہ اگر شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے۔ اپنے گروہ کو حق پر اور اپنے سوا سب کو غلط قرار دینے والے یہ سب لوگ غور کریں کہ ظلم کے ناجائز ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام مشرکین مکہ نے کیا کہ مسلمانوں کو پہلے مکہ سے نکالا، پھر ان کا مکہ میں داخلہ حتیٰ کہ حج و عمرہ کے لیے آنا بند کر دیا۔ ان سے پہلے نصاریٰ کا ٹائٹلس کے زمانے میں بیت المقدس پر قبضہ ہوا تو انھوں نے یہودیوں کا داخلہ بیت المقدس میں بند کر دیا، یہ کیسی حق پرستی ہے؟ اَنْ يُّذْكَرَ: کہ ذکر کیا جائے۔ ذکر میں نماز، خطبہ، تسبیح، وعظ، ذکر مصطفیٰ ﷺ نعت شریف اور صاحبین کے حالات کا بیان سب داخل ہیں۔ ذکر اللہ کو منع کرنا ہر جگہ ہی برا ہے لیکن مسجدوں میں خصوصاً زیادہ برا ہے کہ وہ تو اسی کام کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مسجد کو کسی بھی طرح ویران کرنے والا ظالم ہے۔ بلا وجہ لوگوں کو مسجد میں آنے یا مسجد کی تعمیر سے روکنے والا، مسجد یا اس کے کسی حصے پر قبضہ کرنے والا، مسجد کو ذاتی استعمال میں لے لینے والا، مسجد کے کسی حصے کو مسجد سے خارج کرنے والا یہ سب لوگ اس آیت کی وعید میں داخل ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ جنبی (یعنی جس پر غسل فرض ہو)، منہ کی بدبو والے، لہسن پیاز وغیرہ بدبودار چیزوں کی بوجس کے منہ سے آ رہی ہو اسے روکنا اس میں داخل نہیں کہ یہ حقیقت میں مسجد سے تکلیف دہ یا نامناسب چیزوں کو دور کرنے کے حکم میں آتا ہے۔

اسی طرح اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی جگہ کے مسجد قرار پانے کے لئے اذن عام ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو اس میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہو، کسی کے لئے رکاوٹ نہ ہو؛ البتہ مسجد کی حفاظت و صیانت یا کسی خاص ضرورت و مصلحت کے تحت کچھ اوقات کے لئے مسجد میں بند رکھی جائیں، تو اس میں حرج نہیں، کہ اس کا مقصد اللہ کے ذکر سے منع کرنا نہیں ہے، بلکہ مسجد کی حفاظت و صیانت ہے۔ (اَلَا خَافِیْنِ) یعنی ایسے ظالم لوگوں کا اللہ کی مساجد کا متولی ہونا تو درکنار، ان کا تو داخلہ بھی ڈرتے ہوئے ہونا چاہیے کہ انھوں نے کوئی شرارت کی تو سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ ان کے لیے

دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوا، یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں نے اپنے کئے کی سزا پائی، کعبہ اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے قبضے میں آگئی۔

اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔

مسجد میں ادب و تعظیم اور خوفِ خدا کے ساتھ داخل ہونا چاہیے، نڈر و بیباک ہو کر اور آدابِ مسجد کو پامال کرتے ہوئے داخل ہونا مسلمان کا کام نہیں۔ **فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ**: دنیا میں رسوائی۔ بیت المقدس ویران کرنے والوں کو دنیا میں یہ رسوائی پہنچی کہ قتل کئے گئے، گرفتار ہوئے، حبلا وطن کئے گئے۔ خلافت فاروقی و عثمانی میں ملکِ شام ان کے قبضہ سے نکل گیا اور بیت المقدس سے ذلت کے ساتھ نکالے گئے۔ مسجدوں اور مسجدوں سے تعلق رکھنے والوں سے نفرت کرنے والوں کو یہ وعید اپنے پیش نظر رکھنی چاہیے۔ چونکہ مسجد میں اللہ کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان میں صرف اللہ کا نام لیا جائے، اس لیے تمام مشرکین کو مسجد حرام کے قریب آنے سے روک دیا گیا، خواہ وہ بت پرست ہوں یا عریض و مسیح پرست، کیونکہ وہ اکیلے اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اب مسلمانوں میں وہی پہلی قوموں والے مشرکانہ عقائد و اعمال پھیل گئے اور وہ بدعمل ہو کر جہاد چھوڑ بیٹھے، تو بیت المقدس پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ توحید و سنت اور جہاد فی سبیل اللہ پر گامزن فرمائے اور بیت المقدس کی تولیت کا شرف عطا فرمائے۔ جو لوگ خلوص نیت سے عبادت کے لیے مساجد میں داخل ہوں۔ انہیں کسی وقت بھی مساجد میں داخل ہونے سے روکنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔

اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی

مسجد اللہ کا گھر ہے، جہاں بندہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا ہے، ذکر و عبادت کرتا ہے اور سکون پاتا ہے۔ اسی وجہ سے علما نے مساجد کے لیے ایسے آداب بیان کیے ہیں جن کا مقصد ان مقدس مقامات کی حرمت، صفائی، وقار اور روحانیت کو برقرار رکھنا ہے۔ مسجد اللہ کا گھر اور انتہائی مقدس جگہ ہے، جس کے آداب میں پاکیزہ لباس، دائیں پاؤں سے داخل ہو کر دعا پڑھنا، بلند آواز سے گریز، خاموشی،

تختہ المسجد (دو نفل) ادا کرنا، بد بودار چیزیں (پیاز/لہسن) کھا کر نہ جانا، اور صفائی کا خیال رکھنا شامل ہے۔ مسجد کا احترام ایمان کا حصہ ہے۔ مسجد میں ہم احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں، لہذا لازم ہے کہ نہایت باادب رہیں۔ ہمتن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہیں۔ کوئی ممنوع کام نہ کریں یعنی دنیاوی معاملات، خرید و فروخت، ہنسی مذاق، شور و غل وغیرہ نہ کریں۔ بلند آواز سے دنیاوی بات چیت تو کسی طرح بھی مسجد کے شایان شان نہیں۔ اس سے نہ صرف اللہ و رسول ﷺ کی حکم عدولی ہوتی ہے بلکہ حاضرین مسجد کی عبادت میں خلل پڑتا ہے اور مسجد کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ رویہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی کے مترادف ہے۔

سمت کا تعین، مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی

وَلِلَّهِ	اور اللہ کے لیے	الْمَشْرِقُ	مشرق	وَالْمَغْرِبُ	اور مغرب
فَأَيُّهَا	پس جس طرف	تَوَلَّوْا	تم منہ کرو	فَقَمُّ	تو اس طرف
وَجْهَ اللَّهِ	اللہ کی ذات (ہے)	إِنَّ اللَّهَ	بیشک اللہ		
وَأَبْصَحَ	وسعت والا	عَلَيْكُمْ	بہت جاننے والا۔ (115)		

اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، بلکہ مسراد خاص صورتوں میں قبلہ کی پابندی ختم کرنا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ان ظالموں کا ذکر ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتے ہیں، یعنی ان ظالموں کی اللہ کی مسجدوں سے روکنے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کی عبادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے، ہوا انسان کو قبلہ کی طرف رخ کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو، دشمن کا خوف ہو یا قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جس طرف منہ کر کے نماز پڑ لے درست ہے۔ (سنن ابی داؤد "کِتَابُ صَلَوةِ الْفَرِّ") اس آیت میں بتلانا یہ مقصود ہے کہ کوئی بھی سمت اپنی ذات میں کسی تقدس کی حامل نہیں، کسی بھی جگہ یا کسی بھی سمت میں اگر کوئی تقدس آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے آتا ہے، مشرق و مغرب سب اللہ کی مخلوق اور اسی کی تابع فرمان ہیں، اللہ تعالیٰ کسی ایک جہت میں محدود نہیں وہ ہر جگہ

موجود ہے؛ چنانچہ وہ جس سمت کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے بندوں کا کام ہے کہ اسی حکم کی تعمیل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ ہو جہاں قبلے کی صحیح سمت پتہ نہ چل رہی ہو تو وہاں وہ اپنے اندازے سے جس سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز پڑھے گا اس کی نماز ہو جائے گی یہاں تک کہ اگر بعد میں پتہ چلے کہ جس رخ پر نماز پڑھی ہے وہ صحیح رخ نہیں تھا تب بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس شخص نے اپنی طاقت کے مطابق اللہ کے حکم کی تعمیل کر لی۔ مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی ہے۔ اگر آئندہ اللہ تعالیٰ دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے تو یہ بات نہ قابل تعجب ہونی چاہیے نہ قابل اعتراض۔

اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے / سُبْحَانَهُ کی تحقیق و تفسیر

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۚ سُبْحٰنَهُ ۚ بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ كُلُّ لَّهٗ
قَبِيْضُوْنَ ۝۱۱۱ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ۝۱۱۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يَكْلَمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِنَا اٰيَةٌ ۚ كَذٰلِكَ
قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ تَشٰبِهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۚ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰلِيَّتِ
لِقَوْمٍ يُؤْتُوْنَ ۝۱۱۸

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	اتَّخَذَ	بنالیا ہے	اللَّهُ	اللہ نے
وَلَدًا	بیٹا	سُبْحَانَهُ	وہ پاک ہے اس سے	بَلْ لَّهٗ	بلکہ اسی کے لیے ہے
مَا	جو	فِى السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں (ہے)	وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں ہے)
كُلُّ لَّهٗ	سب اسی کے لئے	قَابِضُوْنَ	فرمانبردار۔ (116)		

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے ان آیات میں ان کی ایک اور بدعتیہ
کا بیان ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے ”وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ اس غلط عقیدے میں
یہ تینوں گروہ شامل ہیں یعنی یہود، نصاریٰ اور مشرکین ”قَالُوا“ کی ضمیر ان تینوں کی طرف لوٹی ہے

یعنی یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ و السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کو خدا کا بیٹا مانا جبکہ مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدائی بیٹیاں قرار دیا جیسا کہ تینوں چیزیں قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”سُبْحٰنَہُ“ اللہ کی ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے، بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجہ سے معیوب ہے اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔ مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے معیوب نہیں کہ مخلوق عاجز ہے اسے اولاد کی ضرورت ہے، خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے محروم ہوتے ہیں، برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تو ”آئندہ“ ہے، اس کی صفت تو غنی ہے، وہ ”صمد“ ہے وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بری بات ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے اور پھر وہ بچے کی صورت میں ماں کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بہت قبیح حرکت ہے کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے ”سُبْحٰنَہُ“ سے یہی مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا کہ حضرت اللہ اکبر کا معنی تو ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ“۔ کا مطلب بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ”اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ“ کا معنی یہ ہے کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے حضرت سُبْحٰنَہُ کا مطلب آپ سمجھا دیں، آپ نے جواب دیا یہ کون سی مشکل بات ہے۔ ”سُبْحٰنَہُ اللہ“ ایک ایسا کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے کہ اس کلمے کے ساتھ میری تعریف کیا کرو،

الغرض، یہ چاروں کلمات یعنی ”اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ“۔ الحمد للہ اور سبحن اللہ“۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

زمین و آسمان کی ہر مخلوق خدا کی مملوک

دوسرے یہ کہ اللہ آسمان و زمین کا مالک ہے، جس میں عزیر، مسیح علیہما السلام اور فرشتے سب شامل ہیں۔ مالک اور مملوک باپ بیٹا کیسے ہو سکتے ہیں! بیٹا تو باپ کا مملوک بن بھی جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بیٹا سرکشی بھی کر سکتا ہے، جب کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب اللہ کے فرمان کے تابع ہیں، ان کا سانس بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں چلتا۔ ایک حدیث صحیح قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بنو آدم نے مجھے جھٹلایا اور گالی دی۔ اس کا جھٹلانا تو یہ ہے کہ میں اسے دوبارہ پیدا نہ کر سکوں گا اور اس کا گالی دینا یہ ہے جو اس نے میرے لیے بیوی اور بیٹا تجویز کیا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ اخلاص) الغرض! زمین و آسمان کی ہر مخلوق خدا کی مملوک اور ہر چیز اس کی ملکیت ہے خواہ انبیاء ہوں یا ملائکہ۔ خواہ اللہ کے نیک بندے اور دیگر اشیا۔ لہذا یہ سب خدا کے مملوک ہوئے تو پھر اس کے بیٹے کس طرح بن سکتے ہیں۔ نیز بیٹے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو محتاج ہو اور فانی ہوتا کہ اس کا نام زندہ رہے اور اس کا کوئی وارث ہو سکے تو اللہ تعالیٰ تو محتاج نہیں اور نہ وہ فانی ہے وہ زمین و آسمان کا تنہا مالک اور بادشاہ ہے۔ زمین و آسمان کے تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ”بَلِّ لَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“۔ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے گویا اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں ہے بلکہ مالک اور مملوک کی نسبت ہے اور پھر مالک بھی ایسا ہے جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں

”كُلُّ لَهٗ قَنِتُوْنَ“۔ سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں اس کے تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں وہ کسی کو بیمار کر دے، بیمار کو تندرست کر دے کسی پہ موت طاری کر دے، اس کے حکم کو کوئی نال نہیں سکتا کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری کرنا ہوگی، (اسلامی اور قرآنی اصطلاح میں تکوینی حکم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حتمی اور تخلیقی فیصلہ ہے جو کائنات کے نظام، پیدائش، موت اور طبی قوانین کو چلانے سے متعلق ہے، یہ حکم کائنات میں براہ راست نافذ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ فرماتا ہے تو تکوینی حکم کے تحت وہ چیز فوراً وجود میں آجاتی ہے) ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں جسے انسان نال سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، جہاد کرو، انسان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کر سکتا ہے سستی کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا جب موت کے فرشتے آجاتے ہیں تو پھر کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو نال سکے، خود مرنے والا اور اس کے سارے حمایتی دیکھتے، رہ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا تکوینی حکم پورا ہو جاتا ہے، گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر ہوا، اول یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے جو چاہے کرے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اس لیے اسے کسی نائب یا وارث کی ضرورت نہیں كُلُّ لَهٗ قَنِتُوْنَ۔ زمین و آسمان کی ساری مخلوق جن میں حضرت عزیر، حضرت مسیح اور ملائکہ کرام بھی شامل ہیں سب خدا کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔

بے پناہ قدرت، لامحدود اختیار اور مطلق حاکمیت

بَدِيعُ	پیدا کرنے والا	السَّمَاوَاتِ	آسمانوں	وَالْأَرْضِ	اور زمین کو
وَإِذَا	اور جب	قَضَىٰ	وہ فیصلہ کر لے	أَمْرًا	کسی کام کا
فَإِنَّمَا	تو بیشک	يَقُولُ	وہ کہتا ہے	لَهُ	اس کو
كُنْ	ہو جا	فَيَكُونُ	تو وہ ہو جاتا ہے۔ (117)		

بَدِيعُ بمعنی ”مُبْدِعُ“ یعنی ایسی چیز کو وجود میں لانے والا جس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہ ہو، نہ

اس کا وجود موجود ہو اور نہ کوئی نمونہ اور یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ محض سمجھانے کا طریقہ ہے، ورنہ اللہ کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے کسی کلمہ کے کہنے کے بھی محتاج نہیں جس چیز کا ارادہ فرماتے ہیں، وہ وجود میں آجاتی ہے۔ ”وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا“۔ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے ”فَمَا تَمَّا يَقُولُ لَهُ كُنْ“۔ تو وہ کہتا ہے ہو جا ”فَيَكُونُ“ پس وہ ہو جاتی ہے، یہ آیت مبارکہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت، الحمد و اختیار اور مطلق حاکمیت کو بیان کرتی ہیں کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ محض اس کے حکم اور ارادے کا محتاج ہے یہ کن ایسا لفظ ہے جس میں سرعت اور تیزی کا حکم پایا جاتا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کن فرماتے ہیں تو کسی چیز کے معرض وجود میں آنے کے لیے نہ کسی مادے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ڈیزائن مطلوب ہوتا ہے اور نہ کسی کاریگر یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے، دراصل یہ کن کا لفظ بھی محض تعبیر کے لیے ہے ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتے ہیں کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اور اس آیت سے اصل مراد یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شے کا ارادہ فرمائے اور وہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ قطعی طور پر نافذ ہوتا ہے اور کسی شے کو وجود میں لانے کیلئے اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی طرح محنت و مشقت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس چیز کے وجود کا ارادہ فرما لینا ہی کافی ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی کام میں کسی کا محتاج نہیں اور اللہ تعالیٰ کا مختلف کاموں کیلئے فرشتوں کو مقرر کرنا حکمت ہے حاجت نہیں۔

جاہل لوگوں کے مطالبات

وَقَالَ	اور کہا	الَّذِينَ	(اُن لوگوں نے) جو
لَا يَعْلَمُونَ	نہیں علم رکھتے	لَوْ لَا	کیوں نہیں
يُكَلِّمُنَا اللَّهُ	بات کرتا ہم سے اللہ	أَوْ تَأْتِينَا	یا (کیوں نہیں) آتی ہمارے پاس
آيَةً	کوئی نشانی	كَذَلِكَ	اسی طرح
قَالَ الَّذِينَ	کہا (تھا) (ان لوگوں نے) جو	مِنْ قَبْلِهِمْ	ان سے پہلے تھے

مَثَلُ قَوْلِهِمْ	مانند ان کے قول کے	تَشَابَهَتْ	ایک جیسے ہو گئے
قُلُوبُهُمْ	ان کے دل	قَدْ بَيَّنَّا	تحقیق ہم نے بیان کر دیں
الْأَيِّتِ	نشانیوں	لِقَوْمٍ	قوم کے لئے
		يُوقِنُونَ ﴿١٨﴾	(جو) یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ یہودیوں نے حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے کہا کہ اگر آپ اپنے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ سے فرمائیے کہ وہ ہم سے کلام کرے تاکہ ہم خود اس کا فرمان سن لیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان سے پہلے یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام سے ایسی ہی بات کہی تھی۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح فرشتوں اور انبیاء کرام عَلَیْہِمُ السَّلَام سے کلام فرماتا ہے اس طرح خود ان سے آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی نبوت کے متعلق کیوں کلام نہیں فرماتا تاکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ نبی ہیں اور ہم آپ پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی کیوں نہیں آجاتی جس سے ہمیں آپ کی صداقت معلوم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان مشرکوں سے پہلے کفار نے بھی اپنے رسولوں سے ایسی ہی بات کہی تھی۔ (درمنثور)

زمانہ قدیم کے گمراہ اور موجودہ دور کے گمراہوں میں فرق

یعنی اس قسم کے مطالبات جاہل لوگ کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ہمارے پاس آکر بتائے کہ یہ واقعی میرا رسول ہے یا کوئی ایسی واضح علامت یا معجزہ ہمیں دکھلائے جس سے ہمیں یقین آجائے۔ اسی صورت میں ہم ایمان لاسکتے ہیں۔ یہ سب جہالت کی باتیں ان میں سے اکثر ناممکن العمل ہیں۔ پہلے لوگ بھی ایسے مطالبے کرتے رہے اور آج بھی جاہل لوگ اسی طرح کے مطالبے کر رہے ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ: ان کے دل آپس میں مل گئے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے اقوال کا گزشتہ منکرین کے اقوال کے مطابق ہونا ان کے دلوں کی سختی اور کفر کے ایک دوسرے سے مشابہ ہونے کی علامت ہے۔ اس میں نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو تسلی دی گئی کہ آپ

جاہلوں کی سرکشی اور معاندانہ انکار سے رنجیدہ نہ ہوں۔ پچھلے کفار بھی اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے، جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں۔ مطلب یہ ہے کہ مزاج کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے گمراہوں اور ان گمراہوں میں کچھ فرق نہیں۔ ایسے جاہل لوگ ایک ہی قسم کے اعتراضات اور مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ایمان لانا ہوا ان کے لیے تو ہماری نشانیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ایک ایک آیت پر ان کا ایمان بچتہ سے بچتہ تر ہوتا جاتا ہے اور جو لوگ کفر پر اڑے رہنا چاہتے ہیں انہیں البتہ کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُؤْفِكُونَ آیات کے معنی دلائل بھی ہیں اور نشانیاں بھی، دونوں طرح ترجمہ کیا گیا ہے، دلائل کا لفظ علمی دلائل اور حسی معجزات دونوں کو شامل ہے۔

حسی معجزات کا معنی و مطلب

حسی معجزات معنی و مطلب: یہ وہ غیر معمولی اور مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں جو قوانین فطرت کے خلاف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد انسانی حواس (دیکھنے، سننے یا چھونے) کو براہ راست متاثر کر کے عجز پیدا کرنا اور یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یہ قوت عام انسانی بس سے باہر ہے۔ اہمیت: یہ ابتدائی دور کے انسانوں اور مادی ذہن رکھنے والوں کے لیے فوری اور اٹل ثبوت کے طور پر کام کرتے ہیں۔ مثال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کا اثر دہا بننا، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادرزاد اندھوں کو بینائی دینا۔

علمی دلائل معنی و مطلب

علمی دلائل معنی و مطلب ایسے ٹھوس اور عقلی دلائل جو منطق، فلسفہ، مشاہدے اور سائنسی حقائق پر مبنی ہوں ان کا مقصد انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کرنا، شبہات کا ازالہ کرنا اور حقائق کو براہ راست عقل کی عدالت میں ثابت کرنا ہے۔ اہمیت: ان کا دائرہ کار ہمیشہ باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ یہ دلیل اور شعور کی بنیاد پر کسی نظریے کی سچائی کو منواتے ہیں۔ مثال: قرآن مجید کی آیات اور فلسفیانہ و کلامی

برایں جو کائنات کی تخلیق، توحید اور اخلاقیات پر عقلی دلائل دیتے ہیں۔

حسی معجزات آنکھوں دیکھے سحر کی طرح فوری اور عارضی اثر رکھتے ہیں، جبکہ علمی دلائل دیر پا اور فکری تبدیلی لاتے ہیں۔ روایتی مذہبی تاریخ میں ابتدائی طور پر حسی معجزات کا سہارا لیا گیا تاکہ مخالفین کو فوری طور پر قائل کیا جاسکے، لیکن بعد ازاں انسانی شعور اور انتقاء کے ساتھ علمی دلائل کو فوقیت دی گئی تاکہ انسان عقل و فہم کی بنیاد پر حق کو قبول کرے۔

بہر حال یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں، جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ یاد رہے کہ کفار سے معاشرت، لباس اور وضع قطع میں بھی مشابہت کرنا منع ہے کہ ظاہر باطن کی علامت ہوتا ہے اور ظاہر کا باطن پر اثر ہوتا ہے۔ لہذا کفار کے طور طریقے سے بالکل دوری اختیار کی جائے تاکہ ان کا ظاہر مسلمان کے باطن کو متاثر نہ کرے۔

ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے/ تلاوت قرآن کے ظاہری اور باطنی آداب

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۹ وَلَنْ
تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ قُلْ إِنْ هَدَىٰ اللّٰهُ
هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ مِنَ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۲۰ الَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝۲۱

کفار کی ایدار سانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی تسلی

إِنَّا	بیشک ہم نے	أَرْسَلْنَاكَ	بھیجا آپ کو	بِالْحَقِّ	حق کے ساتھ
بَشِيرًا	خوشخبری دینے والا	وَنَذِيرًا	اور ڈرانے والا	وَلَا	اور نہیں
تُسْأَلُ	آپ سے پوچھا جائے گا	عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۹	دوزخ والوں کے بارے میں		

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے تو یقیناً دل میں افسوس پیدا ہوگا،
حضور ﷺ کے ساتھ یہی معاملہ تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا "إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ

بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۝ اے پیغمبر ﷺ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے آپ اپنی امت کے لیے بشر اور نذیر ہیں یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری سناتے ہیں اور منکرین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں وہ لازمًا اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو کفار کی ایذا رسانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی تسلی اور حوصلہ عطا فرمایا۔ اس کا بنیادی مقصد آپ ﷺ کے قلب مبارک کو اطمینان دلانا اور مشکلات پر صبر کی تلقین کرنا تھا، اور نہ ہی ان کے دوزخ میں جانے پر کوئی قسقوس محسوس کریں، کیونکہ وَلَا تَسْأَلُ عَنْهُ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝ آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے، بلکہ اللہ ان سے سوال ہوگا، ”مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ“ اللہ تعالیٰ پوچھے گا تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ تھی پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے مسکین سے ہمدردی نہیں کرتے تھے فضولیات میں لگے رہتے تھے اور روز قیامت کی تکذیب کرتے تھے، لہذا آپ ان کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ الغرض! حضور پر نور ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جنت کی خوشخبری دینے والے اور دوزخ سے ڈرانے کی خبریں دینے والے ہیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کے باوجود اگر کوئی جہنم کی راہ جاتا ہے تو اس کے متعلق آپ ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سوال نہ ہوگا کہ وہ کیوں ایمان نہ لایا، اس لیے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فرض تبلیغ پورے طور پر ادا فرمادیا۔

لفظ ”ملت“ کی وضاحت

وَلَنْ تَرْضَىٰ	اور ہرگز نہیں راضی ہوں گے	عَنْكَ الْيَهُودُ	آپ سے یہودی
وَلَا النَّصْرَىٰ	اور نہ عیسائی	حَتَّىٰ	یہاں تک کہ
مِلَّتَهُمْ	ان کے دین کی	قُلْ	آپ کہ دیجئے
هَدَىٰ اللَّهُ	اللہ کی ہدایت	هُوَ الْهُدَىٰ	وہی ہدایت ہے

وَلَيْنِ اتَّبَعْتَ	اور البتہ اگر آپ نے پیروی کی	اَهُوَ آءَهُمْ	ان کی خواہشات کی
بَعْدَ الَّذِي	(اس کے) بعد جو	جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	آگیا آپ کے پاس علم
مَا لَكَ	نہیں ہوگا آپ کیلئے	مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے (بچانے والا)
مِنْ وَلِيٍّ	کوئی حمایتی	وَلَا نَصِيْرٍ ۝۱۶	اور نہ کوئی مددگار۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ"۔ یہودی اور نصرانی آپ پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے "حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ"۔ جب تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع نہ کریں ان کا مذہب اختیار نہ کریں، ان کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاسید نفی کے لیے آتا ہے، یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہل کتاب جو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے، اہل کتاب کی جملہ خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری بات کی کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایسا ن لے آئیں گے بلکہ یہ تو اٹا مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں جو کہ ناممکن ہے، اس آیت میں ملت سے مراد وہ دین نہیں جو تورات میں یا انجیل میں مذکور ہے بلکہ وہ دین ہے جس میں وہ سب خرافات بھی شامل ہیں جنہیں ان لوگوں نے دین سمجھ رکھا ہے اور وہ رنگ ڈھنگ بھی جو یہ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ (لفظ "ملت" کی وضاحت: قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے) (جیسے مِلَّةُ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيفًا)۔ اگرچہ عام بول چال میں اسے "قوم" کے مترادف سمجھا جاتا ہے، لیکن اصطلاحی طور پر قوم کی بنیاد علاقائی یا نسلی ہوتی ہے، جبکہ ملت کی بنیاد ہمیشہ نظریہ اور مذہب پر ہوتی ہے۔ اور ایک ہی نظریے اور عقیدے پر چلنے والے لوگوں کا مجموعہ ملت کہلاتا ہے۔ عربی لغت میں ملت ایسی طے شدہ اور معلوم راہ کو کہتے ہیں جس پر انسان گامزن ہو یعنی ملت کا بنیادی مفہوم مذہب، شریعت اور احکامات الہی کا مجموعہ ہے۔ جیسے "ملت ابراہیمی" یا "ملت اسلامیہ"۔

اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی کرنا ہے

لہذا انہیں خوش رکھنے کی فکر چھوڑ دیجئے کیونکہ جب تک آپ عقائد و اعمال کی انہیں گمراہیوں

میں مبتلا نہ ہو جائیں جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں اس وقت تک ان کا آپ ﷺ سے راضی ہونا محال ہے۔ اللہ کی طرف سے ہدایت ہر زمانہ میں اس زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہی آتی ہے اور وہی ہدایت معتبر ہوتی ہے جو اس زمانہ کا نبی لائے۔ سو اس دور میں اللہ کی ہدایت قرآن میں ہے اور اسی پر سب کو ایمان لانا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور کہنے لگے۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپ ﷺ چپ رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے پڑھنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا تجھے گم کرنے والیاں گم کریں کیا تم رسول اللہ ﷺ کی طرف نہیں دیکھتے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب آپ ﷺ کے چہرہ میں غصہ کے آثار دیکھے تو کہنے لگے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کے پروردگار ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہوئے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ اگر موتی آج موجود ہوں اور تم مجھ کو چھوڑ کر اس کی پیروی کرو تو گمراہ ہو جاؤ گے، اور اگر موتی (علیہ السلام) خود زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو ضرور میری پیروی کرتے۔ (دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنتہ فصل ثالث) اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اگر موتی زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ (احمد بیہقی فی شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ باب ایضاً فصل ثانی) یہ تنبیہ بطریق فرض ہے۔ یعنی بالفرض آپ بھی ایسا کریں تو آپ کو اللہ سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ گویا امت کو انتہائی تائید سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام لانے کے بعد پھر سے یہودی یا عیسائی بن جائے تو اس کو اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ

بہر حال قانون کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی، کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اسی کی پیروی کرنا ہے اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا، یہ قاعدہ سب کے لیے ہے اور اس سے کوئی بھی بری الذمہ نہیں، دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا اَلَمْ يَجْعَلْ لَكَ لِيَحْبَبْتَ حَمْلَكَ وَ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ اگر آپ سے بھی شرک سرزد ہو گیا، تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے، یہ اصول صرف حضور ﷺ کے لیے ہی نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر یہی وحی بھیجی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں لہذا آپ حق کی پیروی کرتے رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔ یہود و نصاریٰ کا دین اصلاً تو کتاب الہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا اور وہ برحق تھا، مگر اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگڑ چکی تھی، لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی، بلکہ اب تو آخری نبی کا دین غالب آئے گا وہی قابل اتباع ہے، دوسرے مقام پر فرمایا هُوَ الَّذِي ارْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔ اللہ تعالیٰ وہ رحیم و کریم ذات ہے جس نے اپنے آخری نبی کو سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دین کو باقی ادیان پر غالب کر دے، جب مقصد رسالت دیگر ادیان پر غالب ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ یعنی یہ خطاب امت محمدیہ کو ہے کہ جب تم نے جان لیا کہ سید الانبیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم تمہارے پاس حق و ہدایت لائے تو تم ہرگز کفار کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اگر ایسا کیا تو تمہیں کوئی عذاب الہی سے بچانے والا نہیں الغرض! لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ اس سے مراد اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی روشن تعلیمات اور حقانیت دنیا کے سامنے اس طرح واضح ہو جائے کہ کوئی بھی باطل نظریہ اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے دین اسلام غالب ہوا اور اس کے علاوہ تمام ادیان اسلام سے

مغلوب ہو گئے۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے تو روم زمین پر اسلام کے سوا اور کوئی دین نہ ہوگا۔ (روح البیان، الصنف تحت الآیہ: ۹۰۹/۵۰۴، مدارک، الصنف تحت الآیہ: ۹۰۹/۱۲۳، ملتقطاً)

کتاب اللہ کے حقوق

اَلَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جنہیں	اَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ	ہم نے دی کتاب
يَتْلُوْنَہ	اس کی تلاوت کرتے ہیں	حَقَّ تِلَاوَتِہ	(جیسا) حق ہے اس کی تلاوت کا
اُولَئِكَ	وہی (لوگ)	يُؤْمِنُوْنَ بِہ	ایمان لاتے ہیں اس پر
وَمَنْ يَّكْفُرْ	اور جو انکار کرے	بہ	اس کا
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾	ہی خسارہ پانے والے (ہیں) (121)		

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تھے، ان کی تعداد چالیس تھی، بیس اہل حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے، ان میں بحیرہ راہب بھی تھے جنہوں نے نیپچن میں سفر شام میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا تھا۔ (خازن، البقرة تحت الآیہ: ۱۲۱/۸۴-۸۵) آیت کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں توریت شریف پر ایمان لانے والے وہی ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں اور بغیر تحریف و تبدیل کئے پڑھتے ہیں اور اس کے معنی کو سمجھتے اور ماننے ہیں اور اس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت دیکھ کر آپ پر ایمان لاتے ہیں اور جو حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے منکر ہوتے ہیں وہ توریت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے بہت سے حقوق بھی ہیں۔ قرآن کا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے، اس سے محبت کی جائے، اس کی تلاوت کی جائے، اسے سمجھا جائے، اس پر ایمان رکھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ ترغیب کے لئے یہاں ہم تلاوت قرآن کے چند ظاہری اور باطنی آداب ذکر کرتے ہیں تاکہ مسلمان قرآن

عظیم کی اس طرح تلاوت کریں جیسا تلاوت کرنے کا حق ہے۔

تلاوتِ قرآن کے ظاہری آداب

قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو ان چھ 6 ظاہری چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ (1) با وضو ہو کر قبلہ رو ہو کر، مؤدب ہو کر اور عجز و انکساری کے ساتھ بیٹھے۔ (2) آہستہ پڑھے اور اس کے معانی میں غور و فکر کرے تلاوت قرآن کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ (3) دورانِ تلاوت رونا بھی چاہئے اور اگر رونانہ آئے رونے جیسی شکل بنا لے۔ (4) ہر آیت کی تلاوت کا حق بجالائے (5) اگر قراءت سے ریا کاری کا اندیشہ ہو یا کسی کی نماز میں خلل پڑتا ہو تو آہستہ آہستہ تلاوت کرے۔ (6) جہاں تک ممکن ہو قرآن پاک کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھے۔

تلاوتِ قرآن کے باطنی آداب

قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کو ان چھ 6 باطنی چیزوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔
(1) قرآن مجید کی عظمت دل میں بٹھائے۔ (2) قرآن مجید پڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بٹھائے اور خیال کرے کہ یہ کس عظیم ذات کا کلام ہے اور میں کس بھاری کام کے لئے بیٹھا ہوں۔ (3) قرآن کریم کے تلاوت کرتے وقت دل کو حاضر رکھے، ادھر ادھر خیال نہ کرے، برے خیالات سے دل کو آلودہ نہ کرے اور جو بے خیالی میں پڑھ چکا اسے از سر نو توجہ سے پڑھے۔
(4) ہر حکم کے معنی میں غور و فکر کرے، اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے بار بار پڑھے اور اگر کسی آیت کے پڑھنے سے لذت محسوس ہو تو اسے پھر پڑھے کہ یہ دوبارہ پڑھنا زیادہ تلاوت کرنے سے بہتر ہے۔ (5) جس طرح آیات کا مضمون تبدیل ہوتا رہے اسی طرح مضمون کے مطابق دل کی کیفیت بھی بدلتی رہے اور قرآن کے رنگ میں رنگتی جائے۔
(6) قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرے کہ گویا یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سن رہا ہے اور خیال کرے کہ ابھی اس ذات کی جانب سے سن رہا ہوں۔ (کیمیاءِ سعادت،)

امتحان کی غرض و غایت / حضرت ابراہیم (علیہ السلام) امام الناس ہیں / مساجد کی ظاہری و باطنی صفائی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
يٰۤاِبْنٰى اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاِنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱۲۱) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝ (۱۲۲) وَاِذْ اَبْتَلٰٓ اِبْرٰهٖمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ
فَاتَمَّهِنَّ ۝ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۝ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۝ قَالَ لَا يَنَالُ
عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ ۝ (۱۲۳) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاٰمَنًا ۝ وَاتَّخِذُوا مِنْ
مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّٰى ۝ وَعَهْدُنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ
وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (۱۲۵)

جو حضور اکرم ﷺ کا ہو گیا عزت پا گیا اور جو ان سے پھر گیا ذلیل ہو گیا

یٰۤاِبْنٰى اِسْرَآءِيْلَ	اے بنی اسرائیل	اَذْكُرُوْا	یاد کرو تم
نِعْمَتِيْ الَّتِيْ	میری نعمت وہ جو	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی
عَلَيْكُمْ	تم پر	وَاِنِّيْ	اور بیشک میں نے

فَضَّلْتُكُمْ	تمہیں فضیلت دی	عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿١٢٢﴾	جہان والوں پر۔
---------------	----------------	---------------------------	----------------

بنی اسرائیل کا ذکر پانچویں رکوع سے شروع ہو کر چودھویں رکوع تک پورے دس رکوعات میں پوری تفصیل سے کیا گیا اور بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دے کر تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کا فریضہ انہیں سونپا تھا۔ اور یہ بھی گزر چکا ہے کہ اس فضیلت کا تعلق امت محمدیہ ﷺ کے ظہور سے پہلے کے دور سے ہے، اس وقت صرف بنو اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور پوری دنیا شرک کی آماج گاہ تھی، اس لئے بنو اسرائیل دوسری قوموں سے افضل تھے۔ یعنی بنی اسرائیل اپنے زمانے میں تمام لوگوں سے افضل تھے کیونکہ یہ نبیوں کی اولاد تھے اور ان میں صالحین بہت تھے، اب حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کا انکار کر کے اور سرکشی کر کے ذلیل ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عزت حضور اقدس ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کے قدم سے وابستہ ہے، جو ان کا ہو گیا عزت پا گیا اور جو ان سے پھر گیا ذلیل ہو گیا۔ بہر حال یہود میں بیشمار ایسی اخلاقی بیماریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جن کی وجہ سے یہ امامت کے قابل ہی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی تمام اخلاقی بیماریوں کا ذکر تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور آخر میں انہیں وہی ہدایت کی جاری ہے جو ابتداء میں بھی کی گئی تھی کہ اس دن سے ڈر کر اب بھی اپنی خباثتوں سے باز آ جاؤ۔

شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے

وَاتَّقُوا	اور تم ڈرو	يَوْمًا	اُس دن سے	لَا تَحْزَنْ	نہ کام آئے گی
نَفْسٍ	کوئی جان	عَنْ نَفْسٍ	کسی جان سے	شَيْئًا	کچھ بھی
وَلَا يُقْبَلُ	اور نہ قبول کیا جائے گا	مِنْهَا	اس سے	عَدْلٌ	کوئی بدلہ
وَلَا تَنْفَعُهَا	اور نہ اسے نفع دے گی اُسے	شَفَاعَةٌ	کوئی سفارش		
وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٣٣﴾	اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔				

یہاں بنیادی طور پر ان یہودیوں کا رد ہے جو کہتے تھے ہمارے باپ دادا بڑے بزرگ تھے وہ ہمیں شفاعت کر کے چھڑالیں گے۔ انہیں فرمایا جا رہا ہے کہ شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے۔

گویا یہاں کافر کا بیان ہے کہ کافر کی طرف سے کوئی بدلہ نہ بنے گا اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لے کر اسے چھوڑا جائے اور نہ کوئی اس کی شفاعت کرے گا اور بالفرض اگر کوئی کرے تو کافر کے حق میں شفاعت قبول نہیں کی جائے گی اور نہ کافروں کی مدد کی جائے گی۔ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی شفاعت بھی ہوگی جیسے قرآن میں بیبیوں جگہ ہے اور مسلمانوں کی مدد بھی ہوگی جیسے بخاری و مسلم کی حدیثوں میں ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم قیامت میں جگہ جگہ اپنے امتیوں کی مدد فرمائیں گے۔

ابتلاء آزمائش کا لغوی معنی اور قرآنی و شرعی مفہوم

وَإِذِ ابْتَلَىٰ	اور جب آزمایا	إِبْرَاهِيمَ	ابراہیم کو	رَبُّهُ	اُس کے رب نے
بِكَلِمَاتٍ	چند باتوں سے	فَاتَمَّتْهُنَّ	تو اُس نے پورا کر دیا اُن کو	قَالَ	فرمایا
إِنِّي	بیشک میں	جَاعِلُكَ	بنانے والا ہوں تجھے	لِلنَّاسِ	لوگوں کا
إِمَامًا	پیشوا	قَالَ	اس نے کہا	وَمِنْ ذُرِّيَّتِي	میری اولاد سے
قَالَ	اس نے فرمایا	لَا يَنَالُ	نہیں پہنچے گا	عَهْدِي	میرا عہد
الظَّالِمِينَ ﴿١٢٤﴾			ظالموں کو (124)		

وَإِذِ ابْتَلَىٰ: اور جب آزمایا۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب سب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضل و شرف کے معترف اور آپ کی نسل میں ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ حالات بیان فرمائے ہیں جن سے سب پر اسلام کا قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے کیونکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر واجب کیں وہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ابتلاء آزمائش کو کہتے ہیں، ابتلاء عربی لفظ "بلاء" سے نکلا ہے، جس کے اصل معنی کسی مشکل اور دشوار کام کا مکلف بنانا ہیں۔ لغت میں اس کا مطلب پرکھنا یا کھوٹ اور کھرے کی تمیز کرنا ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق، یہ دنیا ایک دار امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی وفاداری، صبر اور شکر کا مختلف حالات میں امتحان لیتا ہے۔ قرآنی رو سے یہ آزمائش دو طرح سے

ہوتی ہے، خدائی آزمائش یہ ہے کہ بندے پر کوئی پابندی لازم فرما کر دوسروں پر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اظہار کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی یعنی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو تمام دنیا کی امامت ایسے ہی نہیں مل گئی تھی بلکہ آپ کی سن شعور سے لے کر مرنے تک پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں انسان جن چیزوں سے محبت کرتا ہے ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو اور ان کی خاطر مصائب نہ جھیلے ہوں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ آپ ایک بت گرو اور بت فروش کے گھر پیدا ہوئے۔ باپ چاہتا تھا کہ بیٹا اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن آپ (علیہ السلام) نے الٹا احسن انداز میں سمجھانا شروع کر دیا۔ جب باپ آپ (علیہ السلام) کی طرف سے مایوس ہو گیا تو گھر سے نکال دینے کی دھمکی دے دی۔ آپ (علیہ السلام) نے حق کی خاطر جلاوطنی کی صعوبتیں قبول کیں۔

2۔ قومی میلہ کے موقع پر بتوں کو پاش پاش کیا جسکے نتیجے میں آپ (علیہ السلام) کو آگ میں جلا دینے کا فیصلہ ہوا۔ آپ (علیہ السلام) نے بخوشی اس میں کودنا منظور کیا۔

3۔ آپ (علیہ السلام) نے اپنی بیوی باجرہ (علیہا السلام) اور دودھ پیتے بچے کو اللہ کے حکم کے مطابق ایک بے آب و گیاہ میدان میں جا چھوڑا۔ جہاں کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہ تھا اور نہ ہی دوردور تک کسی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔

4۔ بوڑھی عمر میں ملے ہوئے بچے اسماعیل (علیہ السلام) جب ذرا جوان ہوئے تو ان کو قربان کر دینے کا حکم ہوا تو آپ بے دریغ اور بلا تامل اس پر آمادہ ہو گئے۔ غرض آپ کی قربانیوں اور آزمائشوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خود یہ سرٹیفکیٹ عطا کر دیا کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کی کئی باتوں سے آزمائش کی تو وہ ہر امتحان میں پورے اترے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان امتحانوں کے نتیجے میں آپ کو دنیا جہان کا امام بنادیا،

اور آئندہ قیامت تک کے لیے سلسلہ نبوت کو آپ (علیہ السلام) ہی کی اولاد سے منسلک کر دیا اور دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب اپنے مذہب کی آپ (علیہ السلام) کی طرف نسبت کرنا باعث عزت و افتخار سمجھتے ہیں۔ بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ بیکلمیت سے بعض مفسرین نے ان باتوں سے مراد والد، قوم اور بادشاہ کو تو حید کی دعوت، بت پرستی، ستارہ پرستی اور شاہ پرستی کی تردید، آگ میں پھینکے جانے پر صبر، پھر ہجرت، مصر کے جبار بادشاہ کی دست درازی کے باوجود استقامت، بیوی بچے کو وادی غیسر ذی ذرع میں چھوڑنا اور اکلوتے پیٹے کو ذبح کرنے پر مکمل آمادگی کو لیا ہے۔ بعض نے آگے آنے والی آیات میں مذکور بیت اللہ کی تعمیر و تطہیر اور حج کے مناسک اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَسْلِمَ: (فرماں بردار ہو جا) پر فرماں بردار ہونے کے اقرار، پھر اس کے عملی ثبوت کو مراد لیا ہے۔ (قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام لوگوں کا امام بنادیا تو انھوں نے اپنی بعض اولاد کے حق میں امامت کی دعا کی، سب کے حق میں نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، تو یہ دعا کیوں کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، مگر اس کے ساتھ ہی انھیں بتادیا کہ تمہاری اولاد میں سے ظالم لوگ اس نعمت سے سرفراز نہیں ہوں گے۔ اس سے بنی اسرائیل کے گمراہ لوگوں اور بنی اسماعیل کے مشرکین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے عقائد و اعمال خراب ہو چکے ہیں، محض ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہونا کافی نہیں۔ یعنی امامت کا وعدہ صرف تمہاری اس اولاد سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہوگی۔ ظالموں اور گنہگاروں کے لیے ایسا کوئی وعدہ نہیں۔ یہیں سے یہود کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہوگئی جو وہ سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ پیغمبروں کی اولاد ہیں اس لیے ہمیں عذاب اخروی نہ ہوگا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں، ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک امامت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں کوئی بھی ظالم پیشوائی کے لائق نہیں ہے۔

اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے
اس سے معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کا پیشوا نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں کو اس کی اتباع جائز نہیں۔ یہ
بھی معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ
اللہ تعالیٰ کوئی نعمت عطا فرمائے تو اولاد کیلئے بھی اس کی خواہش کرنی چاہیے۔

شیشہ کی گنبد نما عمارت

وَادُّ	اور جب	جَعَلْنَا	ہم نے بنایا	الْبَيْتِ	بیت اللہ
مَثَابَةً	اجتماع کی جگہ	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	وَأَمَّنَا	اور امن (کی جگہ)
وَاتَّخِذُوا	اور تم بناؤ	مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ	مقامِ ابراہیم کو		
مُصَلًّى	نماز پڑھنے کی جگہ	وَعَهْدُنَا	اور ہم نے حکم دیا		
إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ	ابراہیم کو	وَأَسْمِعِیْلَ	اور اسماعیل (کو)	أَنْ طَهَّرَا	یکہ پاک رکھیں
بَنَاتِیْ	میرا گھر	لِلطَّافِیْنِ	طواف کرنے والوں کیلئے		
وَالْعَکِیْفِیْنِ	اور اعتکاف کرنے والوں (کیلئے)	وَالزُّكَّیْ	اور زکوٰۃ کرنے والوں		
السُّجُودِ ⑫		اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے) (125)			

مَثَابَةً بمعنی لوگوں کے بار بار آتے اور جاتے رہنے کی جگہ (بغرض حج، عمرہ، طواف، اور
عبادت نماز وغیرہ) وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے
رہے۔ اسی پر کھڑے ہو کر آپ نے لوگوں کو حج کے لیے پکارا۔ یہ پتھر خانہ کعبہ کے صحن میں ہے اور
آج کل اسے ایک چھوٹی سی شیشہ کی گنبد نما عمارت میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ
تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا کرتے تھے تین باتوں میں میری رائے
اللہ کے علم کے موافق ہوگئی۔ (جن میں ایک یہ تھی) میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا اچھا ہوا اگر
آپ مقامِ ابراہیم (علیہ السلام) کو نماز کی جگہ قرار دے دیں اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار

دی۔ (وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ رَبِّهِمْ مُصَلًّیً چنانچہ طواف کرنے والے اسی مقام کے پاس دو گانہ نماز نفل ادا کرتے ہیں۔

ظاہری و باطنی صفائی سنتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام

(ظَهَرَ اَبْنِیَّتِی) طہارت سے مراد کوڑا کرکٹ سے صفائی ہی نہیں، بلکہ ظاہری و باطنی صفائی ہے یعنی بت پرستی اور شرک کی تمام نجاستوں سے بھی صفائی ہے، کیونکہ طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ اللہ کے سوا کسی کا حق نہیں۔ مشرکین مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تمہارے باپ کو کیا حکم دیا گیا تھا اور تم نے عین کعبہ میں بت لا کر کیسی فرماں برداری کی۔ یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کو بیت اللہ شریف کو پاک و صاف رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ اور مسجد حرام شریف کو حاجیوں، عمرہ کرنے والوں، طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور نمازیوں کیلئے پاک و صاف رکھا جائے، یہی حکم مسجدوں کو پاک و صاف رکھنے کا ہے، وہاں گندگی اور بدبودار چیز نہ لائی جائے، یہ سنتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتکاف عبادت ہے اور گزشتہ امتوں میں رائج تھانیز پچھلی امتوں کی نمازوں میں رکوع سجود دونوں تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجدوں کا متولی ہونا چاہیے اور متولی صالح انسان اور مسجد کی صحیح خدمت کرنے والا ہو۔ الغرض! اس آیت میں چار عبادتوں کا ذکر کیا گیا ہے: طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ، طواف اور اعتکاف مستقل عبادت ہے، طواف کعبۃ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، کعبۃ اللہ کے علاوہ کسی مسجد یا مقام کا پھیر الگ ناسخت گناہ اور بدترین بدعت ہے، (دیکھئے: فتاویٰ رحیمیہ: ۳۳۶/۲)، اور اعتکاف مرد کسی مسجد ہی میں کر سکتے ہیں، عورتیں گھر میں اعتکاف کریں گی، رکوع و سجدہ سے نماز کی ادائیگی مراد ہے، نماز میں عجز و فروتنی کا سب سے بڑھ کر اظہار رکوع اور سجدہ ہی سے ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر ان کا ذکر کیا گیا، اس ارشادِ ربانی سے معلوم ہوا کہ نماز کی جبکہ پاک ہونا شرط ہے اور نماز کی جبکہ سے مراد یہ ہے کہ رکوع و سجدہ میں جو اعضاء زمین سے لگتے ہیں، ان جگہوں کو پاک ہونا چاہئے۔

تعمیر کعبہ کے مختلف ادوار / پُر امن شہر مکہ مکرمہ کی فضیلت / مناسک حج کی تعلیم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝
وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الشُّرَتِ مِّنْ اٰمَنٍ
مِّنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۖ قَالَ وَّمَنْ كَفَرَ فَاَمَتُّعْهُ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهُ اِلٰى
عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۳۷ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَاسْمِعِيْلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۸ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا
مُسْلِمِيْنَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۹ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝۴۰

نبی کر کے قبولیت کی دعا کرنا سنتِ خلیل

وَ اِذْ قَالَ	اور جب کہا	اِبْرٰهِيْمُ	ابراہیم نے	رَبِّ	اے میرے رب!
اجْعَلْ	تو بنا	هٰذَا بَلَدًا	اس شہر کو	اٰمِنًا	امن والا
وَارْزُقْ	اور رزق دے				

أَهْلَهُ	اس کے رہنے والوں کو	مِنَ الشَّمَرِ	پھلوں میں سے
مَنْ آمَنَ	جو ایمان لائے	مِنْهُمْ	ان میں سے
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	اور آخرت کے دن (پر)	قَالَ	(اللہ نے) کہا
وَمَنْ كَفَرَ	اور جس نے کفر کیا	فَأَمَّتْهُ	تو اس کو نفع دوں گا
قَلِيلًا	تھوڑا سا	ثُمَّ أَصْطَرَّتْ	پھر اس کو مجبور کروں گا
إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ	طرف عذاب جہنم کے	وَبُسَّ	اور وہ بری جگہ ہے
الْمَصِیْرُ ②		لوٹنے کی۔ (126)	

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر کعبہ کے بعد متعدد دعائیں مانگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیکی کر کے قبولیت کی دعا کرنا سنتِ خلیل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اولاد کیلئے امامت مانگی تھی تو فرمایا گیا کہ ظالموں کو نہیں ملے گی اس لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعد میں جب یہ دعا کی تو اس میں مومنین کو خاص فرمایا کہ مومنوں کو رزق دے اور یہی ادب کا تقاضا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، دعا قبول فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ رزق سب کو دیا جائے گا مومن کو بھی اور کافر کو بھی لیکن کافر کا رزق تھوڑا ہے یعنی صرف دنیوی زندگی میں اسے ملے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خانہ کعبہ کیلئے رزق کی فراوانی کی دعا مانگی تھی، اور رزق کی وہ فراوانی فرمائی کہ مکہ میں کھیتی باڑی نہ ہونے کے باوجود وہاں سارا سال دنیا بھر کے تازہ پھل اور ہر قسم کا غلہ اتنی فراوانی سے ملتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کی قبولیت، ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ دنیا بھر کے پھل اور کھانے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔

مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پر امن شہر

مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پر امن شہر ہے، مکہ مکرمہ اس پوری کائنات ارضی میں وہ بابرکت جگہ اور رحمتوں والا مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کے شہروں سے بڑھ کر اعلیٰ و مقدس شہر کی حیثیت عطا کی ہے اللہ رب العزت نے اس شہر دِلنواز اور اس مرکزِ بخشش کو خلعتِ انوار

میں لپیٹے ہوئے اپنے برگزیدہ بندے، اور عالم خلق میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہستی امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت کے لئے منتخب کیا اپنے دین کی اشاعت اور ترویج و فروغ اور اپنے گھر بیت اللہ شریف کاج کرنے کے لئے اس شہر بے مثال کو منتخب فرمایا، شہر خوباں نزول وحی و ملائکہ کا مرکز، انبیاء و اولیاء کا ٹھکانہ و مدفن، ہر چیز کی پیدائش کا موجب و سبب اور ہر انعام خداوندی کی بنیاد ہے یہاں اللہ تعالیٰ کی واضح اور کھلی نشانیاں ہیں جن کی زیارت سے جہاں ایمان کو حلاوت اور چاشنی ملتی ہے وہاں استقرار و استحکام بھی میسر آتا ہے ان ہی میں سے مقام ابراہیم ہے، صفا و مروہ ہے، آب زم زم و حجر اسود ہے جتنی کہ یہی وہ شہر ہے۔

مکہ مکرمہ کی فضیلت

جس میں اللہ کا گھر ”بیت اللہ“ ہے جس میں ادا کی جانے والی ایک نماز اپنے دامن میں ایک لاکھ نماز کا اجر و ثواب رکھتی ہے اس کے ارد گرد تین سو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مزارات ہیں، اس شہر امن میں داخل ہونے والے کو امن و امان مل جاتا ہے خونریزی و سفاکی کی یہاں ممانعت ہے کسی بھی انسان کا حق و ناحق خون نہیں بہایا جاسکتا اس عظمت و بزرگی والے شہر میں حلال تو درکنار حرام جانور کا شکار بھی گناہ ہے اس کے درختوں اور شاخوں کا کاٹنا بھی حرام ہے یہ اس قدر امن والا شہر ہے کہ ہر ذی روح اور غیر ذی روح اس کے سائے میں محفوظ و مامون ہے یہاں قدم قدم پر عافیت کے شامیانے نصب ہیں امن سکون اور رحمتوں کا بحر بے کنار، یہ وہ عظیم الشان شہر ہے جس کی عظمت اور فضیلت کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قیس کھائی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ (البلدہ، 90: 1-2) ”میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں (اے حبیب مکرم!) اس لیے کہ آپ اس شہر میں تشریف فرما ہیں۔“ اسی طرح مکہ مکرمہ کی فضیلت حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ثابت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے اظہار محبت یوں فرمایا:

”تو کتنا اچھا شہر ہے اور مجھے کتنا عزیز ہے اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے

علاوہ کہیں نہ ٹھہرتا۔“ (ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب فی فضل مکہ، 5: 679-680، رقم: 3926) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کو قبول فرمایا چنانچہ حرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر مختلف ادوار میں دس (10) بار ہوئی

وَاذْيِفَ فَعِ	اور جب بلند کر رہے تھے	اِبْرَاهِيمَ	ابراہیم	الْقَوَاعِدَ	بنیادیں
مِنَ الْبَيْتِ	بیت اللہ کی	وَالْمُعِیْلُ	اور اسماعیل		
رَبَّنَا	(یہ کہتے ہوئے) اے ہمارے رب	تَقَبَّلْ	قبول فرما		
مِنَّا	(یہ نیکی) ہم سے	اِنَّكَ اَنْتَ	بیشک تو ہی ہے		
السَّمِیْعُ	خوب سننے والا	الْعَلِیْمُ ②	خوب جاننے والا۔ (127)		

وَاذْيِفَ فَعِ اِبْرَاهِيمَ الْقَوَاعِدَ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا، یعنی بیت اللہ کی وہ بنیادیں جو اس سے پہلے موجود تھیں۔ [تفسیر عبدالرزاق بسند صحیح] اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا، اب اسے سنو اس کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ سورہ حج (26) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین فرمائی۔ مشہور اسلامی مؤرخ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'تاریخ مکہ' میں ان دس تعمیرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اسی طرح علامہ قسطلانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ) نے کہا کہ کعبہ دس بار تعمیر ہوا۔ سب سے پہلے اسے فرشتوں نے بنایا۔ دوسری بار آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے (آپ (علیہ السلام) کی عمر ہزار سال تھی) تیسری بار شیث (علیہ الصلوٰۃ والسلام) (آدم کے بیٹے) نے اور یہ تعمیر طوفان نوح (علیہ السلام) میں گر گئی۔ چوتھی بار حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے پانچویں بار قوم عمالقہ نے، چھٹی بار قبیلہ جرہم نے، ساتویں بار قس بن کلاب نے (جو رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہیں) آٹھویں بار قس ریش نے (آپ کی بعثت سے پہلے جب کہ حکیم کی جگہ چھوڑ دی تھی) نویں بار حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنے دور خلافت میں) دسویں بار حجاج بن یوسف نے۔ اور اس کے بعد آج

تک اس علاقہ پر مسلمانوں کا ہی قبضہ چلا آ رہا ہے اور بہت سے بادشاہوں نے اس کی تعمیر، مرمت اور توسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ اس سلسلہ میں آل سعود کی خدمات گرانقدر ہیں اور لائق تحسین ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسجدوں کی تعمیر نہایت اعلیٰ عبادت اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی شریف کی تعمیر میں بذات خود حصہ لیا تھا۔ (بخاری) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مسجد میں تعمیر کرو اور انہیں محفوظ بناؤ۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلاة، فی زینۃ المساجد وما جاء فیہا، ۱/ ۳۴۴، الحدیث: ۹) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو اللہ تعالیٰ کے لیے مسجد بنائے گا اللہ عز و جل اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔“ (مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب فضل بناء المساجد، ص ۱۵۹۳، الحدیث: ۴۴ (۲۹۸۳))

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ یعنی یہ معمولی پتھروں کی عمارت تیری شان کے اعتبار سے کس لائق ہے؟ لیکن ان عاجز بندوں کے جذبہ اخلاص کو دیکھتے اور ان کی انتخاب کو سنتے ہوئے اپنی شان کریمی سے اس کو قبول فرما لیجئے، کہ آپ بندوں کی دعا سنتے ہیں اور دلوں کے حال سے واقف ہیں۔

لفظ مناسک کا لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	وَاجْعَلْنَا	اور ہمیں بنادے	مُسْلِمَيْنِ	فرمانبردار
لَكَ	اپنا	وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا	اور (بنا) ہماری اولاد سے (بھی)		
أُمَّةً مُسْلِمَةً لَّكَ		ایک جماعت فرمانبردار اپنی			
وَأَرْزُقْنَا مَنَّا سَكَنًا	اور ہمیں سکھاج کے طریقے	وَتُبَّ عَلَيْنَا	اور توبہ قبول فرما ہماری		
إِنَّكَ أَنْتَ	بیشک توبہی	التَّوَّابُ	بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا		

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ دُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ دُنُوں پیغمبر جب غانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ دعا بھی کر رہے تھے کہ الہی: ہماری یہ خدمت قبول فرما اور اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا، اور ہماری اولاد میں سے ایک مسلم قوم پیدا کر، اور مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اپنے آپ کو کلمتاً اللہ کے سپرد کر دے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے۔ اس عقیدے اور طرز عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین رہا ہے۔ وَآرِنَا مَا يَسْكُنُوا: مناسک عربی زبان کا لفظ ہے (واحد: منک)، جس کے لغوی معنی پاک کرنے، اور ایسی مخصوص جگہ جہاں لوگ بار بار جمع ہوں گے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد عبادت کے وہ طریقے، رسومات اور افعال ہیں جو اللہ کی خوشنودی کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، الغرض! اصطلاحاً اس کا اطلاق زیادہ تر حج اور عمرہ کے افعال پر ہوتا ہے ان میں احرام باندھنا، طواف کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، وقوف عرفات، اور رمی (کنکریاں مارنا) شامل ہیں۔ یعنی مناسک کا لفظ عموماً حج کے آداب و ارکان اور قربانی کے احکام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے وسیع مفہوم میں عبادت کے سب طریقے شامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ عبادت کے طریقے سیکھنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔ اس کیلئے دعا بھی کرنی چاہیے اور کوشش بھی۔ بغیر طریقہ سیکھے عبادت کرنا اکثر عبادت کو ضائع کرتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”ہر مسلمان پر علم سیکھنا فرض ہے۔ (ابن ماجہ) وَتُبَّ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْتَّوَّابُ الرَّحِيمُ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عمدہ آکوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، رہی خطا تو بھول چوک امت سے تو معاف ہے۔ مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان اتنی بڑی ہے کہ ذرا سی غفلت ان کے حق میں گناہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی لیے انبیاء (علیہم السلام) معصوم ہونے کے باوجود عوام الناس کی نسبت بہت

زیادہ توبہ واستغفار کرتے رہتے ہیں۔

کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	وَابْعَثْ	اور تو بھیج	فِيهِمْ	ان میں
رَسُولًا	ایک رسول	مِنْهُمْ	انہی میں سے	يَتْلُوا	وہ تلاوت کرے
عَلَيْهِمْ	ان پر	أَيَّتِكَ	تیری آیتیں	وَيُعَلِّمُهُمُ	اور انہیں تعلیم دے
الْكِتَابِ	کتاب	وَالْحِكْمَةِ	اور حکمت	وَيُزَيِّنْ لَهُمْ	اور انہیں پاک کرے
إِنَّكَ أَنْتَ	بیشک تو ہی	الْعَزِيزُ	نہایت غالب	الْحَكِيمُ ﴿١٩٩﴾	خوب حکمت والا (ہے)

یہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی آخری دعا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول (ﷺ) کو مبعوث فرمایا۔ اسی لئے نبی (ﷺ) نے فرمایا: ”میں اپنے باپ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت اور اپنی والدہ کا خواب ہوں۔“ (الفتح الربانی، ج 20، ص 181، 189)

کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے۔ تلاوت آیات کے بعد تعلیم کتاب و حکمت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نفس تلاوت بھی مقصود اور باعث اجر و ثواب ہے۔ تاہم اگر ان کا مفہوم و مطلب بھی سمجھ میں آتا جائے تو سبحان اللہ، سونے پر سہاگہ ہے۔ لیکن اگر قرآن کا ترجمہ و مطلب نہیں آتا، تب بھی اس کی تلاوت میں کوتاہی جائز نہیں ہے۔ تلاوت بجائے خود ایک الگ اور نیک عمل ہے۔ تاہم اس کے مفاہیم اور مطالب سمجھنے کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔

تلاوت و تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کے بعد آپ (ﷺ) کی بعثت کا یہ چوتھا مقصد ہے کہ انہیں شرک و توہمات کی آلائشوں سے اور اخلاق و کردار کی کوتاہیوں سے پاک کریں۔ آمین۔

اسلام دین امن و سلامتی ہے / اولاد کو صحیح عقائد اور نیک اعمال کی وصیت کرنی چاہئے

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
وَمَنْ يَّرْغَبْ عَنِ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مِنْ سَفِيْةِ نَفْسِهٖ ۚ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنٰهُ فِي
الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهٗ اَسْلِمْ ۙ قَالَ
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾ وَوَضٰى يَہٰ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهٖ وَيَعْقُوْبُ ۙ لِيُبَيِّنَ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰى لَكُمْ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٣٨﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ
حَضَرَ يَعْقُوْبُ الْمَوْتَ ۚ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِي ۙ قَالُوْا نَعْبُدُ
اِلٰهًا وَّالٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ وَنَحْنُ لَهُ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿٣٩﴾

یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید

وَمَنْ	اور کون	یَرْغَبْ	منہ موڑتا ہے	عَنِ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ	ملت ابراہیم سے
اِلَّا مِنْ	سوائے اس کے جس نے	سَفِيْةِ	بیوقوف بنایا	نَفْسِهٖ	اپنے آپ کو
وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اصْطَفَيْنٰهُ	ہم نے اس کو چن لیا	فِي الدُّنْيَا	دنیا میں

وَأَنَّهُ	اور بیشک وہ	فِي الْآخِرَةِ	آخرت میں
لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٠﴾	البتہ نیکوں میں سے ہے (130)		

”رَغِبَ يَرْغَبُ“ کے بعد اگر ”فی“ آئے تو اس کا معنی کسی چیز میں رغبت رکھنا اور اگر ”عَنْ“ آئے تو اس کا معنی بے رغبتی ہوتا ہے۔ دین کا معنی اللہ تعالیٰ کی مکمل حاکمیت اور اپنی مکمل عبودیت کو تسلیم کر لینا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے طرز فکر اور طرز عمل کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنالیا تھا اور طرز فکر و عمل کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی پوری زندگی صرف کی اور اس راہ میں جو بڑی مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور یہ طرز زندگی اللہ کو اتنا محبوب تھا کہ اس نے آپ کو پوری دنیا کا امام بنادیا۔ اب کوئی بیوقوف ہی ایسی پسندیدہ روش سے اعراض کر سکتا ہے، یا ایسا شخص جو تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہو۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید ہے کہ وہ تینوں ملت ابراہیم کے دعوے دار تھے، مگر عملاً اس سے بالکل بے رغبت، بلکہ شدید مخالف تھے، انہوں نے اس میں شرک و بدعت کو شامل کر کے اپنا اپنا الگ الگ طریقہ بنالیا تھا۔ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا بنا رکھا تھا، نصرانی تین خدا مانتے تھے صلیب کی پرستش اس پر مزید تھی۔ مشرکین عرب نے بت پرستی اختیار کر لی تھی، (وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ) بلاشبہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت میں سے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چن لیا اور جو آخرت میں صالحین میں شامل ہوں گے، اس سے وہی شخص بے رغبتی کرے گا جو عقل کو جواب دے کر اپنے آپ کو بیوقوف بنا لے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سچے دین کی پہچان یہ ہے کہ وہ سلف صالحین کا دین ہو، یہ حضرات ہدایت کی دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ نے حقانیت اسلام کی دلیل یہاں دی کہ وہ ملت ابراہیمی ہے۔

اسلام کے دین امن و سلامتی ہونے کی بڑی دلیل

إِذْ قَالَ لَهُ	جب کہا اس سے	رَبُّهُ	اس کے رب نے
أَسْلِمَ	تو فرمانبردار ہو جا!	قَالَ	اس نے کہا

اَسْلَمْتُ	میں فرمانبردار ہو گیا	لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣١﴾	رب العالمین کیلئے
------------	-----------------------	----------------------------	-------------------

”اَسْلَمَ يُسْلِمُ“ کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور وہی کرنا جو وہ کہے۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے لیے اپنے مسلم ہونے کا اقرار کیا اور وجہ بھی ذکر فرمائی کہ رب العالمین ہونے کی وجہ سے یہ حق ہی اسی کا ہے۔ اور یہ فضیلت و برگزیدگی انہیں اس لئے حاصل ہوئی کہ انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔ اسلام کا معنی و مفہوم اسلام خود بھی امن و سلامتی کا دین ہے اور دوسروں کو بھی امن و عافیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کے دین امن و سلامتی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بھیجے ہوئے دین کے لئے نام ہی ”اسلام“ پسند کیا ہے۔ لفظ اسلام سَلِمَ یا سَلِمَ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی امن و سلامتی اور خیر و عافیت کے ہیں۔ اسلام اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے سراسر امن ہے۔ گویا امن و سلامتی کا معنی لفظ اسلام کے اندر ہی موجود ہے۔ لہذا اپنے معنی کے اعتبار سے ہی اسلام ایک ایسا دین ہے جو خود بھی سراپا سلامتی ہے اور دوسروں کو بھی امن و سلامتی، محبت و رواداری، اعتدال و توازن اور صبر و تحمل کی تعلیم دیتا ہے۔

الدِّينَ سے مراد یہاں اسلام ہے

وَوَصَّي	اور وصیت کی	يَهَّآ	اس (کلمہ اسلام) کی	اِبْرَاهِيْمُ	ابراہیم نے
بَنِيهِ	اپنے بیٹوں کو	وَيَعْقُوْبُ	اور یعقوب نے	يٰكِنٰنِي	اے میرے بیٹو
اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ نے	اصْطَفٰی	چن لیا	لَكُمْ الدِّينَ	تمہارے لئے یہ دین
فَلَا تَمُوْنُ	پس نہ مرنے	اِلَّا وَاَنْتُمْ	مگر اس حال میں کہ تم		
مُسْلِمُوْنَ ﴿٣١﴾			مسلمان ہو (132)		

اس آیت میں اللہ رب العزت نے بطور خاص حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پوتے یعقوب (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ ماسوائے نبی آخر الزمان ﷺ کے باقی سب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام انہی کی اولاد سے تھے اور بنی اسرائیل بھی انہی کی اولاد تھے۔ انہیں وصیت تو اللہ

کافر مانسردار بن کر رہنے کی گئی تھی۔ (الدِّیْن) سے مراد یہاں اسلام ہے، کیونکہ پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسی دین کو اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ مسلم ہونے کی حالت میں فوت ہونا اسی وقت ممکن ہے جب بندہ ہر وقت مسلم یعنی تابع فرمان رہے، کبھی کوتاہی ہو تو فوراً توبہ کرے، کیونکہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنے اور اپنی اولاد سے متعلق آخری وقت مسلم ہونے کی بہت فکر رہتی تھی، کیونکہ اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے (إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنَّيِّتِ) [بخاری، القدر، باب العمل بالخواتیم: 6607] سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے: (تَوَفَّيْنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ) [یوسف: 101] ”مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔“ اگرچہ آخر وقت مسلمان ہونا بندے کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو آدمی دلی لگاؤ کے ساتھ نیک و بد جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے تو اور اس پر کار بند رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اسی کی توفیق دے دی جاتی ہے۔

یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو دین حق پر ثابت قدمی کی وصیت فرمائی۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ والدین کو صرف مال کے متعلق ہی وصیت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اولاد کو عقائد صحیحہ، اعمال صالحہ، دین کی عظمت، دین پر استقامت، نیکیوں پر مداومت اور رگنا ہوں سے دور رہنے کی وصیت بھی کرنی چاہیے۔ اولاد کو دین سکھانا اور ان کی صحیح تربیت کرتے رہنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اپنی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرو اور انہیں اچھے ادب سکھانے کی کوشش کرو۔“ (ابن ماجہ، کتاب الادب، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، ۴ / ۱۸۹-۱۹۰، الحدیث: ۳۶۷۱) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ایک شخص سے فرمایا: ”اپنے بچے کی اچھی تربیت کرو کیونکہ تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ تم نے اس کی کیسی تربیت کی اور تم نے اسے کیا سکھایا۔“ (شعب الایمان، استون من شعب الایمان وہو باب فی حقوق الاولاد والاحلین، ۶ / ۴۰۰، الحدیث: ۸۶۲۲) حضرت ایوب

بن موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”کسی باپ نے اپنے بچے کو ایسا عطیہ نہیں دیا جو اچھے ادب سے بہتر ہو۔ (ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی ادب الولد، ۳ / ۳۸۳، الحدیث: ۱۹۵۹) اور اچھے ادب سے مراد بچے کو دیندار، متقی، پرہیزگار بنانا ہے۔ اولاد کے لئے اس سے اچھا عطیہ کیا ہو سکتا ہے کہ یہ چیز دین و دنیا میں کام آتی ہے۔ ماں باپ کو چاہئے کہ اولاد کو صرف مالدار بنا کر دنیا سے نہ جائیں انہیں دیندار بنا کر جائیں جو خود انہیں بھی قبر میں کام آوے کہ زندہ اولاد کی نیکیوں کا ثواب مردہ کو قبر میں ملتا ہے۔

وَتَنِيَّتِ كَامَعْنٰی وَمَفْهُومٌ مُّخْتَلَفٌ مِّزَاهِبٌ فِیْ اِسْ كَالْتَوُور

اَمْ كُنْتُمْ	کیا تم تھے	شُہدَاء	موجود	اِذْ حَضَرَ	جب آئی
يَعْقُوبَ الْمَوْتُ	یعقوب کو موت	اِذْ قَالَ	جب کہا (اس نے)		
لِبَنِيهِ	اپنے بیٹوں سے	مَا تَعْبُدُونَ	کس کی تم عبادت کرو گے		
مِنْ بَعْدِي	میرے بعد	قَالُوا	انہوں نے کہا		
نَعْبُدُھُمْ	عبادت کریں گے	اِلٰھَاکَ	تیرے معبود کی		
وَالِاٰبَآئِکَ	اور تیرے باپ دادا کے معبود کی	اِبْرٰھِمَ	(یعنی) ابراہیم		
وَاِسْمٰعِیْلَ	اور اسماعیل	وَاِسْحٰقَ الْھٰٓا	اور اسحاق (کے) معبود		
وَاحِدًا	واحد کی	وَتَخْنٰی	اور ہم	لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ③	اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہود کو زبردستی بیچ کی جارہی ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم و یعقوب (علیہما الصلوٰۃ والسلام) نے اپنی اولاد کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی، تو کیا تم وصیت کے وقت موجود تھے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ موجود تھے تو یہ کذب و زور اور بہتان ہوا (بتینوں جھوٹ اور بے بنیاد باتوں سے متعلق الفاظ ہیں)، اور اگر یہ کہیں کہ حاضر نہیں تھے تو ان کا مذکورہ دعویٰ غلط ثابت ہو گیا، کیوں کہ انہوں نے جو وصیت کی، وہ تو اسلام کی تھی نہ کہ یہودیت، یا عیسائیت یا وثنیت

کی۔ (وثنیت سے مراد "بت پرستی" کا عقیدہ یا نظریہ ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں خدا کی بجائے کسی مادی چیز (جیسے پتھر یا لکڑی سے بنی مورتی) کو پوجا جاتا ہے، عربی زبان میں "وثن" کا مطلب بت یا مورت کے ہیں۔ اسی مناسبت سے وثنیت کا لفظ وجود میں آیا جس کا بنیادی مفہوم اصنام پرستی یا بت پرستی ہے۔ الغرض! مذہبی اصطلاح میں وثنیت ایسے تمام عقائد کو کہا جاتا ہے جو توحید (ایک خدا پر یقین) کے برعکس ہوں اور جن میں مافوق الفطرت طاقتیں بے جان اشیاء، قدرتی مظاہر (جیسے سورج، چاند)، یاد یوتاؤں کے مجسموں سے منسوب کر دی جائیں۔ اور تاریخی اعتبار سے یہ انسانی تاریخ کا قدیم ترین عقیدہ ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل جزیرہ نما عرب میں بھی وثنیت عام تھی، جہاں خانہ کعبہ میں مختلف بت رکھے گئے تھے اور لوگ انہیں اپنا حاجت روا سمجھتے تھے، لہذا اسلام میں وثنیت (شرک) کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ خالق کی بجائے مخلوق کی عبادت پر مبنی ہے) تمام انبیاء کا دین اسلام ہی تھا، اگرچہ شریعت اور طریقہ کار میں کچھ اختلاف رہا ہے۔ اس کو نبی (ﷺ) نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: «الْأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَاتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ» (صحیح بخاری) "انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت اولادِ علات ہیں، علات "کا صحیح تلفظ عین پر زبر (ع) کے ساتھ ہے، جو عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی مفہوم ان سوتیلے بھائیوں سے ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت اولادِ علات ہیں، ان کی مائیں مختلف (اور باپ ایک) ہے اور ان کا دین ایک ہی ہے۔"

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ آيَةِ كَاشَانَ نَزُولِ الْقُسْفِيرِ

اس آیت میں بھی یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کی تردید ہے اور یہود و نصاریٰ کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ تمہاری دعویٰ باطل کہ تم ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام، اسماعیل (علیہ السلام)، اسحاق (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کو ماننے والے ہو انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی، فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو "أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتِ" کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب (علیہ الصلوٰۃ

والسلام) کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي “جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہودیوں کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا مجھے شبہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان نہ رکھتا ہو تو بیٹوں نے بیک آواز جواب دیا۔ قَالُوا نَعْبُدُ اللَّهَ، ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے “وَإِلَهَ آبَائِكَ“۔ اور تمہارے آباؤ اجداد اِبرٰہِمْہُمْ وَاسْمٰعِیْلَ وَاسْتَحٰقَ“۔ ابراہیم (علیہ السلام)، اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی عبادت کریں گے، “إِلَهًا وَاحِدًا“۔ سے جو ایک ہی معبود ہے، ہم صرف اسی کی عبادت کریں گے، “وَأَتَّخِذُ لَهُ مُسْلِمُونَ“۔ اور ہم صرف اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں یہ سب باتیں حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے دم واپسین کے وقت کی ہیں، جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کاربند رہنے کی تلقین فرما رہے ہیں۔ یہ آیت یہود اور عیسائیوں کے اس دعوے کے رد میں نازل ہوئی ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو یہودی یا عیسائی مذہب کی وصیت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سے سوال کیا ہے کہ کیا تم اس وقت وہاں موجود تھے؟ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی اولاد کو صرف توحید (اللہ کی یکتائی) اور اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ کے لیے ملت ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں، اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو، اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور ﷺ پر ایمان لانا ہوگا، کیونکہ آپ ہی ملت ابراہیمی کے سچے پیروکار اور سچے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں، آگے سورہ آل عمران میں آئے گا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے پر ہو تو بنی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانا پڑے گا، آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف تمہاری جھوٹی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

لفظ حنیف کی تحقیق و تفسیر / راہ ہدایت / صحابہ کرام معیارِ حق

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝
تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا
كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى يَهْتَدُوا ۖ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ
حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُبْشِرِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا
أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ
وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ
مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا
هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

آخرت میں کام آنے والے صرف اپنے ہی اعمال ہوں گے

تِلْكَ أُمَّةٌ	یہ ایک جماعت ہے	قَدْ خَلَتْ	تحقیق گزر گئی	لَهَا	اس کے لئے ہے
مَا كَسَبَتْ	جو اس نے کمایا	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے ہے	تُسْأَلُونَ	تم سے پوچھا جائے گا
مَّا كَسَبْتُمْ	جو تم نے کمایا	وَلَا	اور نہیں	يَعْمَلُونَ ۝	وہ عمل کرتے تھے۔
عَمَّا كَانُوا	اس کے بارے میں جو	يَعْمَلُونَ ۝	وہ عمل کرتے تھے۔		

یہود ہمیشہ اپنے آباء و اجداد کے مقام و مرتبہ اور اعمال کو اپنے لئے کافی جانتے تھے اور سمجھتے

تھے کہ ان کے اعمال میں وہ بھی حصہ دار ہوں گے، اسی کی تردید ہے کہ ہر شخص کو خود اسی کا عمل کام آئے گا، تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا، نہ کہ اپنے سلف اور آباء و اجداد کے اعمال کے بارے میں فرمایا تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی وہ دین توحید پر قائم رہی ”لَهَا مَا كَسَبَتْ“۔ انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کمایا، یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال و افعال کا اجر ان کو ملے گا ”وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ“ اور تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم کمائو گے اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تھام لو گے تو مراد کو پھینکو گے اور اگر اپنی ضد اور عناد پر قائم رہے، تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا، امام غزالی نے بڑی عمدہ مثال دی ہے، کہتے ہیں کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھاپی لے تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی۔ جب تک وہ خود نہیں کھائے پئے گا، اسی طرح یہود و نصاریٰ کے آباء و اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپناتے ہیں فرمایا ”وَلَا تَنْتَفِعُوا بِعَمَلِكُمْ كَانُوا يَعْصِمُونَ“۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباء و اجداد کا دین کیا تھا، وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگا تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں اپنے اعمال کا کام آئیں گے اور اگر عقیدہ خراب ہو تو کسی کو دوسرے کے عمل سے فائدہ نہ ہوگا۔

یہودیوں، عیسائیوں اور تمام مذاہب کا رد

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	كُونُوا	ہو جاؤ تم	هُودًا	یہودی	أَوْ نَصَارَى	یا عیسائی
تَنْتَفِدُوا	ہدایت پالو گے	قُلْ	کہہ دیجئے	بَلْ	بلکہ (پیروی کرتے ہیں ہم)		
مِلَّةَ اٰبِیْہِمَ	ملت ابراہیم کی		حَنِیْفًا		(جو) حنیف تھا		
وَمَا كَانَ	اور نہیں تھے		مِنَ الْمُنْشَرِکِیْنَ		مشرکوں سے۔		

كُونُوا: ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت مدینہ

کے یہودی سرداروں اور نجسہ ان کے عیسائیوں کے جواب میں نازل ہوئی۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سب سے افضل ہیں اور توریت تمام کتابوں سے افضل ہے اور یہودی دین تمام ادیان سے اعلیٰ ہے، اس کے ساتھ انہوں نے حضرت سید کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، انجیل شریف اور قرآن شریف کے ساتھ کفر کر کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ یہودی بن جاؤ اسی طرح نصرا نیوں نے بھی اپنے ہی دین کو حق بنا کر مسلمانوں سے نصرانی ہونے کو کہا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی، البقرة تحت الآية: ۱۳۵ / ۵۳۵-۵۳۶) كَبُلْ مِلَّةَ اٰبِرٰهِيْمَ: بلکہ ابراہیم کا دین۔ ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم، آپ یہودیوں اور عیسائیوں کو جواب دے دیں کہ جب کسی کی پیروی ضروری ہے تو ہم حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی پیروی کرتے ہیں جو کہ تمام فضائل کا جامع ہے اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر باطل سے جدا تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اس میں اشارہ یہودیوں، عیسائیوں اور ان تمام لوگوں کا رد کر دیا گیا جو مشرک ہونے کے باوجود ملت ابراہیمی کی پیروی کا دعویٰ کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ابراہیمی بھی کہتے ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں حالانکہ ابراہیمی وہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین پر ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام مشرک نہ تھے جبکہ تم مشرک ہو تو ابراہیمی کیسے ہو گئے۔ (خازن، البقرة تحت الآية: ۱۳۵ / ۹۴، ملخصاً)

لفظ حنیف، معنی و مفہوم اور مختصر تشریح

عربی قواعد کی رو سے حَنِيفًا کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں ترجمہ بلکہ ہم نے یہ کہہ دیا کہ ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، اور اس لفظ کا تعلق 'ملة ابراہیم' سے بھی ہو سکتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "دین حنیف" سے مراد وہ خالص توحید ہے جو شرک اور بت پرستی سے پاک ہو۔ یعنی ایسا شخص جو اسلام پر پہنچنے کی اور استقامت کے ساتھ کار بند رہے اور تمام جھوٹے مذاہب سے بیزاری کا اظہار

کرے، الغرض! ایسی صورت میں ”حنیف“ کے معنی ’مستقیم‘ (درست) کے ہوں گے اور ترجمہ یوں ہوگا کہ ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، جو درست مذہب ہے۔ یہ ایک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں: ”سیدھی راہ (حق) پر قائم رہنے والا اور ہر قسم کی باطل اور گمراہ کن راہوں سے منہ موڑنے والا۔“ (دیکھئے: قرطبی: ۲/۱۴۰) اردو میں ترجمہ کرنے والے حضرات نے دونوں طرح اس کا ترجمہ کیا ہے۔ الغرض! ملت اس نظام زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد چند مخصوص عقائد پر ہو اور ملت ابراہیم (علیہ السلام) کے عقائد میں سے سب سے اہم عقیدہ جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا وہ یہ ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) موحّد تھے۔ شرک نہیں کرتے تھے۔ یہود مسلمانوں سے کہتے ہیں یہودی بنو گے تو نجات پا جاؤ گے۔ حالانکہ وہ خود مشرک تھے اور حضرت عزیر (علیہ السلام) کو ابن اللہ کہتے تھے۔ اسی طرح عیسائی بھی مسلمانوں سے یہی بات کہتے تھے حالانکہ وہ بھی تین خدا مانتے تھے اور مشرک تھے اور کفار مکہ وغیرہ کے مشرک ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ حالانکہ وہ بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کا دعویٰ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی نہ ہدایت پر ہے اور نہ ملت ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ سب مشرک ہیں۔ ملت ابراہیم پر صرف وہ ہو سکتا ہے جو مشرک نہ ہو اور وہی ہدایت یافتہ ہوگا۔

الْأَسْبَاطِ کا معنی مفہوم اور مختصر تشریح

قَوْلُوْ	کہو تم	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَمَا	اور (اُس پر) جو
اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	اِلَيْنَا	ہماری طرف	وَمَا اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا		
اِلٰى اٰبِزِهِمْ	طرف ابراہیم	وَاِسْمٰعِیْلَ	اور اسماعیل	وَاِسْحٰقَ	اور اسحاق		
وَيَعْقُوْبَ	اور یعقوب	وَالْاَسْبَاطِ	اور اولاد (یعقوب کی طرف)				
وَمَا اُوْتِیَ	اور جو دیا گیا	مُوسٰی	موسیٰ	وَعِیْسٰی	اور عیسیٰ		
وَمَا اُوْتِیَ	اور جو دیا گیا	النَّبِیُّوْنَ	نبیوں کو	مِنْ رَّبِّهِمْ	اپنے رب کی طرف سے		
لَا نَفَرِقُ	ہم فرق نہیں کرتے	بَيْنَ اَحَدٍ	کسی ایک کے درمیان				

مِنْهُمْ	ان میں سے	وَمَنْحُنْ لَهُ	اور ہم اسی کے	مُسْلِمُونَ	فرمانبردار ہیں۔
----------	-----------	-----------------	---------------	-------------	-----------------

الْأَسْبَاطُ "عربی زبان کا لفظ ہے جو "سبط" کی جمع ہے اس کا لغوی معنی درخت کی شاخ یا قبیلہ ہوتا ہے چونکہ ایک خاندان یا قبیلہ کی شاخیں ایک ہی جسٹر (آباؤ اجداد) سے پھوٹی ہیں، اس لیے اولاد کی نسوں اور قبیلوں کو "اسباط" کہا جاتا ہے، اور اس کا معنی آسانی سے پھیلنا بھی ہے۔ اولاد کی اولاد کو بھی اسی پھیلاؤ کی وجہ سے "سبط" کہتے ہیں۔ (مفردات) یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارہ بیٹے تھے، ان کی اولاد کے بارہ قبائل "الْأَسْبَاطُ" کہلاتے ہیں۔ "الْأَسْبَاطُ" پر الف لام کی وجہ سے "اس کی اولاد" اور "وَمَنْحُنْ لَهُ مُسْلِمُونَ" میں "لہ" پہلے آنے کی وجہ سے "ہم اسی کے فرماں بردار ہیں" ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو اصل ہدایت اور ایمان کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی قرآن پاک سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں اور جتنے انبیاء و رسل آئے، جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض کے نہیں آئے، سب پر مجملاً ایمان لایا جائے کہ وہ سب حق ہیں۔ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے اپنے وقتوں میں واجب الاتباع ہوتے ہیں اور ایک نئے نبی کی بعثت کی ضرورت ہمیشہ اس وقت پیش آتی ہے جب سابق نبی کی امت میں شرک و جہالت اور فساد فی الارض عام ہو جائے اور وہ خود کئی گروہوں میں بٹ جائے۔ دین یعنی عقائد و کلیات تو ہر نبی کے دور میں یکساں ہی رہے ہیں۔ البتہ اس دور کے تقاضوں کے مطابق کچھ سابقہ احکام منسوخ اور کچھ نئے احکام اس نئے نبی کو دیئے جاتے ہیں۔ لہذا اب اتباع تو صرف اسے نئے نبی کی واجب ہوتی ہے اور ایمان لانا سب پر واجب ہوتا ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جیسے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محمد ﷺ کو اور نصرا نیوں نے آخری پیغمبر ﷺ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ تفصیلی ایمان صرف قرآن پر ضروری ہے، یعنی اس کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا، (1) کیونکہ قرآن پاک آنے سے پہلی تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں۔ (2) پہلے تمام پیغمبر خصوصاً اپنی قوم کی طرف آتے تھے، جب کہ رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔ دیکھیے سورہ سبا

(28)۔ 3۔ پھر پہلی کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں رہی، بلکہ ان میں تحریف ہوگئی، جب کہ قرآن مجید ہر طرح سے محفوظ ہے۔ یعنی ہم تمام ہی پیغمبروں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں، جیسا کہ یہودیوں نے کیا چنانچہ مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھے، کوئی بھی پیغمبر (جس کے پیغمبر ہونے کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہو) کا انکار یا ان کی بے احترامی کفر کا باعث ہے؛ البتہ احکام میں ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے پابند ہیں؛ کیوں کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے متعلق چند باتیں یاد رکھیں

(1)..... تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جو کسی ایک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام یا ایک کتاب کا بھی انکار کرے وہ کافر ہے، البتہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعداد مقرر نہ کی جائے کیونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعداد کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں۔

(2)..... انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے درجوں میں فرق ہے جیسا کہ تیسرے پارے کے شروع میں ہے مگر ان کی نبوت میں فرق نہیں۔

(3)..... انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں فرق کرنے سے منع کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے کہ بعض نبیوں کو مانیں اور بعض کا انکار کریں۔

(4)..... یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے نبی نبوت میں یکساں ہیں، کوئی عارضی، ظلی یا روزی نبی نہیں جیسے قادیانی کہتے ہیں بلکہ سب اصلی نبی ہیں۔

صحابہ کا ایمان بارگاہ الہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال

فَإِنْ	پھر اگر	أَمِنُوا	وہ ایمان لائیں	بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ	جیسے تم ایمان لاتے ہو
بِهِ	اس پر	فَقَدْ اهْتَدَوْا	تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے	وَإِنْ	اور اگر
تَوَلَّوْا	انہوں نے منہ پھیرا	فَاتَّبَعْتُمُ	تو وہی ہیں	فِي شِقَاقٍ	ضد میں (مخالفت میں)

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ		پس عنقریب آپ کیلئے ان کے مقابلے میں کافی ہوگا اللہ	
وَهُوَ	اور وہی ہے	السَّبِيحُ	خوب سننے والا
		الْعَلِيمُ ②	خوب جاننے والا۔

بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ: تمہارے ایمان کی طرح۔ یہودیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح ایمان لانے کا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایمان بارگاہ الہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال ہے۔ اس لئے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی مثال دیتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح اے صحابہ (رضی اللہ عنہم)! تم ایمان لاتے ہو تو پھر یقیناً وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ ضد اور اختلاف میں مسنہ ہوڑیں گے، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کی سازشیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرنے والا ہے۔ چنانچہ چند سالوں میں ہی یہ وعدہ پورا ہوا اور بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا گیا اور بنو قریظہ قتل کئے گئے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی شہادت کے وقت ایک مصحف عثمان ان کی اپنی گود میں تھا اور اس آیت کے جملہ «فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ» پر ان کے خون کے چھینٹے گرے بلکہ دھار بھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصحف آج بھی ترکی میں موجود ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسا ایمان نصیب فرمائے، اور اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے آمین

جھوٹی نسبت مفید نہیں / کتمان شہادت ظلم ہے / اہل اسلام کیلئے لمحہ فکریہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا
فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ
مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ
كَانُوا يَهُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۚ قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ ۚ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ
شَهَادَةَ عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ
لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ

صِبْغَةَ اللّٰهِ	اللہ کا رنگ (اختیار کرو)	وَمَنْ	اور کون ہے	أَحْسَنُ	زیادہ اچھا
مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے	صِبْغَةً	رنگ میں	وَنَحْنُ لَهُ	اور ہم اسی کی
عَابِدُونَ			عبادت کرنے والے ہیں (138)		

فرمایا یہ آپ کی یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دیتے ہیں آپ انہیں فرما دیجئے کہ

”صِبْغَةَ اللَّهِ“ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کر لیا ہے تمہاری باطل یہودیت اور نصرانیت سے ہمارا کیا تعلق؟ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی روایتی رنگ کی قسم سرخ نیلا یا پیلا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے یہ وہ رنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے یہ رنگ ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار کی وجہ سے اور چمکتا ہے ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے یہ یہودیت اور نصرانیت والا رنگ نہیں جو یہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں پینٹنگی کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً۔ اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہو گا جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے یہ ملت ابراہیمی کا رنگ ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے جو اس ملت پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ جس طرح رنگ کپڑے کے ظاہر و باطن میں سرایت کر جاتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے دین کے سچے عقائد ہمارے رگ و پے میں سما گئے ہیں، ہمارا ظاہر و باطن اس کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ ہمارا رنگ ظاہری رنگ نہیں جو کچھ فائدہ نہ دے بلکہ یہ نفوس کو پاک کرتا ہے۔ ظاہر میں اس کے آثار ہمارے اعمال سے نمودار ہوتے ہیں۔

عیسائیوں کی مذہبی رسم ”بِپَتْسَمَہ“

عیسائیوں کے یہاں ایک مذہبی رسم ”بِپَتْسَمَہ“ کی چسلی آتی ہے، جس کو عربی میں ’اصطباغ‘ کہتے ہیں، جب کوئی شخص عیسائیت کو قبول کرتا ہے تو اس کو مغرب کے رخ پر لٹا کر اس سے شیطان سے براءت کا اعلان کرایا جاتا ہے، پھر مشرق کی طرف رخ کر کے وہ عیسائی عقائد کا اقرار کرتا ہے، پھر کپڑے اتار کر سرتاپاؤں دم کئے ہوئے تیل سے اس کی مالش کی جاتی ہے، اب پتسمہ کے حوض میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں وہ غسل کرتا ہے، اسی درمیان اس سے باپ، بیٹے اور روح القدس پر ایمان کا اقرار لیا جاتا ہے، غسل کے بعد پیشانی اور سینہ پر دوبارہ دم کیا ہوا تیل ملا جاتا ہے اور سفید کپڑا پہنا دیا جاتا ہے، یہ ایک علامتی کپڑا ہے کہ اب وہ گناہ سے پاک و صاف ہو چکا ہے، قرآن نے یہاں اس مصنوعی عمل کا رد فرمایا ہے کہ پانی میں جسم کو دھونے اور سفید رنگ اختیار کرنے سے

کچھ فائدہ نہیں، یہ محض دل کے بہلاوے ہیں، اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی مرضیات کے رنگ میں رنگ لے اور اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہو سکتا، اللہ کے رنگ سے یہاں یہی مراد ہے، رنگ کپڑے سے اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا، دین سے ایک مسلمان کا تعلق بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ فرمایا ”وَتَخْنُ لَهُ عَبْدُونَ“۔ اس لیے ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں، ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت لا محدود

قُلْ	کہہ دیجئے	أَتُحْجُّونَنَا	کیا تم ہم سے جھگڑتے ہو
فِي اللَّهِ	اللہ کے بارے میں	وَهُوَ	حالانکہ وہ
وَرَبُّكُمْ	اور تمہارا رب ہے	وَلَنَا	اور ہمارے لئے ہیں
وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے ہیں	أَعْمَالُكُمْ	تمہارے عمل
لَهُ	اسی کے لئے	مُخْلِصُونَ	خالص (عمل کرنے والے) ہیں (139)

یہود مسلمانوں سے جھگڑتے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہوئے ہیں، پھر یہ آخری نبی عرب سے کیسے مبعوث ہو گئے؟ ہمارا دین سب سے بہتر اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین ہے، تو اس آیت میں ان کی تردید فرمائی گئی ہے کہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہے اور ہم عبادت میں مخلص بھی ہیں، پھر تمہارا یہ کہنا کہ ہم بہتر ہیں، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ حالانکہ گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے کہ ”وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ“۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے یعنی ہم کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں کرتے اور عبادت و طاعت خالص اسی کے لئے کرتے ہیں تو عورت کے متحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ یہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ لہذا اس کی جملہ نوازشات اور الطاف و اکرام کے متحق صرف ہم ہی ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ اللہ جیسا تمہارا پروردگار ہے ویسا ہی ہمارا بھی ہے۔ وہ تو جس طرح کے کوئی شخص عمل کرے گا اسی کے مطابق اس پر نوازشات کرے گا۔ اور

اس لحاظ سے ہم تم سے بہتر بھی ہیں کہ ہم فقط اسی کی بندگی کرتے ہیں اور تم شرک بھی کئے جاتے ہو اور یہ اندازہ اب تم خود لگا سکتے ہو کہ آئندہ اس کی نوازشات اور الطاف و اکرام کس پر ہونا چاہئیں۔ نیز خالص اللہ تعالیٰ کا وہی ہوتا ہے جو اس کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا ہو جائے اور جو رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کا ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ کا ہو گیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملت ابراہیم (علیہ السلام) کا بنیادی اصول ہے تم باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے یہ ممکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فیضیاب کرے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں بحمد اللہ ہم نے ایمان قبول کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا ہے اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی میں شامل ہوتے ہیں۔

آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پیچنگی کا اظہار ہے

اپنے دین میں اخلاص پیدا کرو، تمہارا تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل قبول ہوتا ہے ریاکاری اور دکھاوے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے اہل کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں وہ ضدی اور عنادی ہیں لہذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین، اب مسلح کی گنجائش نہیں یہاں بھی اہل کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں۔ اس آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پیچنگی کا اظہار ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب کفار مکہ نے آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو اپنے باطل مذاہب اور بت پرستی میں شرکت کی پیشکش کی تھی۔ اس کے ذریعے واضح کر دیا گیا کہ حق اور باطل میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اور ہر شخص اپنے عقیدے اور عمل کا خود ذمہ دار ہے۔

آم	کیا	تَقُولُونَ	تم کہتے ہو	إِنَّ اِبْرٰہِیْمَ	بیشک ابراہیم
----	-----	------------	------------	--------------------	--------------

وَإِسْمَاعِيلَ	اور اسماعیل	وَإِسْحَاقَ	اور اسحاق	وَيَعْقُوبَ	اور یعقوب
وَالْأَسْبَاطَ	اور (اُن کی) اولاد	كَانُوا	تھے	هُودًا	وہ یہودی
أَوْ نَصَارَىٰ	عیسائی	قُلْ	کہہ دیجئے	أَنتُمْ	کیاتم
أَوْ نَصَارَىٰ	عیسائی	قُلْ	کہہ دیجئے	أَنتُمْ	کیاتم
أَمِ اللَّهُ	یا اللہ	وَمَنْ	اور کون	أَظْلَمُ	زیادہ ظالم ہے
مِمَّنْ	اس سے جس نے	كُتِبَ	چھپائی	شَهَادَةً	(وہ) گواہی
عِنْدَهُ	جو اس کے پاس ہے	مِنَ اللَّهِ	اللہ کی طرف سے	وَمَا اللَّهُ	اور نہیں ہے
بِغَافِلٍ	اللہ بخیر	عَمَّا	اس سے جو	تَعْمَلُونَ	تم عمل کرتے ہو

یہودیت و عیسائیت کا معرض وجود

اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ یہودیت اپنے موجودہ نظریات و عقائد کے مطابق تیسری اور چوتھی صدی قبل مسیح میں معرض وجود میں آئی تھی۔ اور عیسائیت اپنے مخصوص نظریات و عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کے مابعد کی پیداوار ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے عالم لوگ اس بات کو خوب جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اسماعیل (علیہ السلام)، اسحاق علیہ السلام، یعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد یعنی حضرت یوسف (علیہ السلام) وغیرہم۔ اس قسم کی یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے، مگر ان علمائے یہود و نصاریٰ نے عوام کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی کہ یہ بیان کردہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام یہود کے قول کے مطابق یہودی تھے اور نصاریٰ کے قول کے مطابق عیسائی تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كُتِبَ شَهَادَةٌ عِنْدَهُ مِّنَ اللَّهِ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا، جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی موجود ہو اور وہ اسے چھپائے یہ گواہی کون سی تھی جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے یہ گواہی حضور ﷺ کی بعثت قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے بارے میں تھی آگے آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کر لیتے تھے، یعنی یہ آیت بنیادی طور پر یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) کے ان علماء کے

بارے میں نازل ہوئی تھی جو تورات اور انجیل میں حضرت محمد ﷺ کی صفات اور حق سچائی جانتے تھے، لیکن ذاتی مفاد یا تعصب کی وجہ سے اسے چھپاتے تھے۔

توراة میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے متعلق واضح پیشین گوئیاں

”يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ“۔ یہ لوگ حضور خاتم النبیین ﷺ کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے توراة میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتے تھے گویا توراة نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی، اسے چھپاتے تھے انہیں کے متعلق فرمایا کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے پاس موجود شہادت کو چھپا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کے ماننے والے (اہل کتاب) آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی اتنی واضح نشانیاں اور صفات پڑھ چکے تھے کہ انہیں آپ ﷺ کی صداقت میں اتنا ہی یقین تھا جتنا ایک باپ کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔

اپنے اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی

تِلْكَ أُمَمٌ	یہ ایک جماعت تھی	قَدْ	تحقیق	خَلَّتْ	جو گزر گئی
لَهَا	اس کے لئے ہے	مَا كَسَبَتْ	جو اس نے کمایا	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے ہے
مَا كَسَبْتُمْ	جو تم نے کمایا	وَلَا	اور نہ	تُسْأَلُونَ	پوچھا جائے گا
عَمَّا كَانُوا	اس کے بارے میں جو	يَعْمَلُونَ	وہ عمل کرتے تھے۔	(141)	

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب اگرچہ تم اپنی نسبت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف کرتے ہو مگر تم ان کے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکی، لہذا تمہاری یہ جھوٹی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی، ان کے عقیدے اور اعمال بیشک درست تھے لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے، تمہیں اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔

اہل اسلام کو تنبیہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت ”تِلْكَ اُمَّةٌ“۔ کا دہرایا جانا خاص مقصد کی بناء پر ہے صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی، اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے تو اس سے مراد اہل اسلام کی تنبیہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بھی خالی نسبت پر تکیہ کیا گیا ہے تو اس سے مراد اہل اسلام کی تنبیہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بھی خالی نسبت پر تکیہ لگا کر نہ بیٹھے رہیں بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں، اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے احکام کی پابندی کریں تو ان کے لیے بھی راہ نجات کھل سکتی ہے اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں آج کل کے پیر زادوں، امیر زادوں، گدی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کا محاسبہ کریں، آباء و اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی، باپ نیک و صالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ ہے بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی، نسبت تو جب مفید ہوگی جب بزرگوں کے خصائص سے حصہ پایا ہو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ اختیار نہ کریں اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ امت ہے جو گذر چکی جو کچھ اس امت نے کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کمایا وہ تمہارے لیے ہے تم سے ان کے اعمال کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی، تم سے سوال ہوگا کہ تم نیکی اور توحید پر کار بند تھے یا نہیں تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرمیہ افعال کی طرف بلاتے تھے تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی جھگڑے میں مصروف رہے آج اپنا محاسبہ کر لو قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَنُوْرًا وَهَدًى وَرَحْمَةً،
اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنِيْ مِنْهُ مَا نَسِيتُ، وَعَلِّمْنِيْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ، وَارْزُقْنِيْ تِلَاوَتَهُ اَنَاءَ

اللَّيْلِ وَأَنَاءَ النَّهَارِ، وَاجْعَلْهُ لِي حُجَّةً يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ ○

ترجمہ: اے اللہ! قرآن کی برکت سے مجھ پر رحم فرما اور اسے میرے لیے رہنما، نور، ہدایت اور رحمت بنا دے۔ اے اللہ! اس میں سے جو میں بھول گیا ہوں مجھے یاد دلا دے اور جو نہیں معلوم وہ مجھے سکھا دے، اور مجھے رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کی توفیق عطا فرما، اور اسے میرے حق میں حجت (دلیل) بنا دے، اے تمام جہانوں کے رب۔ آمین یا رب العالمین



ہماری دیگر مطبوعات



www.umarlibrary.org